سہ ماہی
تشکیل
مدیران : احمد ہمیش
انجلا ہمیش
آخر بیسوی صدی
زندہ اور نمائندہ ادب کا شاک انگیز استعارہ

زندہ اور نمائندہ ادب کا شاک انگیز استعارہ

سرپرست فریدائے غنی

سہ ماہی

شمارے: ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱

جنوری ۹۸ء تا دسمبر ۹۸ء

مدیران: احمد ہمیش انجلا ہمیش

معاون مدیر: سحر علی

تشکیل سہ ماہی

TASHKEEL QUARTERLY

ادارت و ترتیب: احمد ہمیش — انجلا ہمیش

منتظم اعلیٰ: فرید احمد

سرورق: احمد انور

لوح: عاطف علیم

کمپیوٹر نوری نستعلیق: لیزر پوائنٹ، ناظم آباد ۲، کراچی۔ فون: 6682535

تشکیل کمپوزر۔ 8/6، 2-J-1، (عروج کلینک بلڈنگ)، ناظم آباد، کراچی- 74600۔ فون: 629190

مقامِ طباعت: گلزار پرنٹنگ پریس 2-B/4، ناظم آباد کراچی 18

دفتر رابطہ: 2-J، 8/6 (عروج کلینک بلڈنگ) ناظم آباد کراچی 18 فون 629190

تزئین: تصدق سہیل، زین العابدین، انعام راجہ، احمد انور، عاطف علیم

قیمت: 140 روپے
(4 ڈالر)

زر مبادلہ: 300 روپے

پاکستانی: 325 روپے عام ڈاک
350 روپے رجسٹرڈ ڈاک

بیرون ملک: 50 ڈالر، 35 £

بھارت اور بنگلہ دیش 400 روپے

مشاورتی سرکل:
حسن مہدی
شہریار مرزا
سجاد ظہیر
نگار سجاد ظہیر
ظہیر احمد

نعت

حنیف اسعدی

پڑھ کر درود صاحبِ اُمّ الکتاب پر — مانگو دُعا خدا سے درِ مستجاب پر

سب جانتے ہیں آمدِ خیر الوریٰ کے وقت — سب سے بُرا تھا وقت جہانِ خراب پر

دینِ مبیں کی آپؐ نے حجت تمام کی — اک مہر ثبت کر کے رسالت کے باب پر

حسنِ عمل سے آپؐ نے باطل کو رد کیا — بنیاد دین کی ہے اسی انقلاب پر

بعد از حضورؐ کوئی حبیبِ خدا نہیں — یہ مرحمت بھی ختم ہوئی آنجناب پر

قرآن دے رہا ہے گواہی حدیث کی — حق کی سند ہے قولِ رسالت مآب پر

انسانیت کو آپ نے حق آشنا کیا — قربان جاؤں اس کرم بے حساب پر

ہائے وہ اک کرم مرے رحمت مآب کا
جس کو اٹھا کے رکھا ہے یومِ حساب پر

نعت

افتخار اجمل شاہین

ان کا ہی ذکر لب پہ مرے صبح و شام ہے
اپنا بھی عاشقانِ محمدؐ میں نام ہے

آقا کی بندگی سے بلندی ہوئی عطا
ان کا جو ہے غلام وہ عالی مقام ہے

حق بیں و حق نما وہ خدا کے حبیب تھے
ان کا پیام کیا ہے خدا کا پیام ہے

کیوں رہبری کے واسطے ڈھونڈیں کسی کو ہم
وہ آخری نبی وہی سب کا امام ہے

سب کی نجات ان کے ہی پیغام میں تو ہے
ان کا پیام ارفع و اعلیٰ پیام ہے

شہرِ نبیؐ میں آئے تو محسوس یہ ہوا
کتنی حسین اس کی ہر اک صبح و شام ہے

شاہین لازمی ہے محمدؐ کی پیروی
اسلام پیرویِ محمدؐ کا نام ہے

نعت

شمائلہ عینہ فلک

لب ملے باہم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے
مٹ گئے سب غم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے

بے کسی میں لیجیے یہ نام اور پھر دیکھیے
نور کا عالم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے

دینِ حق کے فیصلے اور نورِ حق کے سلسلے
ہیں سبھی قائم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے

فیض ہے جاری ابد تک ہر دو عالم کے لیے
محسنِ اعظم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے

کیا کہوں کیا کیا نظارے دیکھتی ہے دم بدم
میری چشمِ نم محمدؐ مصطفیٰؐ کے نام سے

سلام

سید مقصود زاہدی

رباعیات ۔ بجناب سیدہ الشہدا
حضرت امام حسین علیہ السلام

صدیوں سے یہ شور و شین کرتے کیوں ہیں
اس طرح سے لوگ بَین کرتے کیوں ہیں
وہ کون سا غم تھا جو بھلا ہی نہ سکے
یہ لوگ حسینؑ حسینؑ کرتے کیوں ہیں

پھر غم کی گھٹا ٹوٹ کے چھائی ہے حسینؑ
پھر تیری صدا کانوں میں آئی ہے حسینؑ
اک ولولۂ تازہ کی خاطر ہم نے
پھر یاد تری آج منائی ہے حسینؑ

کہنے کو شکست تم نے کھائی ہے حسینؑ
باطل کی مگر خاک اڑائی ہے حسینؑ
صد گونہ ملا زندگی کو جس سے ثبات
لا ریب وہ موت تم نے پائی ہے حسینؑ

سلام

عباس حیدر زیدی

نسب حسینؑ سے ہے یا حسب حسینؑ سے ہے
جو کربلا کو نہ سمجھو وہ کب حسینؑ سے ہے

نبی نے خود یہ کہا ہے کہ میں حسینؑ سے ہوں
نبی کا جو بھی پتہ ہے وہ اب حسینؑ سے ہے

دوام یوں ہی نہیں خاکِ کربلا کا لقب
یہ خاک وہ ہے کہ جس کا ادب حسینؑ سے ہے

جو لاعلاج ہیں خاک سے شفا ہے اُن کا علاج
یہ معجزہ ہے کہ ایسا سبب حسینؑ سے ہے

جو سر اُٹھا کے چلے ہم تو یہ کھُلا ہم پر
کہ زندگی میں ہر اِک تاب و تب حسینؑ سے ہے

کبھی ہے تن پہ نمایاں کبھی ہے نیزے پر
ہمارے سر کی روایت عجب حسینؑ سے ہے

یہ روشنی کا تسلسل یہ زندگی کا شعور
جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب حسینؑ سے ہے

عطا کے باب میں ہے صاحبِ عطا کی طرح
طلب کے باب میں حسنؑ کی طلب حسینؑ سے ہے

جہاں ہوا کی حفاظت میں جل رہے ہیں چراغ
چراغ جلنے کا اک اک سبب حسینؑ سے ہے

حسینؑ فکر کا سورج، حسینؑ عشق کا چاند
یہ روشنی کا سفر روز و شب حسینؑ سے ہے

جسے ہے معنیٔ ذبحِ عظیم کا ادراک
وہ جانتا ہے کہ یہ امرِ رب حسینؑ سے ہے

بساطِ حرف و لفظ

اہلِ حرف و لفظ	حرف و لفظ	صفحات
حنیف اسعدی	نعت	
افتخار اجمل شاہین	نعت	
شاہینہ فلک	نعت	
سیّد مقصود زاہدی	سلام	
عباس حیدر زیدی	سلام	
احمد ہمیش	تخلیقی وجود امر ہے - ۲ (اداریہ)	۱۷
	پردہ اٹھتا ہے...... (ادارہ)	۳۳
	(۱) اوزون کے غلاف میں مزید شگاف کا اندیشہ	
	(۲) واش بیسن پر اپنے گناہوں کے چھینٹے اڑاتا	
	(۳) چور اور ڈاکو کے درمیان ایک مخلوق	
	(۴) موجودہ محمد تغلق	
	(۵) ادب کے کھوٹے سکے اور تعلیم مافیا	
ریحان صدیقی	حکایتِ خونچکاں کا فکشن نگار - ڈاکٹر انور سجاد سے گفتگو	۴۰
احمد ہمیش	کہانی مرقع ذات	۶۲
مقصود الٰہی شیخ	ہوا نے پانی پر لکھا	۶۳
محمد الیاس	کودا	۶۸
مشرف عالم ذوقی	یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے	۷۵

مظہر الزماں خان	چیتا	۸۷
حسن جمال	چشم دید مجرم	۹۲
آغا گل	پرتھوی، غوری	۹۸
عرفان احمد عرفی	آخری صدی کی آخری کہانی	۱۰۵
خالد سہیل ملک	رلوی کی موت	۱۰۸
حامد سراج	موری کا کیڑا	۱۱۱
ڈاکٹر شمسناز شاہین	زندگی کی قیمت	۱۲۲
لبنیٰ عروج	کہانی کار	۱۲۶
انجلا ہمیش	یادگار عاد و ثمود	۱۲۹
	سوانح	
احمد ہمیش	مگر چاندنی-۶	۱۳۳
احمد ہمیش	شاعری ...... مرقع ذات	۱۳۴
مولانا حسن مثنیٰ ندوی	غزل	۱۳۵
حنیف اسعدی	غزل	۱۳۶
نامی انصاری	غزل	۱۳۷
ساجدہ زیدی	نظم	۱۳۸
ستیہ پال آنند	نظم	۱۳۹
اطہر نادر	غزل	۱۵۲
مصحف اقبال	نظم	۱۵۳
پرکاش فکری	غزلیں	۱۵۴

اختر یوسف	نظمیں	۱۵۵
	عبید اللہ علیم کا پورٹریٹ اسکیچ : عمل : عاطف علیم	۱۵۶
عبید اللہ علیم	غزل	۱۵۷
عشرت رومانی	تم آؤ گے (نظم) عبید اللہ علیم کی نذر	۱۵۸
صابر ظفر	نذرِ علیم	۱۵۹
دل نواز دل	غزل	۱۶۱
نجم فضلی	نظم	۱۶۲
باسط عظیم	غزلیں	۱۶۳
نجمہ محمود	نظم	۱۶۴
بلال جعفری	غزل	۱۶۵
عباس حیدر زیدی	غزل	۱۶۶
شاہد رضوی	غزل	۱۶۷
سیدہ منیرہ نزہت	غزل	۱۶۸
نصیر احمد ناصر	نظمیں	۱۶۹
رفیق سندیلوی	نظم، غزل	۱۷۱
شمیم روش	غزلیں	۱۷۲
علی محمد فرشی	نظم	۱۷۳
شہناز کنول	نظم	۱۷۴
سلیم انصاری	نظم	۱۷۵
عادل حیات	غزلیں	۱۷۶

کوثر مظہری	نظم		۱۷۷
کاوش عباسی	نظم		۱۷۸
محمد فیروز شاہ	غزل		۱۸۰
ماہ طلعت زاہدی	غزلیں		۱۸۱
افتخار نسیم	نظم		۱۸۲
شاہین مفتی	نظم		۱۸۳
محمود رحیم	غزلیں		۱۸۴
شعیب ابراہیم	نظمیں		۱۸۵
ایو جینی ایو تو شینکو	نظم	ترجمہ : ضمیر احمد	۱۸۶
ساجد حمید	غزلیں		۱۸۷
تاج الدین تاجور	غزل		۱۸۸
نثار احمد نثار	نظم و غزل		۱۸۹
سلمان صدیقی	نظم		۱۹۰
جمال زیدی	غزل		۱۹۱
سلیم شہزاد	نظمیں		۱۹۲
فاروق ندیم	نظم		۱۹۳
شاہینہ فلک	نظمیں		۱۹۴
نزہت افتخار	نظم		۱۹۶
نگار سجاد ظہیر	نظم		۱۹۷
شکیل جمالی	غزلیں		۱۹۸

کے۔ پی۔ فراق	نظم	۱۹۹
رجیس صدیقی	غزل	۲۰۰
سحر علی	نظمیں	۲۰۱
ناجیہ احمد	نظم	۲۰۳
احتشام الحق شامی	نظم	۲۰۴
سیما سراج	غزل	۲۰۵
فوزیہ اختر	نظمیں	۲۰۶
ناہید نظم	نظمیں	۲۰۷
امرتا پریتم	کچا آنگن (یادگار کتھائیں) اردو روپ: احمد ہمیش	۲۰۸
احمد ہمیش	تنقید اور دیگر تحریریں	۲۱۰
عبدالرشید جواری	عظیم مفکر مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی خدمات اور حکومت کی سرد مہریاں	۲۱۱
سید حسن مثنیٰ ندوی	نیاز فتح پوری............... ہیولاک ایلیس	۲۱۳
پروفیسر ساجدہ زیدی	تانیثی تنقید.......... ایک تعارف-۲	۲۳۰
عرفان احمد عرفی	رات کا تو اگر	۲۳۷
ساقی فاروقی / احمد ندیم قاسمی	کوئی مکالمہ ایجاد کیوں نہیں کرتے (خطوط)	۲۴۴
احمد ہمیش	ہماری کہانی کی تاریخ..... ۱۱ نظیر اکبر آبادی-۱	۲۵۲
ابوالانشاء	غزل (زمین غالب)	۲۵۴
تصدق سہیل	غالب سے چھیڑ چھاڑ	۲۵۵
تصدق سہیل	فردوس حیدر ...... جینوئن آرٹسٹ	۲۵۷

حنیف نا سعدی...... تحریری مطالعہ	لمحات نظیر کی دی نظر...... عنبر بہرائچی کا شعری مجموعہ	۲۵۹
احمد ہمیش	عشق میں روگ ہزار...... صابر ظفر کا شعری مجموعہ	۲۶۱
احمد ہمیش	شب بہ خیر...... محمود شام...... ایک تحریر ناول جیسی	۲۶۲
احمد ہمیش...... تبصرہ	ہمدرد نونہال ماں نمبر	۲۶۳
انجلا ہمیش...... تبصرہ	مکی مدنی/ تسکین واحدی	۲۶۴
	کتب موصولہ برائے تحریری مطالعہ	۲۶۷
	منتخب خطوط	۲۶۹

TASHKEEL'S ENGLISH WRITINGS-7

COMPILED BY SHAHEENA FLAK

Words by Shaheena Flak, Ghalib's Naqsh-e-Faryadi by Mazher Hasan Khan, Three poems about Egypt by Satyapal Anand, A mourner like me, by Rafeeq Sandeelvi, Translation, Satyapal Anand. If it happens that, by Rafeeq Sandeelvi, Translation Syeda Moneera Nuzhat. Life and death by Hina Iqbal. The world is too much with us by Maryam Sayyal from Page 2 to 7.
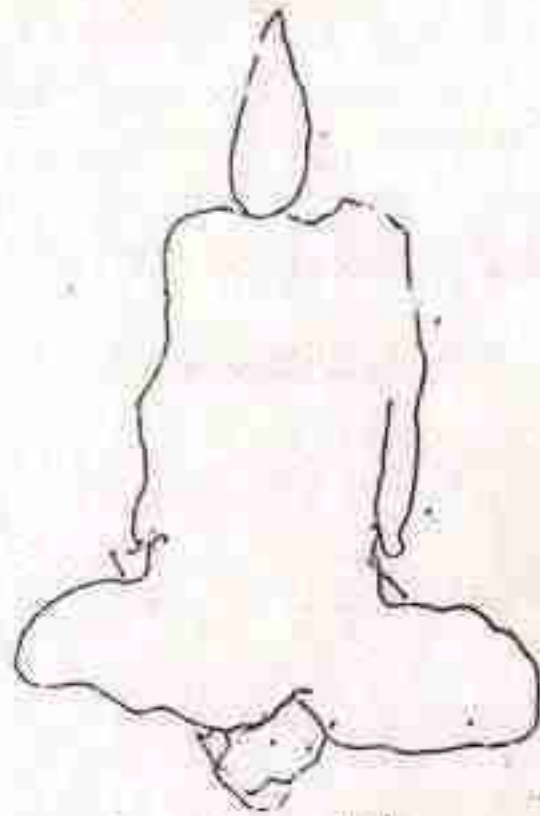
به معنی محیط و به صورت نمی
زموجِ نفس در قفس عالمی
بیدل

نیّر جہاں کے جہانِ شعر و ادب کے نام

تخلیقی وجود امر ہے ۔۲

احمد ہمیش

ادارِیہ

حضرت ذکریا علیہ اسلام نے دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لئے درخت سے پناہ مانگی تو بہ ظاہر درخت نے انھیں پناہ دے دی مگر درخت کی دراڑ سے باہر ہوئے ان کے پیرہن کے دھجی بھر ٹکڑے نے ان کے درخت میں چھپے ہونے کا سراغ کیا دیا کہ ان کے دشمنوں نے پورے درخت کے بیچ آری چلا کر ان کے جسم کو چیر دیا تھا۔ جب کہ یہ ہلاکت ان کے ظاہری وجود کی تھی۔

اس مثال سے دراصل یہ باور کرانا مقصود ہے کہ اس طرح سے تخلیقی وجود کا ظاہر بھی غیر تخلیقی وجود کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ یہاں "پیرہن کے دھجی بھر ٹکڑے کی جگہ تصور کر لیا جائے کہ بد قسمتی سے جب بھی تخلیقی وجود اپنے خلاقانہ نظام کا خود متکفی نہ ہو کے زندہ رہنے کی رعایتوں کا دھوکہ دینے والے وسائل کے درمیان جگہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی کوئی بہت معمولی احتیاج وسائل کے غاصبوں اور اجارہ داروں کی نظر میں آجاتی ہے اور تبھی یہ وہ اس پر حملہ آور ہوتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ظاہری وجود کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ تاہم خلاف اس کے سنسکرت ناٹک کار شودرک (دوسری قبل مسیح) اپنے ناٹک "مرچھ کٹک" (مٹی کی گاڑی) میں جب عدالت کے منصف کے سامنے اپنے کردار چارودت کی زبانی یہ مکالمے ادا کرواتا ہے۔

"یہ سلطنت سمندر کی طرح خوفناک مہلک جانوروں سے گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں پر مسلسل سلطنت کے حالات پر غور کرتے ہوئے متفکر وزرا پانی کی طرح ہیں اور ادھر اُدھر سے آنے والے سفیر لہروں پر بہتے ہوئے شنکھوں کی طرح ہیں۔ چاروں طرف قائم خفیہ محکمہ کے عہدہ دار مگرمچھوں اور گھڑیالوں کی طرح موجود ہیں۔ دونوں ہی جگہ کئی ناگ اور گھوڑے تشدد کرنے والے ہیں۔ سلطنت کے کئی عہدہ دار درندوں کی طرح رعایا کو خوف زدہ کرتے ہیں۔ کائستھ لوگ سانپ کی طرح ہیں۔ اس طرح یہ سلطنت درندوں کی طرح دہشت ناک طاقتوں سے گھری ہوئی ہے"۔

دراصل شودرک اپنے تخلیقی وجود کو اپنے کردار چارودت کے تخلیقی شعور میں منتقل کرتے ہوئے اس زمانہ کی ظالم سلطنت اور اس کے درندوں جیسے عہدہ داروں کے خلاف اپنا دفاع کر کے اور اس طرح ایک غلط موت مرنے سے خود کو بچا لیتا ہے۔ اس کے تخلیقی اور فکری مرتبہ کے آگے حاکمانہ درندگی ٹھہر نہیں پاتی۔ یا یوں سمجھ لینا چاہئے کہ شودرک کے مصداق چارودت کا مافی الضمیر اپنے تخلیقی وجود کو بہ یک وقت باطن اور ظاہر میں ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ شودرک کے بعد انسانی تاریخ طویل تفصیل سے گزر جاتی ہے تب ہم حضرت بیدل کے خلاقانہ نظام پر ایک نظر کرتے ہیں۔ یہاں پہلے

یہ ذکر ناگزیر ہے کہ اورنگزیب نے بہ ظاہر حضرت بیدل کے تخلیقی اور علمی وفکری مرتبہ کو تسلیم کرنے اور ان کی عزت کرنے سے قطع نظر انھیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی مگر انھوں نے درویشانہ بے نیازی سے انکار کر دیا، اس پر اورنگزیب کو نہ تو کسی شاہی ردِ عمل کی جرات ہوئی اور نہ ہی حضرت بیدل اسے خاطر میں لائے۔ مگر چونکہ وہ جذبی حسیاتی و فکری آزادی اور انسانی حقوق کی پاسداری کے محرک تھے، صوفیوں، ولیوں، اور قلندروں سے فیض حاصل کرنے کے ساتھ ہی خود بھی صوفی بلکہ بہت سے علوم پر قادر ہونے کے باوصف انسانی دانش وشعور کی سطح پر شری مد بھگود گیتا کے مصداق ساتوک پُرُوش تھے۔ طریقت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے لہٰذا فطری طور پر انھیں اورنگزیب کی اسلامی شریعت کی آڑ میں مکر و فریب، جبر و استبداد پر مشتمل مطلق العنانی بالکل گوارا نہیں تھی بلکہ اس کا اظہار جگہ جگہ نکاتِ بیدل میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک حکایت کا آخری حصہ کچھ یوں بیان کیا گیا ہے!

"زمین سے صرف نالہ اٹھتا ہے اور کچھ نہیں۔ فرصت میں اتنی ہی ہے جتنی کہ پر تولنے میں!

میری فطرت حیرت کی کمین گاہ ہے۔ سمجھ میں بات نہیں آتی کہ بس مقیم ہوں یا سفر کر رہا ہوں ایسی بے خودی کی حالت میں جا رہا ہوں تو کہاں۔ حیرت میرے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور یہی دامن میرا گریبان پکڑے ہوئے ہے۔ یہ مت خیال کرو کہ میں بالکل مجبور ہوں۔ ایک عرصہ تک غور و فکر میں رہا ہوں۔ غور و فکر تجھ کو اوہام میں گرفتار کر لیتا ہے اور جس قدر اپنی حقیقت تک پہنچو گے تمہارے لئے جان کا جنجال بن جائے گا۔ اگر غور و فکر عقدہ کشانہ ہو تو یہ ساری دنیا ایک نالہ سمجھو اور نالہ سوائے ہوا کے اور کچھ نہیں ہے۔ بانسری کی آواز کی طرح جب تو اپنی ہستی سے باہر نکل آئے تو تیرا گریبان سو جگہ تیرے آگے آئے گا کہ کہاں جا رہے ہو۔ کچھ دیر غور و فکر تو کرو اور حقیقت جاننے کی کوشش کرو۔ غور و فکر خود اپنی فکر میں مبتلا ہے۔ نہیں تو ہمیشہ قلم آزاد ہے"۔

جی ہاں! "یہ ہمیشہ قلم آزاد ہے" کی تحریک حضرت بیدل کے تخلیقی وجود سے شروع ہوئی اور اپنی جگہ اتنی تابناک تھی کہ اس کے یہاں کبھی کسی دنیاوی احتیاج کا گزر نہیں ہوا، اس لئے وہ اپنے باطن اور ظاہر سے بیک وقت زندہ سلامت رہی۔

گو میر تقی میر بیدل کی طرح خود مکتفی نہیں تھے۔ مگر تمام عمر زندہ رہے۔ محدود ضرورتوں کی خانہ پری کسی حد تک تھوڑی سی رعایت قبول کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بیشتر کو خاطر میں نہ لانے کی بد دماغی اس لئے تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کو اپنے خلاقانہ نظام کی برتری پر مرکوز رکھا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا میرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

گویا میر کا تخلیقی وجود اپنے زمانے کی مقتدر فرمارو ا اور بد خواہوں و حاسدوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ

رہا۔ اس لئے بھی کہ وہ زندہ رہنے کی کسی بھی ضرورت کو ضرورت ہی کی حد تک رکھتے ہوئے کبھی اسے احتیاج نہ بننے دیتے۔

اس سے ذرا علیحدہ غالب پر نظر کیجئے۔ غالب نے اپنی عیش پسند دنیاداری کو اپنے تخلیقی وجود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ قصائد، وظیفے، لحم طیور شراب انگلیشہ۔ طوائف کے کوٹھے جوئے خانے اور ایسی کتنی ہی آلائشوں میں پور پور غرق ہونے کے باوجود غالب کی تخلیقی انا جانبر اور سلامت نکلی۔ حالانکہ ان کے بارے میں ایک یہ انکشاف کیا گیا کہ وہ فری میسن کے ممبر بھی تھے۔ جو ہو، سو ہو مگر ایک بڑے تناسب میں تو ان کے تخلیقی وجود کی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آیا۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اب آیئے دولت اور طاقت کے سب سے بڑے اور کثیر تناسب امریکہ اور امریکی نظام سے بات شروع کرتے ہیں۔ دراصل امریکہ اپنی غلط بنیاد کے آغاز سے ہی تہذیب اور ماضی سے محرومی کے احساس کمتری میں مبتلا رہا اور کسی بھی طور وہ تہذیب اور ماضی کی خانہ پری پر مسلسل مصر رہا۔ جب کہ اس طویل تفصیل میں جائے بغیر عقدہ تو یہیں سے کھلنے لگتا ہے، جہاں سے پہلی بار ازرا پاؤنڈ نے امریکہ کو پسو گھر Bug house کا نام دے کے اہل غور و فکر کو بڑی آگہی بخشی۔ جی ہاں! اس پسو گھر Bug house نے روئے زمین پر آباد لہو چوسنے والا سودی نظام قائم کیا مگر ظاہر ہے اس بڑے پیمانے پر لہو چوسنے کے لئے اتنے ہی بڑے بلکہ دوہرے معیارات مقرر کئے گئے۔ تب بتدریج رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ امریکہ بیک وقت خیر و شر کے مقامات کا واحد قابض اور اجارہ دار بن گیا۔ مثلاً ڈائنامائٹ کی دریافت پر نادم تو نوبل ہوا بلکہ اسی ندامت میں اس نے اپنی تمام دولت نوبل پرائز کے اجرا کی صورت وقف کر کے ریکارڈ درست رکھنے کی نیت کی۔ مگر افسوس، اس نیت میں امریکہ نے اس طرح شگاف ڈالا کہ خود ہی انعام تقسیم کرنے والی بے ایمان کمیٹی کا اول و آخر مشیر اعلیٰ بن بیٹھا اور پھر مذکور کمیٹی کے ذریعہ دنیا کے بیشتر غیر معتبر شاعروں، ادیبوں اور نام نہاد اصحاب امن یا زبانی جمع خرچ کی صورت امن کا کام کرنے والی ہستیوں کو نوبل پرائز میں حصہ دار بنانا شامل کر لیا۔ غور کیا جائے تو نوبل پرائز کی تقسیم کار بے ایمان کمیٹی کے فریق اعلیٰ امریکہ کی مثال اس طوائف کی ہے، جو اپنی بدکاریوں کی پردہ پوشی کے لئے میلاد شریف اور عزاداری کے قبیل کی مذہبی رسومات کی ادائیگی سے دنیا پر اپنا دھلا دھلایا پاک صاف اور نیک و پارسا ہونا باور کراتی ہے۔ اس طرح امریکہ نے اپنی دانست میں خیر کے ریکارڈ میں اپنی شرکت کو محفوظ کر لیا۔ کیونکہ کسی بھی طور نوبل پرائز پانے والے "شاعروں و ادیبوں اور اصحاب امن" سے درپردہ امریکی طرف داری کا سود وصول ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کی نامردی، ظلم، عظیم شر اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب بھی امریکہ کی نیکیوں کے ریکارڈ میں اس انداز سے شامل ہوا کہ الٹے جاپان اور جرمنی پر دنیا کو تباہ کرنے کے امکان کا الزام تھوپا جانے لگا اور تباہی کے اس امکان سے دنیا کو بچانے والا نجات دہندہ امریکہ ہی قرار پایا۔ اس خود ساختہ جواز کے باوجود امریکہ نے طاقت کی پرفریب سیاسی بساط پر کسی طرح

برطانیہ، فرانس اور جرمنی بلکہ پورے یورپ کو معاشی اور ذہنی غلام بنایا! کس طرح فلسفہ، سائنس، ادب اور آرٹ کو حبس دوام کا قیدی بنایا! جب کہ افریقہ اور ایشیاء کے بیشتر ممالک جو بہ ظاہر آزاد ہونے کے باوجود پہلے ہی سے جسمانی غلامی میں کس طرح بندھتے چلے آئے تھے!......... یہ ایک علیحدہ ہولناک طویل تفصیل ہے۔ مگر اس میں جانے کی بجائے مختصراً اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ امریکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی لاانتہا قدرت کو دھوکا دینے کے لئے اپنے ڈالر پر In God We Trust کی اعلیٰ عبارت ثبت کر کے دنیاوی و مادی ضرورتوں، معاشیات، اقتصادیات اور مالیات کا خود ساختہ خدا بن بیٹھا۔ اس کے لئے اس نے عالمی مارکٹ میں ڈالر کی قیمت کو سب سے اونچا رکھنے کے لئے ٹوفل سسٹم (Toffel System) (ایک طرح کی گرامر کی رو سے غلط انگریزی لکھائی یا کام چلاؤ بول چال والی امریکی انگریزی) کو رائج کرنے کی اسکیم شروع کر دی۔ یہاں تک کہ برٹش انگریزی بولنے اور لکھنے والے انگریز اپنے ہی ملک برطانیہ میں یتیم و لیسر پائے جانے لگے۔ اس طرح تجارتی سطح پر عالمی مارکٹ میں فرانسیسی اور جرمن لکھائی اور بول چال محدود ہوتی گئی۔ اس کی بھی جگہ امریکی ٹوفل نے لے لی۔ گو عرب ملکوں کو تجارتی سطح پر عالمی مارکٹ میں عربی بول چال کے کثیر تناسب پر بڑا فخر رہا۔ مگر اس خوش فہمی میں دانستہ انہیں پڑے رہنے دیا گیا۔ کیونکہ امریکی معیشت کا نگراں یہودی ذہن دنیا بھر کی معیشت پر قبضہ کرنے کی بدنیتی سے عربوں کی دولت کے جملہ ذرائع یہاں تک کہ مکہ و مدینہ کی حج کی آمدنی پر بھی رفتہ رفتہ قابض ہوتا گیا۔ ویسے بھی برطانوی و امریکی تعاون سے اسرائیل، عربوں کی غفلت، جہالت اور عیاشی کی اجتماعی سرشت کے سبب قائم ہوا تھا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ذکریا علیہ السلام اپنی جان کی سلامتی کے لئے راست اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھتا اور دین کے دشمنوں پر عذاب بھی نازل کرتا۔ کم از کم یہ تو نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی خلق کی ہوئی کائنات میں شامل نباتات کا ایک ادنیٰ درخت حضرت ذکریا علیہ السلام کے وجود کو مکمل چھپائے رکھنے کا متحمل نہ ہو سکا۔ تو یہاں غالب کا موقف زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

آخر کوئی وجہ تھی کہ اگر ژاں پال سارتر نوبل پرائز کو رد نہ کرتا تو اسے افریو ایشیائی ملکوں کے حقوق کے لئے لڑنے کے بجائے "خاموش تماشائی" بن جانا پڑتا۔ جب کہ اس کی نظر میں بس میں سوار اگر کسی مسافر کے ہاتھوں کوئی مسافر پٹ رہا ہو تو وہ اتنا بڑا انہیں، جتنا اس کی پٹائی کا تماشا دیکھنے والے خاموش تماشائی برے ہوتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکہ دنیا کی بس میں سوار مظلوم مسافر کو پیٹ رہا ہے اور اس کا خاموش تماشائی بھی خود ہے۔

البتہ اس قضیہ کی تفہیم کے لئے ناگزیر ہے کہ کیوں نہ راست اس سرے کو گرفت کیا جائے کہ جہاں سے امریکہ نے ویت نام میں اپنی پسپائی اور اخلاقی زوال بلکہ خود اپنے ہی عوام کی لعن طعن سے بچنے کے لئے خاندان فورڈ کے مالی ادارے اور راک فیلر فاؤنڈیشن، پینٹاگون اور آئی ایم ایف وغیرہ کو بروئے کار لایا۔ ان کے ذریعے قدیم تہذیبوں والے

خطوں کے شعری وادبی اور ثقافتی ورثہ کو سوڈو فلسفیانہ تھیوریوں سے خبط اور غارت کرنا شروع کیا جانے لگا جب کہ ژاں پال سارتر کی وجودی فکر اور ایفرو ایشیائی ملکوں کے حقوق انسانی کی طرفداری سے امریکی مفادات کو سخت خطرہ لاحق رہنے لگا۔ یہاں خیال رہے کہ سارتر نے نوبل پرائز قبول نہ کرکے اسکے خلاف جو اصولی موقف اختیار کیا، اسکی تفہیم کسی وجہ سے بورس پیسترنک اور الیگزینڈر سولزے نٹسن کو نہیں ہوئی، پھر روس کی کیمونسٹ پارٹی کے ہارڈ لائنرز (Hard Liners) کی سنگدلانہ روش کے رد عمل میں انہوں نے نوبل انعام قبول کیا بھی.......... تو وہ انہیں اس لئے راس نہیں آیا کہ اس میں بھی امریکی دخل کی نیت مذکور روسی ناول نگاروں کی معمولی ہمدردی کی آڑ میں روس کو انسانی ہمدردی کے سامنے ذلیل کرنے کی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ سوویت یونین کی کیمونسٹ پارٹی کے ہارڈ لائنرز تہذیبی اور ثقافتی حرکتوں سے بالکل ناواقف تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی ٹالسٹائی کے کردار ایوان ایلچ کی موت کا ذرا بھی غم نہ تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ تو چیخوف کی کہانی وارڈ نمبر ٦ کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی انہیں دوستووسکی کے (Notes from underground) کے بارے میں کچھ جاننے سے دلچسپی تھی اجب کہ روئے زمین پر آدمیت کو بچانے کے لئے روسی فکشن کے ایک بڑے حصہ کو فعال اور متحرک پایا گیا اس کے زیر اثر ہی تو شعر و ادب، دانشوری اور صحافت میں بائیں بازو کے مختلف رجحانات در آتے گئے۔ ظاہر ہے، بہت کچھ ایسا بھی نہیں ہوا کہ ہمارے نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے موضوعات کا چربہ کرنے والی اردو ترقی پسند تحریک اور ہندی پرگتی وادی اندولن کی فرمائشی پروپگنڈہ تحریروں پر گزارہ ہوتا! یا جیسا کہ کیمونسٹ چین کے کمیون میں ایک بار کرم کلہ کثرت سے اگایا گیا تو چائنیز لٹریچر کے شماروں میں کرم کلہ اگاؤ مہم پر کہانیوں اور نظموں کی مسلسل اشاعت سے شدید بوریت ہونے لگی۔ تاہم بائیں بازو کے کسی جینوئن رجحان کی نظر میں ہندی شاعر سکسینہ سرویشور دیال کی "کواتو ندی" میں کیا گیا بر صغیر کی غریبی کا المناک اسکیچ باعث توجہ رہا بلحہ زندگی کے مختلف آزار سے گزر کے فرسودہ غیر انسانی روایت کو پیر تسمہ پا کی علامت قرار دیکر جب عمیق حنفی نے ایک معرکہ آرا نظم "سندباد" خلق کی.......... تو یہ اپنی تہذیبی جڑوں (Roots) میں رہ کے احتجاج کرنے والی جینوئن جدیدیت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سندباد، پہلی بار وزیر آغا کے رسالہ میں اشاعت کیلئے ارسال کی گئی۔ وزیر آغا نے اسے بہ ظاہر یہ لکھ کے واپس کردیا کہ وہ طویل نظم شائع نہیں کرتے۔ مگر درپردہ وزیر آغا دائیں بازو کے فریق ہو کے پیر تسمہ پا کے خلاف سندباد کو تحفظ نہیں دینا چاہتے تھے۔ البتہ جس قسم کی جدیدیت شعر و نثر لکھنے کے فیشن میں در آئی تھی، وہ سندباد کی فریق نہ ہو کے زندگی کے تمام ناگزیر مسائل سے آدمی کی توجہ ہٹانے اور اپنی خود غرض انفرادی ذات کو جونک کی طرح خون چوسنے کے لئے مختص کردی گئی۔ اس میں مذہبی عقائد اور تخیلی سوشلزم دونوں اقسام کی جدیدیت مخل نظر رہی۔ جیسا کہ کملشیور نے ایک بار نرمل ورما اور اس قبیل کے لکھنے والوں کو ہدف بناتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ ان کا ایک ہاتھ سویا ہوا بے جان پڑا ہوتا ہے تو دوسرا ہاتھ لکھ رہا ہوتا ہے۔ جب

کہ ایک بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ بر صغیر پاک و ہند کا آدمی ترقی پسند اور جدید تو سرے سے ہوا ہی نہیں...... اور ہو بھی کیسے سکتا ہے! پورے خطہ کا ایمانداری سے ایک سروے کرا لیا جائے تو معلوم یہ ہو گا کہ کثیر آبادی کے لئے پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ بہ ظاہر گاؤں گاؤں بجلی پہنچا دی گئی ہے مگر چوبیس چوبیس گھنٹے لوڈشڈنگ کر کے خلقت کو شدید گرمی اور حبس میں سڑایا جاتا ہے۔ اس پر مرے کو مارے شاہ مدار کے محاورہ کے مصداق گذشتہ دو دہائیوں کے دوران راست امریکہ سے ساختیات، رد تشکیل، ادبی تھیوری اور مابعد جدیدیت امپورٹ کی گئی۔ مگر اس بکھیڑے کے تجزیاتی مطالعہ میں جانے سے پہلے کیوں نہ یادداشت کے ایک سرے پر چلیں!

۱۹۶۱ء کے دوران جب ڈاکٹر وزیر آغا میرا جی کی طرح جدید نظم نگاری کا ایک گروپ بنا کے اس کی استادی اور اگوائی کرنے چلے تھے تو اس دوران وہ محمد صلاح الدین کے معیاری ادبی رسالہ "ادبی دنیا" پر قبضہ کر چکے تھے۔ ادارت کی استادانہ اجارہ داری کا یہ عالم تھا کہ پاک و ہند کے جدید اور نئے لکھنے والوں کی ڈاک سے یا دستی ذریعہ سے موصولہ نظموں کی اصلاح فرمانے بیٹھ جاتے۔ اصلاح کیا تھی!...... ایک طرح سے وہ ان کے سر مونڈ دیتے تھے۔ ایک بار بد قسمتی سے احمد ہمیش کو ان کے یہاں مہمان ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے اس کی ایک نظم کی اصلاح فرمانے کی کوشش کی۔ اسی دوران احمد ہمیش کو دوپہر کے کھانے میں روٹی اور مرغی کے سالن کی ٹرے بھجوائی بلکہ خود بھی قریب آ کے بیٹھ گئے۔ غلطی یہ ہوئی کہ احمد ہمیش نے ان سے پوچھ لیا "آپ مرغی کو ذبح کرتے ہیں یا جھٹکا فرماتے ہیں"...... جواب میں وزیر آغا نے فرمایا "میں تو مرغی کا گلا دبا دیتا ہوں"۔ یہاں اندازہ کیجئے کہ وزیر آغا کے اس فقرے کو احمد ہمیش نے اپنی سادگی اور معصومیت میں ظریفانہ ادا یا WIT سمجھا۔ ورنہ یہ کہاں معلوم تھا کہ وزیر آغا اپنے فقرے جیسی ہی وضع بھی اختیار کر لیں گے جیسا کہ موصوف ادبی دنیا سے "اوراق" کی ادارت تک زندگی بھر ادب کا گلا ہی دباتے رہے۔ تاہم جلد ہی یہ منکشف ہوا کہ وزیر آغا نے مرغی کا گلا دبانے کی سرشت انگریزی عملداری کے وقت کی مراعات اور بخششوں اور بعد کے حالات میں امریکی خارجہ پالیسی کے خوشامدانہ، فدویانہ اور عاجزانہ تاثر میں اختیار کی۔ غور کیا جائے تو انگریزی عملداری کے وقت سے بر صغیر میں جاگیرداروں، زمینداروں، فوجیوں اور بیوروکریٹس کے مشترکہ مفادات کو تحفظ دینے کی روایت کے زیادہ سے زیادہ پنپنے میں امریکی خارجہ پالیسی کا بڑا دخل رہا۔ کچھ اس طرح کہ امریکی خارجہ پالیسی کے زیر اثر پاکستان جیسے ملکوں کی تقدیر مرغی کا گلا دبانے والے ہاتھوں کی تکنیک کی ہی نذر ہوتی رہی۔ مگر ابھی وزیر آغا کو موضوع بنانے سے قبل ذرا دیر کے لئے ہندوستان سے متعلق امریکی خارجہ پالیسی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر ایک نظر کرتے ہیں۔

ہندوستان، جو امریکی خارجہ پالیسی کے زیر اثر تو کبھی نہیں رہا اور سابق سوویت یونین سے اس کے تعلقات چانکیہ کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہونا تھا کہ پڑوسی سے تعلق مت رکھو بلکہ پڑوسی کے پڑوسی سے تعلق رکھو...... تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہندوستان کے اقتصادی، سیاسی و ثقافتی معاملات میں دخل دینا امریکہ کے لئے مدتوں مشکل رہا

ہو گا۔ تاہم اعداد و شمار سے یہی پتہ چلتا ہے کہ امریکہ نے اپنی خارجہ پالیسی کے زیر اثر ملکوں خاص طور پر پاکستان کو معیار زندگی بلند کرنے اور ایزی منی Easy money کے حصول کیلئے مقابلہ کی چوہار دوڑ میں انتہائی کرپٹ کیا۔ مگر ہندوستان کو بیشتر سطحوں پر کرپٹ کرنا امریکہ کیلئے دشوار ضرور ہوا۔ سوائے اس کے کہ پنٹاگون کی متعلق ریسرچ سیل میں برسہا برس کی تحقیقاتی مہم سے صرف ہندوستانی ادب و ثقافت میں کچھ نقب زنی کی گنجائش نکل آئی۔ وہ بھی بیشتر اردو زبان کے ہندوستانی شاعروں ادیبوں کی مالی و جنسی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی صورت انہیں امریکی ادبی تھیوری کا ذہنی غلام بنانے تک۔ سو اس کے لئے ان کے یہاں گوپی چند نارنگ جیسے ایک ہی امریکی کارندہ کو خفیہ اور ظاہری کارستانی میں اتنا فعال دیکھا گیا کہ سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں کوئی ان کا بدل تھا ہی نہیں۔ پاکستان کے علاقہ بلوچستان سے آبائی تعلق ہونے کے ناتے ان کی مان جان پاکستانی سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں بھی تھی۔ اس کامیاب روایتی کھاؤ پیر داماد جیسی پائی گئی، جس کے لئے دونوں ملکوں میں تر مال کھانے کی سبیل نظر آئی۔ ستم ظریفی یہ کہ اردو شعر و ادب سے ان کا واسطہ محض اکتسابی و نصابی تھا، تخلیقی وجود تو وہ تھے ہی نہیں۔ سوائے اس کے ایک نقلی صاحب علم ہونے کی دھوکا دینے والی آسانی میں موصوف نے اردو اکادمیوں اور انجمنوں کے چوہا صفت کارندوں کی ایک ٹیم بنائی۔ بلسہ ان کے ہاتھ لگ گیا ایک نودولتیا کارندہ صلاح الدین پرویز، جو امریکی نگرانی میں کمپیوٹر کے ایک ادارہ سائسور یکس کی تکنیکی بساط پر یعنی کمپیوٹر کو مطلوبہ مواد فیڈ کر کے جعلی شعری و نثری مجموعوں کا ڈھیر لگانے اور اس طرح خود کو شاعر و ادیب باور کرانے کی انتہائی مہم پر نکلا تھا اور لگے ہاتھوں ہندو پاک کے شاعروں و ادیبوں کو خریدنا بھی اسکے پروگرام میں شامل تھا اور بھی کچھ طفیلی کردار آگے پیچھے پھرتے تھے۔ مگر چونکہ ان سب کو بڑی چابک دستی سے اپنی ٹیم میں ملانے اور امریکی مراعات میں اپنا حصہ کھرا کرنے نکلے تھے گرو گھنٹال گوپی چند نارنگ (جب کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی غیر معمولی علمیت شب خون کی جدیدیت اور اس کے حلقہ سمیت حائل تھی) لہٰذا ایک محتاط اندازہ سے امریکی مراعات کے ایک خاطر خواہ حصہ کو اپنی جھولی میں ڈالنے کی کوشش میں نارنگ نے پاکستان میں پنجاب نشین دولت مند زمیندار وزیر آغا کا انتخاب کیا۔ پھر چل نکلے پاک و ہند کے اصل شاعروں و ادیبوں کے تعاقب میں۔ معلوم ہوا کہ صلاح الدین پرویز نے نارنگ کی ہی ایماء پر کمپیوٹر کے ذریعہ لکھوائے ہوئے ایک ناول کی طباعت و اشاعت کا کام بلراج مین را کے سپرد کر دیا۔ اپنی دانست میں وہ ایک نو دولتیے سے ناول مذکور کی اشاعت کا خطیر معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش میں تھا تاہم مالی بدحالی کے باوجود شراب کی احتیاج نے وہ برے دن دکھائے کہ مین را نے اپنی کہانی "آتما رام" کی یادوں سمیت صلاح الدین پرویز کی دولت کو درخت سمجھتے ہوئے اس میں پناہ لی۔ لیکن اس کی احتیاج تو درخت مذکور کی دراڑ سے جھانک رہی تھی۔ سو ایسے غیر معتبر درخت میں چھپے ہوئے مین را کا نظر میں آنا ناگزیر ہوا۔ بس کیا تھا؟ نارنگ اور اس کے طفیلی حاشیہ برداروں نے درخت مذکور پر آری چلائی اور مین را کہانی کار کے سر دھڑ کو بیچ سے چیر دیا۔ یہ وہی مارچ ۸۰ء کا عرصہ تھا، جب دہلی میں منعقد ہوئے ہندو پاک اردو کہانی کے سمینار کے دوران

نارنگ نے شمیم حنفی کے گھر کے باہر کھڑے ہو کے بہ آواز بلند ان کی توہین کی تھی، فحش گالیں بکیں تھیں۔ صرف اس قصور میں کہ شمیم حنفی نے انتظار حسین کو اپنے گھر ٹھہرالیا تھا۔ جب کہ نارنگ کی خوشنودی میں انتظار حسین نے مصلحتاً چپ سادھ لی تھی، انھوں نے اپنے میزبان شمیم حنفی کی توہین کا تماشا دیکھنے پہ ہی اکتفا کیا تھا۔ شائد ایسے ہی کسی اندیشہ کو قبل ازوقت بھانپ لینے کی صورت انور سجاد نے مذکور سیمنار میں شرکت کرنا گوارا نہیں کیا ہوگا یا وہ بہ وجوہ نارنگ، وزیر آغا اور انتظار حسین سے بریکٹ ہونا نہیں چاہتے تھے یا انھوں نے یہ بھی اندازہ کیا ہوگا کہ مبادا اردو کہانی کا سیمنار کوئی غیر معتبر درخت ہوگا اور اس کے پس منظر میں امریکی تعاون کی آری ہاتھ میں لئے کھڑے نارنگ بس ایک اشارے کے منتظر ہوں گے۔ کیونکہ ان دنوں بائیں بازو اور جدیدیت سے انور سجاد کا انسلاک محل نظر تھا۔ خدانہ خواستہ اس انسلاک پر ہی آری چل جاتی۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ وہی آری احمد ہمیش کے سردھڑ پر بھی چل چکی ہوتی یا سیمینار مذکور میں شرکت کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا مگر شائد اسے شکل سے سادہ، بیوقوف اور معصوم نظر آنے کے سبب بخش دیا گیا ہو یا اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد حاصل ہوئی ہو کہ جب وہ اپنی جنم بھومی دیکھنے کی تکمیل تمنا اور جنسی محرومی کے ازالہ سے قطع نظر آری کے زد سے بچ گیا ہو! ورنہ ذکریا علیہ السلام کے پیرہن کے دھجی بھر ٹکڑے جیسے احتیاج کا قصوروار تو وہ بھی تھا۔ یہاں خیال رہے کہ ان دنوں گوپی چند نارنگ جدیدیت کے چودھری بنے ہوئے تھے اور اس ناتے ایک عرصہ تک وہ سماجی وابستگی کے بنا پر پورے ترقی پسند ادب کو مسترد کرتے رہے اور ابھی راک فیلر فاؤنڈیشن کی سرپرستی میں مابعد جدیدیت نے سر نہیں اٹھایا تھا تاہم نارنگ اس موقع کے منتظر بیٹھے تھے کہ کب مابعد جدیدیت کے تحت سماجی وابستگی کو مابعد جدید ادب کا ایک بنیادی عنصر قرار دینے کی صورت نکل آئے تاکہ اردو میں ترقی پسند ادب کی بھیڑوں کو اپنے گلے میں شامل کر کے امریکہ کی خوشنودی حاصل کی جاسکے اور راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملنے والے وظیفہ میں مزید اضافہ ہو سکے! سو، نارنگ کی اس مکارانہ دوغلی دور اندیشی کا جواب نہیں تھا کہ وہ بہت پہلے سے بائیں بازو کی جدیدیت اور وزیر آغا کے انشائیہ کے پس منظر اور اس کے دائیں بازو پر بیک وقت نظر رکھتے آئے تھے۔

جیسا کہ وزیر آغا نے وزیر کوٹ کے متنازعہ ورثہ میں ملے ہوئے زمیندارانہ تمول سے انشائیہ کی بساط بچھائی بلبہ اس کے بانی ہونے کے دعویٰ اور اس کی تشہیر کی لاٹھی بنائی۔ جب کہ انگریزی میں Light Essay کی روایت نثر میں نشاط فکر کو کفایت لفظی سے برتنے کے ایک میڈیا گرانداز سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس میں فکر تو سرے سے ہوتی ہی نہیں تھی، صرف ہلکے پھلکے مزاح ملے ہوئے سطحی نشاط سے مریضوں کا جی بہلایا جاتا تھا اور اس کی بڑی حد تک کامیاب مثال رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمٰن ماضی کے ایک حصہ میں گزر چکے تھے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے وزیر آغا جو نہ فکر رکھتے تھے اور نہ کسی نشاط کے اہل تھے، وہ آخر کس طرح انشائیہ کے بانی ہونے کے دعویٰ کے ساتھ ادبی تنقید میں اتر آئے! اس بھید کو کوئی آسانی سے اس لئے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ژاں پال سارتر نے مارکسزم کی گاڑی کی بوگیوں سے اپنی

وجودیت کی جو یوگی جوڑی تھی، وہ امریکی مفادات اور مفادات پیوستہ کے خلاف جارہی تھی۔ اس میں بھی ساختیات اور مابعد جدیدیت کے غیر شاعر و غیر ادیب آمروں بارتھ، لیوی اسٹراس، دریدا، لاکاں اور فوکو وغیرہ کے محض اندھے اتباع اور نقل میں گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا نے اپنا کام تو شروع کر دیا تھا۔ گو اس سے پہلے جدید اردو افسانہ پر تحقیق کے لئے امریکی خاتون لنڈا ونٹنگ پاک و ہند کے بڑے شہروں میں کچھ عرصہ قیام کر چکی تھیں اور اس دوران انہوں نے اردو میں ساختیاتی تنقید کی ابتداء کی تھی۔ یا ایک طرح سے انہوں نے نہ صرف ایک طرف کراچی کے محمد علی صدیقی کو متوجہ کیا تو دوسری طرف دہلی کے نارنگ اور سرگودھا+ لاہور کے وزیر آغا کو ساختیاتی تنقید کی راہ دکھائی تھی۔ تبھی کچھ یوں ہوا کہ نارنگ اور وزیر آغا کی خوش قسمتی سے ۱۹۸۰ء میں سارتر جسمانی موت مر گیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں نارنگ اور پاکستان میں وزیر آغا کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ جب کہ اس سے بہت پہلے سارتر کے تحریری وزبانی وسیع احتجاج سے امریکہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات میں عام بغاوت کی لہر پھوٹ پڑی تھی۔ اس سے مزید پیدا ہونے والے خطرہ سے بچنے کے لئے امریکی حکومت اور انتظامیہ نے بقول فضیل جعفری (تھیوری، امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت) مطبوعہ ذہن جدید۔ ۲۳ دہلی) "ہنری فورڈ دوئم سے مدد طلب کی۔ فلنڈرس یونیورسٹی (آسٹریلیا) کے پروفیسر جان ہارووڈ نے اپنی کتاب (Eliot to Derrida: The Poverty of Interpretation (1989) میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امریکی حکومت کی ایما پر ہنری فورڈ دوئم نے ۱۹۶۵ء کے آخر میں اپنے سازشی رفقائے کار (Co-conspirators) کی ایک میٹنگ طلب کی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک رولاں بارتھ اور ژاک دریدا کی سارتر دشمنی اور سارتر کے حوالے سے کمیونسٹ دشمنی کے چرچے عام ہو چلے تھے"...... اس کی وضاحت میں مضمون کے صفحہ پر فضیل جعفری لکھتے ہیں "چنانچہ ۱۹۶۵ء والی اس میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ فرانسیسی دانشوروں کے اس گروہ کو امریکہ مدعو کیا جائے تاکہ یہ لوگ ایسے مباحث اٹھائیں کہ ریڈیکل امریکی پروفیسر اور طلباء ان میں الجھ کر رہ جائیں اور پھر مدرسوں سے سڑکوں پر نہ آسکیں۔" اس سے ذرا آگے فضیل جعفری نے پروفیسر سدرینڈ کے لفظوں میں کچھ یوں بیان کیا ہے "امریکی سرمایہ داری ہی رد تشکیل اور تھیوری کی "شوگر ڈیڈی" ہے (شوگر ڈیڈی سے مراد وہ بوڑھا شخص ہے، جو کسی نوجوان عورت پر بے دریغ دولت خرچ کرتا ہے تاکہ آگے چل کر اس کا جنسی اور جسمانی استحصال کر سکے۔ ف۔ ج)" ظاہر ہے، یہاں احمد ہمیش کا تجزیہ یہ ہو سکتا ہے کہ پاک و ہند بر صغیر کا کوئی فرسٹریٹڈ شاعر و ادیب تو بڑھاپے کی عمر میں بلکہ موت تک امریکی شوگر ڈیڈی کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں، گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا کسی حد تک امریکی شوگر ڈیڈی کی نقل میں کچھ نہ کچھ انجوائے کر سکتے ہیں۔ اب ذرا اندازہ کیجئے کہ آخر گوپی چند نارنگ نے چند ماہ قبل

ساختی کباب میں رد تشکیل کی ہڈی۔ مطبوعہ: ذہن جدید۔ ۲۲ دہلی

تھیوری، امریکی شوگر ڈیڈی مابعد جدیدیت، مطبوعہ: ذہن جدید۔ ۲۳ دہلی از فضیل جعفری

مابعد جدیدیت پر بہ قول فضیل جعفری جو سیمینار منعقد کیا تھا، اس کا موڈل (غالباً) جان، ہاپ کنز یونیورسٹی والے سیمینار سے ہی کیوں اخذ کیا گیا تھا؟ کیونکہ اس سے کچھ سال پہلے وہ دہلی ہی میں ساتویں دہائی کے اردو افسانہ نگاروں کی ورک شاپ برپا کر چکے تھے اور اسی دوران ان کے اور وزیر آغا کے دوران کیا لکست پڑھت ہوئی کہ سوویت یونین کے سفارت خانہ اور کراچی میں واقع ایوان دوستی میں "آدم بو...... آدم بو" کے قبیل کے خطرے اور خوف کے سبب بڑی کھلبلی مچ گئی۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ سوشلزم اور ترقی پسندی کی بچی کھچی آبرو بچانے کے لئے کراچی میں ترقی پسند تحریک کی سلور جوبلی کانفرنس منعقد کی گئی۔ مگر اس سے بھلا آبرو تو کیا بچتی، الٹے برسہا برس سے تیار کی جارہی امریکی اور یورپی ملی جلی سازش کے تحت سوویت یونین کا زوال ہو گیا۔ اس کے بعد ہی امریکہ کی ہوس شکمی میں اچانک اتنا اضافہ ہوا کہ نئے عالمی نظام (New world order) کی توسیع کے ارادہ سے (جب کہ اس کا اعلان عراق پر حملہ کے بعد کیا گیا) سے اس نے جارج آرویل کے ناول 1984ء کا بگ برادر (Big brother) ہونا باور کرانا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ مابعد جدیدیت کے جوڈھیر سارے مینڈک مورخ آرنلڈ ٹوائن بی کی ابتدائی اصطلاحاتی اور لیوتار (G.F.Lyotard) فوسٹر (Foster) اور ٹافلر کی غیر انسانی تحریروں کے ہائبر نشین (Hibernation) کی پوشیدہ تہہ میں بہ وجوہ بے جان پڑے ہوئے تھے' وہ نئے عالمی نظام کی برساتی شہ پر باہر نکل آئے اور لگے ٹرانے۔ اس شور سے بے چارے ضعیف دیویندر اسر کے آرام میں اتنا خلل پڑا کہ وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھے اور ترقی پسندی کی پرانی پٹری سے اتر کے دیکھتے دیکھتے مابعد جدیدیت سے کیمرہ آگاہ (Camera conscious) ہو گئے۔ اسی لئے شائد بڑی عجلت میں انہوں نے "ادب کی آبرو" کتاب تصنیف کی۔ کیونکہ تحریر کے ابتدائی حصہ میں ہی انہوں نے بڑے عاجلانہ انداز سے "خدا کی موت" (نعوذ باللہ) 'انسان کی موت، تاریخ کا خاتمہ' نظریہ کا خاتمہ۔ جدیدیت کا خاتمہ 'آرٹ کا خاتمہ' ادب کی موت 'ادیب کی موت اور نقاد کی موت...... گویا کرۂ زمین کی موت اور کائنات کی موت کے اعلانیہ حوالے سے آخری حصہ میں پرنٹ لٹریسی بہ نام کمپیوٹر لٹریسی 'ماس میڈیا اور پاپولر کلچر کی بقا کو اعصاب پر تھوپ دیا۔

یہ اور بات کہ مابعد جدیدیت کے مینڈکوں کے ٹرانے اور دیویندر اسر کے رد عمل سے قطع نظر وزیر آغا نے جو شروع ہی سے امتزاجی مزاج پایا تھا کہ مختلف سلوک 'انداز اور رویوں کا راست اظہار نہ کر کے سب کچھ بھتیر، ہی بھتیر گھونٹ دینے یعنی مرغی کا گلا دبانے کی امریکی ان دیکھی حکمت کو شعری ونثری تحریر میں منتقل کرنے کی اکتسابی مہارت سے موصوف نے مابعد جدیدیت میں اگلے پچھلے تنقیدی مزاج کی آمیزش کی۔ یعنی تاثراتی، عملی، ہیتی، ساختیاتی، پس ساختیاتی اور رد تشکیلی تنقید کے نمونوں کو مترجمانہ صلاحیت سے مستعار لے کے آخر کار مابعد جدیدیت کو قبول کیا۔ مگر آمیزش کے

ادب 'عالمی نظام نو اور قصہ تمام شد: مطبوعہ ذہن جدید۔ ۲۳ دہلی

از: ریاض صدیقی۔

اس عمل کو امتزاجی تنقید کا نام دے کر راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملنے والی مراعات کے خاموش حصہ دار بن گئے۔ یہاں تک کہ کسی بھی اختلاف کا خود زبانی یا تحریری جواب نہ دے کے بہ ظاہر مثل شتر مرغ ریت میں منہ چھپالیا مگر "اوراق" اور اس کے طفیلی رسائل کے صفحات پر اپنے حاشیہ برداروں اور حلقہ بگوشوں کو جوابی تحریری کاروائی پر مقرر کر دیا۔ مزے کی بات یہ کہ یہ ادا بھی وزیر آغا نے فیض احمد فیض سے سیکھی۔ انکی ان سے زیادہ صحبت تو نہیں رہی تاہم جب وہ موسم گرما کی شدت برداشت نہ کر کے کوہ مری کے اعلیٰ ہوٹل میں قیام کرتے تو کبھی کبھار زمیندارانہ تمول اور ترقی پسندی کے درمیان ریاکارانہ جفتی کی گنجائش نکل آتی۔ جب کہ فیض کے متعلق ایک دلچسپ تاثر یہ تھا کہ وہ اپنے مقابل کے بدترین مخالف کے بڑے سے بڑے اختلاف کو خاموشی سے پی جاتے، بس بے نیازی سے مسکراتے رہتے۔ البتہ وزیر آغا فیض کی طرح اختلاف رائے کو خاموشی سے سن لینے یا تحریر میں پڑھ لینے کی اداسے قطع نظر اپنی چینی بناوٹ والی نیم باز آنکھوں اور تمتمی لاما والے چہرے مہرے سے اپنا موقف اپنے طفیلی طرف دار فریق تک پہنچادیتے۔ ان کے سب سے فعال فریق ڈاکٹر انور سدید برسہا برس سے انہیں بڑا شاعر اور بڑا نثر نگار اور نقاد باور کرانے کی کوشش کرتے آرہے ہیں۔ اب ذرا اندازہ کیا جائے کہ کئی سال پہلے عمیق حنفی نے وزیر آغا کے آریائی وراثتی دعویٰ کو رد کیا تھا۔ جب کہ وزیر آغا نے "میراجی دھرتی پوجا کی ایک مثال" مضمون میں میراجی کے آریہ ہونے کے اور بجنل دعویٰ کو از خود مستعار لینے کی کوشش کی تھی۔ بعد اس کے جب فضیل جعفری نے وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کو ہدف بناتے ہوئے اسے "آرکی ٹائپل تنقید" قرار دیا۔ بلکہ لگے ہاتھوں ان کے خود ساختہ آریائی ورثہ کا ایکسپوژر کچھ یوں کیا "کاش! آریہ نہ ہندوستان آتے اور نہ اردو ادب پر یہ مصیبت نازل ہوتی"۔ اس طرح وارث علوی نے اپنی متشدد تنقید نگاری سے قطع نظر وزیر آغا کی علمی و تخلیقی حیثیت کو تمسخرانہ حد تک مشکوک تو ضرور بنادیا۔ البتہ سب سے بڑھ کے ساقی فاروقی نے اپنی کتاب "ہدایت نامہ شاعر" کے ابتدائی صفحات پر ہی وزیر آغا کی شاعری (غزل اور نظم) کو زبان کے غلط استعمال اور بھونڈے و مفلوج اظہار و برتاؤ کے زمرے میں رکھتے ہوئے غیر معتبر قرار دیا۔ تاہم ان سب کی تحریری مہم یکسر ضائع گئی اور وقت بہت تباہ ہوا۔ جب کہ وزیر آغا پر زبانی کچھ کہنے سننے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یاد رہے کہ کچھ سال پہلے ہی احمد ہمیش نے اپنے رسالہ سہ ماہی تشکیل۔ حصہ دوم شمارے ۷،۸،۹) اکتوبر ۹۲ تا ستمبر ۹۳ء کے اداریہ کے چھٹے پیراگراف میں برملا لکھا تھا "احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا زندگی بھر ایک تخلیقی لفظ نہیں لکھ سکے" ہاں اس کی مزید وضاحت کے لئے وزیر آغا کی غزل و نظم کی شاعری میں سے صرف ایک نظم کی ایک سطر "اون اتری بھیڑ کی مانند پیڑ" کی مثال سے ان کا غیر شاعر ہونا قرار دیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ مذکور سطر کی لفظیات بھونڈی اور اظہار و برتاؤ مکروہ ہے۔ دوئم یہ کہ وزیر آغا میں جمالیاتی حس کا اتنا فقدان ہے کہ موصوف پانی کی قلت سے مارے ہوئے ایک سوکھے اور چھال سے عاری پیڑ (نباتاتی معروض) کو ایسی بھیڑ سے تشبیہ دے رہے ہیں، جس کے جسم سے اون اتاری گئی ہے جب کہ بھیڑ اور اس کا اون، چرندے سے متعلق معروض ہے۔ یعنی

ایک معروض کا دوسرے معروض سے حسی، نظری و بصری کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور ایک دوسرے میں کوئی معنوی ربط بھی نہیں۔ ایسی ہی بے تکی و بے معنی تشبیہوں اور بھونڈے و مکروہ اظہار اور برتاؤ سے وزیر آغا کی تمام غزلیں اور نظمیں اٹی پڑی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وزیر آغا کو تخلیقی وجود بخشا ہی نہیں۔

مشکل یہ کہ بہت سے معلامات، متعلقات اور مضمرات اتنے گنجلک اور مخبوط ہیں کہ انہیں آسانی سے علیحدہ علیحدہ واضح صورت میں ایکسپوژ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جس زمانہ میں بنگال میں نکسلائٹ آندولن چل رہا تھا تو اسے دبانے کچلنے کے لئے ایک بدنام ایس پی کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز پچاس پچاس نکسالیوں کو شوٹ کرتا اور پھر اپنے بنگلہ پہ آ کے نہا دھو کے سر سبز لان میں رکھے ہوئے تخت پر ستار لے کے بیٹھ جاتا۔ پورے اطمینان سے وہ دیر تک ستار بجا رہا ہوتا۔ اس مثال سے بہ ظاہر تضاد تو نظر آتا ہے کہ ایک انتہاء پر سفاکی تو دوسری انتہا پر سنگیت۔ جب کہ ایک روایت نیرو کی ہے...... کہ وہ روم کو آگ لگا کے 'جلتے ہوئے شہر کا تماشہ دیکھنے کے ساتھ ہی دور پہاڑی پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چنگیز خاں کو موسیقی سے اور ہٹلر کو مصوری سے دلچسپی تھی۔ ان مثالوں سے مزید حیران ہونا ضروری نہیں...... جیسا کہ وزیر آغا اراضی کے مقدمہ میں اپنے حریف کو ظالمانہ و سفاکانہ پسپا کرنے کے بعد شاعری کرتے رہے۔ یا جیسے فیلڈ مارشل ایوب خاں سے جنرل ضیاء الحق کے دور تک قدرت اللہ شہاب 'ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے درباری مثلث سے سیاسی تصوف کی بنیاد پڑی۔ اس میں ایک طرف ماس میڈیا خاص طور پر ٹی وی اسکرین سے فقر' درویشی، قناعت اور توکل کا تاثر دے کے عام و خاص کو بہ یک وقت بیوقوف بنانے...... تو دوسری طرف اہل اقتدار کے گناہوں کو اگربتی کے دھوئیں سے دھونی دے کے پاک کرنے اور اس طرح کسی چور دروازہ سے مفادات کا حصول تو جاری رکھا گیا۔ پھر ایک میڈیا کر افسانہ نگار منشا یاد جن دنوں سی ڈی اے اسلام آباد کے بڑے عہدیدار تھے...... تو گوپی چند نارنگ نے ان سے پی آر کر کے جنرل ضیاء الحق تک رسائی کی یہاں تک کہ بھارتی شاعروں وادیبوں اور دانش وروں کے لئے ممنوعہ پی ٹی وی کے اسکرین سے نارنگ نے خطاب کیا۔ البتہ اس رسائی میں منشایاد کے در پردہ تعاون کے عوض نارنگ نے ان کی کہانیوں کا انگریزی ترجمہ بھارت سے شائع کروالیا۔ سنا ہے کہ مذکور کتاب کی اشاعت میں راک فیلر فاؤنڈیشن سے دی جاتی رہی مراعات کا بڑا دخل تھا۔ اب یہاں پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آخر وزیر آغا کس زمانے سے نوبل پرائز حاصل کرنے کے خبط میں مبتلا ہوئے! اور اس کے لئے کسی نے انہیں اپنی اردو نظموں کا انگریزی ترجمہ کروانے کی ترغیب دی! اور کن پراسرار ذرائع سے انگریزی ترجمہ کی بات امریکہ سے سویڈن تک پہنچی۔ معلوم ہوا کہ انگریزی ترجمہ خطیر معاوضہ پر کیا گیا۔ سویڈن میں پرویز پروازی نام کے کوئی صاحب وزیر آغا کے ایجنٹ کے طور پر ان کی شاعری کو اردو یا اس کے انگریزی ترجمہ سے سویڈش زبان میں منتقل کرانے میں کوشاں رہے۔ بعدہ انہوں نے وزیر آغا کی کتاب "ایک کتھا انوکھی" کا سویڈش زبان میں ترجمہ ایک سویڈش خاتون ایوا الفورس سے کروالیا۔ پھر اس پر کسی سویڈش شاعر سے زبانی و تحریری داد دلوائی گئی۔ یہاں تک کہ کسی سویڈش تبصرہ نگار نے

وزیر آغا کو اردو کا عظیم شاعر گردانا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وزیر آغا پہلے شاعر ہیں' جنھوں نے سویڈن کا دورہ کیا۔ گویا یہ سارا منصوبہ نوبل پرائز کے حصول کے لئے ہی بنایا گیا۔ اب بات یہ ہے کہ قیصر تمکین نے ایک طرح سے حتمی فیصلہ دے دیا کہ وزیر آغا الٹے لٹک جائیں مگر انھیں نوبل پرائز نہیں مل سکتا۔

تاہم یہاں کچھ ایسے نامکمل ٹکڑوں (Fragments) کے اندراج پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ جن سے مابعد جدیدیت کے تاریخی پس منظر' معاشرتی پیش نظر اور وزیر آغا کے مقدر کی تفہیم ہو سکتی ہے

(۱) ای میل اور انٹرنیٹ کی دریافت میں دخیل پنٹاگون کی نیت تو یہ تھی کہ اگر دنیا میں تیسری جنگ عظیم برپا ہو اور امریکہ کے بڑے شہر (دنیا کے دوسرے بڑے شہر اور آبادیاں چولہے بھاڑ میں جائیں) تباہ ہونے کے اندیشہ میں ہوں تو زیر زمین ایسی تحفظاتی پناہ گاہیں بنائی جائیں کہ ان میں صرف منتخب مدبر سیاستدان (States men) بڑے امریکی سرمایہ دار اور اہل تولید امریکی عورتیں قیام کریں اور تب ایک دوسرے سے فوری رابطہ کے لئے ای میل اور انٹرنیٹ کو بروئے کار لایا جائے۔ مگر تیسری جنگ عظیم کے خطرہ کے بہ ظاہر ٹلنے کے بعد اب ذیلی جنگوں، تنازعوں، مختلف اقسام کی مافیاؤں، دہشت گردی اور جنسی شہوت سامانی میں فلیتہ یا لتی لگانے کے لئے ای میل اور انٹرنیٹ کی سہولتوں سے دنیا بھر میں کام چوری' ننگے پن' کاہلی' آرام طلبی' جنسی بلیک میلنگ اور بڑے بڑے مالیاتی فراڈ کی حوصلہ افزائی کرنے میں بگ برادر Big brother کی کارستانی محل نظر ہے۔ اس پر ستم ظریفی علیحدہ ہے کہ اقوام متحدہ اور حقوقِ انسانی کے اداروں کو سرپرستی کی آڑ میں ملازم اور مفعول بنانے کے باوجود نیک نام تو امریکہ ہی بنا پھرتا ہے۔

(۲) "شعر و ادب ہوں یا علوم و فنون' بین الاقوامی سیاسی اقتصادیات (Politcal economy) خارجہ دفاعی پالیسیوں کی زد میں آ گئے۔ تعلیمی اداروں میں کون سے مضامین پڑھائے جائیں کہ انگریزی زبان (امریکی انگریزی) کی ترویج اور اشاعت کو مزاحمت کا سامنا نہ ہو۔ ایسے تمام امور کا تعین اب آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کرتے ہیں"۔ ادب' عالمی نظام اور قصہ تمام شد: مضمون' از ریاض صدیقی۔ مطبوعہ ذہن جدید۔ ۲۳ دہلی۔

(۳) ٹی وی کلچر کی صورت پاک و ہند بر صغیر میں امریکی معیار زندگی کی ترغیب' آسائشیں' گلیمر' مہنگی جنسی رشوت کی لین دین' گے' لزبئین اور ہوموسیکسول تعلقات کی آزادی سے متعلق انٹرویو زپروگرام کی باربار پیشکش۔

(۴) جیسا کہ نصف صدی قبل بر صغیر میں نوجوان نسل والدین سے جاگیردارانہ و زمیندارانہ فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کرتی تھی اور ریڈیکل آدرشوں سے سرخ رو ہوتی تھی۔ مگر نصف صدی بعد کی موجودہ نوجوان نسل والدین سے حرام خوری' اسمگلنگ' چوری ڈکیتی اور زنا کی آزادی کے لئے بغاوت کرتی ہے اور اس بغاوت کی تربیت امریکی آلہ کار سیاسی پارٹیاں اور لسانی تنظیمیں کرتی ہیں۔ خاص طور پر پاکستان کے شہر کراچی میں 99 فیصد نوجوان نسل امریکی پروردہ لسانی اور مذہبی تنظیموں کے ذریعہ تباہ و غارت ہو چکی ہے۔

(۵)　　امریکی سرپرستی میں اب کسی بھی شئے سے اس کے اوریجنل مالک' پیداوار سے اس کے پیدا کرنے والے اور تخلیق سے اس کے تخلیق کار کو جبری نکال باہر کیا جارہا ہے۔ جیسے باسمتی چاول پیدا کرنے والے دو ملکوں ہندوستان اور پاکستان کے کاشتکاروں کو امریکن ٹریڈ آرگنائزیشن (لفظ "باسمتی" کو ٹریڈ مارک رجسٹرڈ کروانے کی اتھارٹی) نے قانونی نوٹس دی ہے کہ وہ باسمتی چاول کی پیداوار فوراً بند کردیں۔ ورنہ ان کے خلاف بین الاقوامی کورٹ میں قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ اس طرح سنا ہے کہ راک فیلر فاؤنڈیشن کی سرپرستی میں وزیر آغا اور نارنگ قبیل کے نقاد جو دراصل شعروادب کے مستری (Technicians) ہیں' ان کی خودساختہ اشرافیہ (Elite) کو شعروادب کے تخلیقی وجود پر مسلط کردیا جائے گا۔

(۶)　　ایک روایت قائم ہوچکی ہے کہ امریکہ کا کوئی مخالف زمین پر طبعی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ شائد اسی اندیشہ کی انتہا میں جاکے احمد ہمیش نے داستان "پش اور نیل" کے آخری حصہ میں کچھ یوں لکھا ہے: "سنو! محمد بے لوث ساکن جنوبی ایشیاء سنو! اور اگر تم ہی مصنف بھی ہو تو مزید غور سے سنو.......... کہ وہ جو عالم بالا کہلاتا ہے......وہ کہیں ہفت افلاک پر نہیں۔ عالم بالا تو امریکہ ہے...... صرف امریکہ ہے......وہیں سے آدمی، چرند، پرند و درند، حشرات الارض' نباتات اور جمادات کی زندگی اور موت جاری کی جاتی ہے۔ ہر روز' ہر لحہ...... یہ جو دنیا میں لوگ مرتے ہیں اور مررہے ہیں یا مارے جارہے ہیں' ان کی روحیں ہفت افلاک پر نہیں...... راست امریکہ بلوائی جاتی ہیں......وہیں ان کا حساب کتاب ہوتا ہے......وہیں ان کا میدان حشر ہے"۔

(۷)　　مابعد جدیدیت کے زمرے میں تاریخ کی موت ہوچکی ہے۔ تو اب رہ کیا گیا ہے!......سوائے اس کے کہ دیویندر اسر کے بہ قول مابعد جدیدیت کی جائے آج کے زمانہ کو عہد مرگ کے نام سے موسوم کرنا زیادہ صحیح ہے "مگر یہ کیا ستم ہے کہ اس "عہد مرگ" میں مردے کو زندہ باور کرانے کے لئے KFC' میکڈونلڈ اور پزاہٹ (Pizza Hut) کی برانچیں امریکی طرز پر برگر، کوکا کولا اور پزا کلچر کی ملی جلی پررونق قیمتی کا تاثر دے رہی ہیں۔ خاص طور پر برصغیر پاک و ہند کے بڑے شہروں میں رہائش گیر مگر امریکی نطفہ سے پیدا ہونے والی حرامی برگر کلاس کی تفریحات اور تعیشات کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ لگتا ہے کہ برگر کلاس کھاپی رہی ہے تو گویا سبھی کھاپی رہے ہیں۔ کہیں کوئی غریب اور بھوکا ننگا نہیں۔ کیونکہ غریبی اور بھوک کو مٹانے کے لئے سرے سے غریبوں اور بھوکوں کو ہی مٹایا جارہا ہے۔ ٹی وی کلچر سے عام تاثر بھی دیا جارہا ہے کہ ہندوستان پاکستان میں برگر کلاس کے علاوہ کوئی اور کلاس نہیں۔

(۸)　　ایک عجب تضاد ہے کہ راک فیلر فاؤنڈیشن کے بانی راک فیلر کو ادب و ثقافت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ محض ایک کٹر بنیاد پرست مذہبی ہے......البتہ محل نظر یہ ہے کہ وہ جو شروع شروع میں ایک معمولی بک کیپر تھا کسی طرح رفتہ رفتہ بزنس کے مختلف مقابلوں کی دوڑ میں اپنے تمام حریفوں کو سفاکانہ مار کچل کے آخر نہ صرف ایک

کارٹیل کا اجارہ دار بن گیا بلکہ دیکھتے دیکھتے امریکی سیاست 'اقتدار اور انتظامیہ میں برابر کا دخیل ہو گیا۔ شائد اسی لئے اسے امریکہ میں سب سے قابل نفرت دولت مند (The most hated millionaire in America) کہا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ دنیا بھر کے ادب و ثقافت کو ٹرسٹ اور فاؤنڈیشن کے نام پر اس لئے خرید رہا ہے' سرمایہ لگا رہا ہے کہ اس سے اس کی دانست میں بائیں بازو سے متعلق مزاحمت اور احتجاج کے تمام رجحانات آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔ بھوک 'غربی' لاچاری اور محتاجی کو آؤٹ آف ڈیٹ اور آؤٹ آف فیشن قرار دے دیا جائے گا۔

متذکرہ بالا ٹکڑوں Fragments کے تناظر میں یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان پاکستان دونوں ملک دراصل گندے 'غلیظ اور متعفن تالاب یا جوہڑ ہیں، جن میں اقتدار، طرزِ جمہوریت 'انتظامیہ سرکاری و غیر سرکاری ادارے وغیرہ سبھی قدیم جونکیں ہیں اور جونکیں خلقت کا خون ہی تو چوس رہی ہیں۔ مگر اس جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہوتے ہوئے بھی شعور کی سطح پر اس طرح خبط کر دی گئی ہے کہ آسانی سے کسی عمل اور اس کے رد عمل کو ٹریس کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مثلاً یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے ایٹمی دھماکے کئے تو اس کے ساتھ ہی عوام پر ناقابل برداشت ٹیکس لاد دیئے گے' انتہائی منگائی سے خلقت کا جینا دوبھر کر دیا گیا۔ تبھی معلوم ہوا کہ امریکی ڈالر کی قیمت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور ابھی انفرادی و اجتماعی آعصاب ٹوٹنے کے دوران ایک پل سانس لینے کی مہلت نہیں ملی ہو گی کہ اک دم دونوں ملکوں میں درباری شاعروں اور ادیبوں کے لئے اکادمیوں کے بہ توسط پچاس ہزار سے لے کے ایک لاکھ اور پانچ لاکھ تک کے انعامات کی تقسیم کا اعلان ہونے لگا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی پنچ ستارہ ہوٹلوں میں پر گلیمر تقریبات کی اسٹیج پر اداکاراؤں کی جنسی اپیل کی تشہیر اور سرعام حظ اٹھانے کے علاوہ انعامات و اعزازات بھی تقسیم کئے جانے لگے۔ تاہم ان سب پر غور کرتے ہوئے عقدہ یہ کھلا کہ اس طرح امریکہ اپنی گلوبل اکانومی (Global economy) کے عالمگیر تسلط سے مشرق و مغرب کے تمام ملکوں کو معاشی غلام بنا کے ہی رہے گا۔ پھر ایک حشر برپا ہو گا' جب وزیر آغا اور نارنگ سمیت تمام غیر تخلیقی وجود عالمگیر معاشی غلامی میں ضم ہو جائیں گے۔ ایسے میں کوئی احتجاج تو اس لئے باقی نہیں رہے گی کہ دشمنوں کے ڈر سے اور تعاقب سے بھاگ کے اپنی جان بچانے کے لئے کسی غیر معتبر درخت میں چھپنے یا پناہ لینے والا کوئی محتاج سرے سے زندہ ہی نہیں ہو گا تو ذکریا علیہ اسلام والی تمثیل کے مصداق آری کس کے سر دھڑ پر چلے گی! تاہم یہ بھی تو ممکن ہے کہ پرنٹ لٹریسی' ماس میڈیا اور پاپولر کلچر پر مشتمل مابعد جدید منچلے اپنی بقاء کے فرضی و مصنوعی جواز سے کوئی مادی اسم اعظم مردے کو زندہ کرنے کے لئے آزمائیں (کلوننگ کے تجربہ کے بعد مُردے میں جان ڈالنے کا تجربہ ہی تو باقی رہ گیا ہے) تو کیا ہو گا! کیا مردے زندہ اٹھ کھڑے ہوں گے! اگر مبادا ایسا نہ ہو' جو حضرت عیسٰی علیہ اسلام سے روایت ایک تمثیل کے بہ حوالہ ہوا تھا...... کہ کچھ منچلے حضرت عیسٰی علیہ اسلام کے پاس گئے اور ان سے اسم اعظم سیکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے پہلے تو سکھانے سے گریز کیا مگر بہت اصرار پر انھوں نے انھیں اسم اعظم سکھا دیا۔ فوراً بعد ہی منچلے ایک جنگل سے گزرے تو راستے میں ایک بڑا سا ہڈیوں کا ڈھیر دیکھا۔ مارے عجلت اور ناعاقبت اندیشی میں انھوں نے مذکور ہڈیوں کے ڈھیر پر اسمِ اعظم پھونک دیا۔ بس کیا تھا' دیکھتے دیکھتے اس بڑے سے ہڈیوں

کے ڈھیر سے ایک بڑا سا شیر زندہ اٹھ کھڑا ہوا اور تمام منچلوں کو چت کر گیا۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ تمام مادی بساط اپنی جگہ دھری رہ جائے اور کسی گم کردہ راہ یا کسی گم نام گوشہ میں پڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھیر سے کوئی تخلیقی وجود اٹھ کھڑا ہو اور تمام غیر تخلیقی وجود کو امریکہ سمیت نگل جائے اور کائنات پر اپنا امر ہونا ثبت کر جائے۔

تخلیقی وجود غیر تخلیقی وجود کے ہوتے ہوئے جسمانی وجود قائم نہیں رکھ سکتا

خیر النساء جعفری کی کاٹ دار کہانیوں کی کاٹ سے بچنے کے لئے اس کے تخلیقی وجود کو برداشت نہیں کیا گیا۔ صائمہ خیری نے بینائی سے محروم ہونے سے پہلے دنیا کو کتنے پل دیکھا اور اپنی جسمانی موت سے پہلے کون سا آخری گیت لکھا! عبید اللہ علیم آخری دیدار کے دوران خندہ بہ لب کیوں تھے! اور ان کے جسمانی وجود سے بچھڑ جانے پہ صرف شیر کو ہی غم کیوں ہوا! جب کہ لکڑ بگھے اور بھیڑیئے خوش تھے کہ ان پر لعن طعن کرنے والا ان کی مادی حدود ارضی سے بہت دور روحانی آسمان کی طرف چلا گیا۔ صلاح الدین محمود کے تخلیقی وجود کی موت تو نہیں ہوئی۔ موت تو بہت پہلے لاہور کی ہوئی۔ اگر لاہور زندہ ہوتا تو "سویرا" کے دفتر میں سے صلاح الدین محمود کی ادارت میں شائع ہوئے کئی شماروں کی کاپیوں سے شعر و ادب کی زندگی کی بازیافت ہو سکتی۔

پردہ اٹھتا ہے

ادارہ

(۱) اوزون کے غلاف میں مزید شگاف کا اندیشہ

اوزون کے غلاف میں جس آلودگی سے شگاف ہوا، وہ صرف پانی اور ہوا کی آلودگی نہیں بلکہ دنیا بھر کے بدباطن کی آلودگی بھی ہے۔ مثلاً دنیا کی مملکتوں وریاستوں کے اہلِ اقتدار کے ہلاکت خیز حربوں کی آلودگی، نام نہاد معاشروں کے ظالمانہ وجابرانہ رویوں کی آلودگی، غیر انسانی سرشت اور مزاج کی آلودگی اور درباری اور ماتحتی نظام میں ایک دوسرے کا بگا ہوا کھانے کی آلودگی یہاں تک کہ حرف ولفظ کی بے حرمتی اور بے ضمیری کی آلودگی سے اوزون کے شگاف میں مزید شگاف کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ ابھی حال ہی میں اسلام آباد میں نام نہاد شاعروں و ادیبوں کا ایک میلہ لگایا گیا۔ بلکہ یہ ادیبوں کی بجائے میلۂ مویشیاں تھا۔ اس میں پہلے سے طے شدہ درباری شاعروں وادیبوں کو پچاس ہزار سے ایک لاکھ اور پانچ لاکھ تک کی رقم کے انعامات تقسیم کئے گئے۔ اس پر ستم یہ کہ ادبی انعام یافتگان کے ججوں کو بھی من مانی انعام دلانے کے لئے بہ طور حقِ نمک پچیس ہزار روپے دیئے گئے۔ بہ شمول احمد ندیم قاسمی جو خود جج بھی تھے اور انعام حاصل کرنے والے بھی بہ مع ان کی "منھ بولی بیٹی" منصورہ احمد۔ ایں چہ بوالعجبی یاد رہے کہ ان ججوں میں انتظار حسین، مشتاق یوسفی اور مشفق خواجہ جیسے حضرات بھی شامل تھے۔ ان میں کوئی جینوئن ادب کا پارکھ نہیں تھا۔ جب کہ انعام پانے والوں میں آصف فرخی جیسا نوسکھیا (NOVICE) مترجم بھی شامل تھا۔

(۲) واش بیسن پر اپنے گناہوں کے چھینٹے اڑاتا

یہ سلیم شہزاد کی نظم "انیس ناگی کے لئے ایک نظم" (شعری مجموعہ "ماسوا" میں شامل بہ طور حوالہ درج کی جارہی ہے۔ اب انیس ناگی کے واش بیسن اور واش بیسن پر ان کے گناہوں کے اڑتے چھینٹوں کی تفصیل میں تو جانا محال ہے۔ مگر بہ قول خود "ریکارڈ درست رکھنا چاہیے" کے مطابق تو انہوں نے اپنا ریکارڈ کبھی درست نہیں رکھا اور اپنا ریکارڈ درست نہ رکھنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ مثلاً جب ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے کیف ٹیریا کی چائے والی میز پر جیلانی کامران کی موجودگی کے دوران انہوں نے احمد ہمیش کی کئی نثری نظمیں سن کے فیصلہ کن لہجہ میں فرمایا تھا "اردو میں نثری نظم کا کوئی جواز نہیں"۔ تو یہ فقرہ انہوں نے اپنے ریکارڈ میں کیوں نہیں شامل کیا! صرف انہیں یہی کیوں یاد رہا کہ احمد ہمیش لاہور میں [ا] خستہ حال تھے! یا انہوں نے اپنی بیوروکریسی کی آنکھ سے احمد ہمیش کی خستہ حالی دیکھی! لیکن شعر وادب خلق کرنے سے ادیب کے خستہ حال ہونے کا کیا تعلق ہے! جب کہ انیس ناگی کے ریکارڈ میں تو غیر متعلق فقروں کی تعداد

[ا] دانش ور - شمارہ ۲۴، ...... ۱۹۹۸ء : مدیر عفت انیس

خاصی ہے۔ کئی سال گزرے ایک بار سجاد باقر رضوی (ان دنوں زندہ تھے) نے آدھی رات گئے انور سجاد کو یہ بتایا کہ انیس ناگی کہتے ہیں ...... انور سجاد کے افسانے میں لکھتا ہوں۔" اس پر انور سجاد نے جواب دیا "وہ ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں اور خوش ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ میری نثر بہت عمدہ ہے۔ لیکن افسوس کہ انیس ناگی کی نظموں کے بارے میں، میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ بہت بُری نظمیں ہوتی ہیں۔

(۳) چور اور ڈاکو کے درمیان ایک مخلوق!

اس بار سہ ماہی "تشکیل" میں انور سجاد سے گفتگو۔ از ریحان صدیقی شامل ہے۔ اس انٹرویو کے مطالعہ سے ریحان صدیقی کے فنِ گفتگو اور فکشن کے علم کا بہ خوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ریحان صدیقی نے احمد ہمیش سے انٹرویو لیا اور وہ سہ ماہی "بادبان" کے اول شمارہ ۹۵ء میں شائع ہوا۔ اسکی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے بڑے پیمانہ پر سراہا گیا۔ مگر اس کیساتھ ہی ایک افسوس ناک پہلو محلِ نظر ہے۔ کئی شواہد ایسے بھی ملے ہیں، جو مذکور انٹرویو سے گہرا اثر قبول کرنے والوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ بات تو باعثِ اطمینان ہے لیکن کچھ نفوس نے اس انٹرویو کے بہت سے فقرے اور خیالات بغیر حوالے کے اپنا لئے ہیں۔ مثلاً گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتاب "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ" اردو اکاڈمی ۱۹۹۸ء میں شامل بیگ احساس کی تحریر "میرے تخلیقی محرکات اور آج کی ادبی فضا (فکشن کے حوالے سے) کے صفحہ ۴۹۳ پر سریندر پرکاش سے متعلق درمیان کی ۱۲ سطریں بک شیلف میں محفوظ زمین۔ احمد ہمیش سے گفتگو۔ از ریحان صدیقی سے مستعار لی گئیں۔ اسی طرح سہ ماہی "اثبات و نفی" کلکتہ کے گزشتہ شمارے میں مخمور سعیدی کے انٹرویو میں بھی ریحان صدیقی کے سوالوں اور احمد ہمیش کے جوابات سے کئی کئی سطریں اخذ کر لی گئیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ چور اور ڈاکو کے درمیان ایک مخلوق اُچکا ہوا کرتی ہے۔ جو اپنے ہدف کی بے خبری میں اسکے مال کو اس سے اُچک لیجاتی ہے۔ جیسا کہ گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے سلسلے میں مغربی فکریات اُچکتے رہتے ہیں۔ اور اب نارنگ کا ایک ہی کاروبار ہے کہ امریکہ کی زیرِ ہدایت Fast Food اور Fast Sex کی طرز پر Fast Literature کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

(۴) موجودہ محمد تغلق

موجودہ زمانہ کے محمد تغلق نے جہاں زندگی کے بہت سے اہم اسباب، انسانی جانوں، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کو کراچی سے اسلام آباد میں منتقل کیا اور انہیں پامال و غارت کیا، وہیں گنجائش نہ پاکے اس کے حکم سے کراچی کے کئی اور اہم اسباب اور قدروں کو لاہور میں منتقل کیا گیا اور انہیں پامال اور غارت کیا گیا۔ مثلاً کراچی ٹی وی پر ایک ادبی پروگرام "ادبی منظر" کو سحر انصاری کی شخصیت کے توسط سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی...... تو اسے برداشت نہ کرکے لاہور ٹی وی لے جایا گیا اور اسے وہاں کے کمپینٹ کے ہاتھوں جلد ہی نیست و نابود کر دیا گیا۔ اور اسلام آباد کے زیرِ اہتمام تو مذکور پروگرام کی انفرادیت اور وحدت ختم کر کے محض بازاری بنا دیا گیا ہے۔

(۵) ہیجڑے

بات یہ ہے کہ راولپنڈی راسلام آباد کی ادبی فضا میں کچھ ہیجڑے گھس آئے ہیں جو اپنے کولہے مٹکا کر اور بے شرمی کی تالی بجا کر فائدے اٹھا رہے ہیں۔ "کنجر گروپ اور طوائف گروپ" اس پر مستزاد ہیں

احمد ہمیش کے نام رفیق سندیلوی کے ایک خط سے

(۵) ادب کے کھوٹے سکے اور تعلیم مافیا

محبوب خزاں نے بھی کبھی کیا پتے کی بات کہی تھی کہ اردو میں شاعر کچھ ہوتے ہیں مگر مشہور کچھ اور لوگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی کچھ اور لوگ میڈیا کا سہارا لے کر اور دیگر شیطانی ذرائع کا بھرپور استعمال کر کے مشہور ہو جاتے ہیں اور جینوئن شاعر / ادیب گوشہ گمنامی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔ غور کریں تو شہرت اور مقبولیت حاصل کرنا اب ایسا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ بشرطیکہ مالی حیثیت مستحکم اور سماجی رتبہ بلند ہو اور آدمی کنجوس نہ ہو بلکہ کھلانے پلانے میں ڈاکٹر وزیر آغا جیسا فیاض ہو خواہ تھرڈ کلاس کا ادیب / شاعر ہو اور وزیر آغا ہی جیسی بُری شاعری کرتا ہو مگر مندرجہ ذیل طریقہ کار پر عامل ہو۔

ادبی رپورٹروں، اخباری کالم نویسوں، مبصروں، تذکرہ نگاروں، اور ادبی صفحات کے انچارجوں سے کام ودہن کے قریبی تعلقات قائم کرنا۔ اپنے بارے میں تواتر سے متعلقہ، غیر متعلقہ، فرضی خبریں، کالم، تبصرے اور تذکرے چھپوانا۔ اپنے ادبی منشیوں اور ممنونِ احسان نقادوں سے توصیفی مضامین لکھوانا۔ ادبی، غیر ادبی رسالوں کے مدیروں کو زیرِ احسان لاکر اپنے گوشے اور خاص نمبر شائع کرانا۔ کسی اخبار میں مفت کالم نویسی اختیار کرنا اور اس کے ذریعہ مقتدر حلقوں اور با اختیار شخصیتوں کی کاسہ لیسی اور مدح سرائی کر کے سرکاری تمغے، انعامات اور عہدے حاصل کرنا۔ اور بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی کے مصداق ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی حاصل کر لینا۔ دبئی وغیرہ میں اپنا جشن منوانا۔ اس میں اپنے خرچے پر زیرِ احسان مبصروں، کالم نویسوں اور نقادوں کو بذریعہ ہوائی جہاز اپنے ساتھ لے جا کر اپنی مدح سرائی کرانا۔ اور ان مدحیہ مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے کتاب شائع کرانا اور جشن کے حاضرین میں مفت تقسیم کرنا۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں خوشامد کر کے یا دھونس جما کر خود کو مدعو کرانا۔

اگر اس سلسلے میں کوئی صراحت یا وضاحت درکار ہو یا رہبری کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف جمیل الدین عالی سے رجوع کر سکتے ہیں جو اس میدان کے ماہر کھلاڑی ہیں اور خود وسیع عملی تجربہ رکھتے ہیں بلکہ پورے برصغیر میں، بہ استثناء ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر وزیر آغا، ان کا اس فن میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ منیر نیازی بھی اس مجرب نسخے کی

صداقت تھی گویہ لوگ اردو افسانے کے بہترین آدمی تھے۔

ریحان صدیقی :۔ یہ لوگ آج بھی اردو کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔

انور سجاد :۔ مگر پھر بھی مجھے کچھ خلجان سا تھا۔ میں نے کافی غور و خوض کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ If you want to change the society تو فکشن کو بہ ذات خود Change ہونا پڑے گا کیوں کہ اگر آپ نے فکشن کو Change نہیں کیا تو پھر آپ سوسائٹی کو کیسے Change کریں گے۔ یعنی As a writer and as a thinker.

ریحان صدیقی :۔ بڑی منطقی بات ہے۔

انور سجاد :۔ لہٰذا Conventional Form میں Social realism کے تحت جو کہانیاں لکھی جا رہی تھیں جن کا ایک آغاز تھا ایک وسط اور انجام تھا۔ جس میں کردار نگاری ہوتی تھی مکالمہ ہوتا تھا۔ پلاٹ پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ Life is not spent like that دراصل ایک طرح سے یہ Reorganisation ہے۔ دوبارہ زندگی کو ترتیب دے کر یہ کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ کیوں کہ زندگی کی کہانی اس طرح سے بیان ہوتی نہیں ہے۔ جیسے یہ بیان کی گئیں ہیں۔ Life itself is very chaotic. چار پانچ فلمیں آپ کے ذہن میں چل رہی ہوتی ہیں۔ بات آپ مجھ سے کر رہے ہوتے ہیں۔ فلم آپ کے ذہن میں کوئی اور چل رہی ہے۔ سو یہ کلی صداقت نہیں ہے۔ کہانی کس حقیقت پر Base کرتی ہے؟ مکمل سچ کیا ہے؟ اصل صداقت کیا ہے؟

ریحان صدیقی ان سوالوں کا جواب دینا آسان نہیں۔ لہٰذا یہاں تجریدیت در آتی ہے۔

انور سجاد :۔ آپ دیکھیں Abstraction کا جو تصور یورپ نے دیا پکاسو کے حوالے سے آیا اس سے پہلے تو Abstraction ادب میں کہاں تھا۔ سریلزم تھا۔ دادازم تھا۔ مختلف ادبی تحریکیں تھیں۔ میں نے یہ سوچا کہ اصل Abstraction تو یہ تھا جس کو آپ Social realism کہہ رہے ہیں میرے نزدیک اس کہانی کو Realistic کہانی کہنا ایک Fallacy تھی۔ کیوں کہ آپ نے اسے Reorganise, کیا ہوا تھا۔ آپ نے ایک فیتا بنایا اور اس میں کہانی کو فٹ کر دیا۔ لہٰذا میرے نزدیک In order to change the society, I had to bring in basic fundamental change in the form of story.

ریحان صدیقی :۔ Story itself

انور سجاد :۔ جی ریحان بھائی ۔ کیوں کہ زندگی Linear time میں نہیں چلتی جب کہ Social realism کی تمام چیزیں جو ہیں وہ Linear time میں چلتی ہیں۔ سب سے پہلے میں نے Time کو Destroy کرنے کی کوشش کی۔ جب میں نے Time کے اوپر غور کیا تو کہانی کی گرامر ہی بدل گئی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔

ریحان صدیقی :۔ اس سے آپ کے تخلیقی تناظر کا Span بڑا اور وسیع ہو گیا۔

انور سجاد :۔ بہت بڑا Span ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور بات یہ ہے کہ You could do anything there آپ کو یاد ہو گا کہ اب تک میری کہانیوں کی جو کتاب چھپی ہے اس میں جو آخری کتاب وہ دراصل میری پہلی ابتدائی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ 1952 سے لے کر 1960 تک لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

ریحان صدیقی :۔ یہ اب چھپا ہے۔ کیوں ؟

انور سجاد :۔ جی ہاں۔ Because I was in no hurry اس لئے بھی کہ I was not sure of myself کیوں کہ کرشن، بیدی اور منٹو تینوں میرے مقابلے میں پہلے ہی Thousands times better لکھ رہے تھے۔ They were all perfect Masters اضافہ اس میں میں کیا کر سکتا تھا۔ میں تو ان کے تتبع میں لکھ رہا تھا۔ ایک پلاٹ بنایا۔ ایک کہانی گھڑ لی۔ ایک کردار لے لیا۔ کردار نگاری کر دی۔ آغاز دیا وسط دیا اور انجام دکھا دیا۔ لو ہو گئی کہانی! مگر مجھے یہ جکڑبندی اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ تو سارا عذاب یہاں سے شروع ہوا اب میں نے اپنے تئیں Linear time کو ختم کرنے کی کوشش کی جو سب سے زیادہ واضح میرے ناول میں ہے۔

ریحان صدیقی :۔ خوشیوں کا باغ ؟

انور سجاد :۔ جی ہاں۔ خوشیوں کا باغ۔ اچھا اب میں نے یہ کیا کہ جو لوگ Social Realism کی کہانی لکھ رہے تھے اسے میں نے Abstract کر دیا۔ حالانکہ وہ Realism کی کہانی تھی جب کہ لوگ کہتے تھے۔ میں نے اسے Abstract اس طرح سمجھا کہ It is an abstract of life ہم نے اسے مقطر کر دیا سارا کچھ نچوڑ لیا۔ نچوڑ ہی تو Abstraction ہے۔ اور کیا ہے۔

میں کہاں تک کامیاب ہوا یہ تو خیر وقت ہی بتائے گا۔ مگر سوال کامیابی یا ناکامی کا نہیں ہے بلکہ تجرید کی تفہیم کا ہے۔ Abstract is not something vague ہمارے یہاں بد قسمتی سے Abstraction سے Vagueness الجھاؤ پیچیدگی مبہم اور Non concrete کا مفہوم لیتے ہیں۔ خدا کیا ہے۔ کیا Abstract Being ہے؟ یار کہاں۔ اور کیسے آپ اپنی عمر کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی خدا کے تصور میں گزارتے ہیں۔ یہاں خدا کا تصور Concrete ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر آپ زندگی نہیں گزار سکتے۔

ریحان صدیقی :۔ Frame work of life is as such

انور سجاد :۔ جی ہاں۔ چنانچہ میں یہی کہتا ہوں کہ کہانی تو وہ لوگ Abstract لکھ رہے تھے۔ میں تو Abstract لکھتا ہی نہیں۔

ریحان صدیقی :۔ بہت دلچسپ موقف ہے آپ کا، گو قدرے متنازع بھی۔

انور سجاد :۔ میں تو ایک وقوعے کے پیچھے چلتا ہوں۔ خوردبین سے دیکھتا ہوں۔

ریحان صدیقی :۔ یہ آپ کی تخلیقات کا باطنی نظام ہے؟

انور سجاد :۔ وہ میرا باطنی نظام ہے۔ I have microscopic view of my life کیوں کہ I am essentially a pathologist of the society. I have to see the germs. جو جرثومے مجھے نظر آتے ہیں وہ آپ کو دوربین سے نظر نہیں آئیں گے۔ You will have to have microscopic view of life. لہٰذا کہانی کی میرے نزدیک اہمیت رہی نہیں۔ واقعات اور وقوعوں کی ہوگی۔ As they happen اس میں Linear time کی گنجائش نہیں تھی۔

So I reorganised the time صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ مشاہدہ مجھے لوور تک لے گیا۔ میڈرڈ اور پیرس کی آرٹ گیلریاں بھی دیکھیں۔ Vatican بھی گیا۔ روم گیا۔ یورپ کے جتنے بڑے بڑے آرٹ سنٹرز تھے سب میں نے کھنگال ڈالے۔ مصوروں کو دیکھنے کے لئے۔ خوش قسمتی میری کہ جہاں جاتا تھا کچھ نہ کچھ سیکھتا تھا۔ بیلے دیکھا۔ ڈرامے دیکھے۔ رقص دیکھے۔ بہت سے آرٹس فیسٹیول دیکھے۔ ان سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو Synthesise کرنے کی کوشش کی کیوں کہ بنیادی طور پر فن تو ایک ہی ہے۔ باقی تو سارے

مختلف Forms of expression ہیں۔ مثال کے طور پر جب میں بہت پینٹ کرتا تھا۔ تو مجھے میری Immediacy چاہیے ہوتی تھی۔
To get rid off my tensions and emotions جو میں Feel کرتا تھا۔

ریحان صدیقی :۔ کتھارسس نہیں؟

انور سجاد :۔ نہیں کتھارسس نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کتھارسس میں تو بعد میں کوئی بات ہی نہیں رہتی Like a greek tragedy لیکن میں Tensions اور Emotions سے فوری طور پر چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ پھر احمد ہمیش۔ میں نے کہانی کو کہانی کہنا ہی چھوڑ دیا۔ کیوں کہ لوگوں کے ذہن میں کہانی کا وہ تصور ہے جو Social Realism کا ہے۔ جو موپساں 'چیخوف' بیدی اور منٹو نے دیا ہے۔ تو یار اس کو کہانی مت کہو۔ اسے Fiction کہہ لو۔ فلاں صاحب بہت بڑے افسانہ نگار ہیں ٹھیک ہے۔ ہم مانے لیتے ہیں۔ مگر ہم فکشن نگار ہیں۔ ہمارا افسانے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ And it is not a retreat. It is a redefinition of what I am trying to do, or what I tried to do.

احمد ہمیش :۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے اس نقطۂ نظر اور فکشن کی تفہیم سے نقادوں نے گریز کیا بلکہ پہلو بچایا۔ کیوں ریحان صدیقی صاحب۔

ریحان صدیقی :۔ ایسے منفرد فکشن کی تفہیم ذرا مشکل محنت اور وقت طلب کام ہے۔ لہٰذا ہر نقاد سے یہ توقع کرنا بھی عبث ہے بہر حال چند ذی علم اور ذی شعور معتبر نقادوں بشمول شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مشکل کام بھی کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ ایسا جدید فکشن جو اعلیٰ فنی خوبیوں کے علاوہ سماجی خصوصیت سے مملو ہونے کا بھی دعویدار ہو مگر جس کی ہیت پر پیچ' اظہار میں تجریدیت 'ترسیل اور ابلاغ میں اشکال اور نتیجتاً مفہوم میں ابہام اور ژولیدگی ہو اور خواہ بعض بقراط نقاد اپنی علمی بازیگری کے طفیل اسے کثیر المعنویت ہی سے کیوں نہ تعبیر کردیں' اس کی Social relevance کیا ہو سکتی ہے اور اس کی نتیجہ خیزی کیا محل نظر اور پر اثری مشتبہ نہ ہوگی؟

انور سجاد :۔ ریحان بھائی۔ میں سماجی وابستگی، جدید فکشن اور Social relevance ہی کو Connect کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے زندگی کو جس طرح Apprehend کیا ہے۔ چونکہ میں انسان ہوں۔ انسان ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی ایک تاریخ ہے۔

اس کی ایک تہذیب ہے۔ اس کی ایک Concurrent living ثقافت ہے انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے انسان ہونے کا ادراک کرے اور اس کو اثبات کرے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ Total antithesis of being animal جس سوشل سسٹم میں Animalism درندگی اور جبر کا راج ہو اور انسان کا وجود ہی خطرہ میں ہو۔ اب آپ کس کا ساتھ دیں گے۔ اگر آپ Awareness رکھتے ہیں۔ شعور میں اب بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ شعور بڑی بات ہے۔ ادراک ہو جائے، شعور ہو جائے اور آگہی ہو جائے اور پھر بھی انسان کچھ نہ کرے ظلم، جبر اور Animalism کو Confront نہ کرے تو پھر End of history ہو جائے گی۔ لہٰذا فنکار جو انسان بھی ہے وہ ان کو ضرور Confront کرے گا۔ میں نے اپنے فکشن میں یہی کیا ہے۔ میرے خیال میں

There is no end of History so long man exists and confrontation with animalism continues.

تو ریحان بھائی اس آگہی، احساس، ادراک اور اس Awareness سے میری شعوری تخلیق ہوئی۔ وہ کبھی Antiman نہیں ہو سکتی۔ ہر وہ حرکت ہر وہ فلسفہ، ہر وہ اندرونی کیفیت، ہر وہ Milieu، اندرونی ہو، خارجی ہو، بیرونی ہو، دنیا میں کہیں بھی کوئی انسان دوسرے انسان کو زک پہنچائے، ظلم کرے، بربریت کرے، ناانصافی کرے میں اس کے خلاف ہوں۔ ذات پات، رنگ، نسل، مذہب کی کسی تفریق کے بغیر۔ میں ظلم اور جبر کے خلاف لڑتا ہوں۔ میرا ہتھیار میرا فن ہے۔ میں Explore ضرور کرتا ہوں۔ خواہ کامیابی نہ ہو۔ I do not mind failures.

احمد ہمیش :۔ یہ تو بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ہم سب فنکاروں کو یہ ذمہ داری اٹھانی چاہیے۔

ریحان صدیقی :۔ آپ کی شخصیت کے جو دوسرے Dimensions ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔

انور سجاد :۔ وہ میری اسی جنگ کے دوسرے ہتھیار ہیں ایک زمانے میں جب میں بہت زیادہ Emotionally charged ہوتا تھا تو گرمی ہو یا سردی ہو، میں انڈرویئر Underwear میں کھڑا دن رات تصویر بنایا کرتا تھا۔ یہی حال میرے رقص کا تھا۔ رقص میں کیوں سیکھا؟ مجھے رقص سے، موسیقی سے عشق ہے۔ میں نے اپنے ڈراموں سے

بھی ایسا ہی کام لیا۔ ارشمید س کہتا ہے۔ It is a dance of Universe ساری کائنات کا ذرہ ذرہ رقص میں ہے۔ تو انسان کی کیا جرات ہے کہ وہ رقص نہ کرے۔ انسان ہر وقت رقصاں ہوتا ہے۔ انسان کو مستی کی کیفیت درکار ہوتی ہے۔ بچے کی پر سکون نیند آپ کو مستی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ میری بیٹی پریا جب سو رہی ہوتی ہے اور مسکرا رہی ہوتی ہے تو مجھے مستی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اوہو۔ اوہو۔ میں وہ سرخوشی کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بد بختی یہ ہے کہ اس نے بچپن کا تحیر اور معصومیت کھو دی ہے۔ وہ اپنی ذہانت کی بھول بھلیوں میں مکمل طور پر اپنے آپ کو کھو کر منافق بن چکا ہے۔ جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ ان سب چیزوں کا Sum total ہے۔ احمد ہمیش نے یہی کیا۔ سریندر پرکاش اور بلراج مین را ئے نے یہی کیا۔

ریحان صدیقی :۔ آپ چار رحجان ساز افسانہ نگاروں نے وہی کیا جو اس وقت کرنا تھا۔ اس وقت یورپ بھی بدل رہا تھا۔ لیکن کیا آپ لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے؟ آپ لوگوں نے جو Medium اختیار کیا، جو Idiom برتا اور جو تجریدی طرز اپنایا اس کے نتیجے میں ترسیل اور ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوا جس کے باعث کیا یہ کوششیں ثمر آور ہو سکیں؟

انور سجاد :۔ اس کے لئے فنی لوازم کے علاوہ ذاتی کمٹمنٹ اور عملی شمولیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ سارتر چلچلاتی دھوپ میں پمفلٹ بانٹتا پھرتا تھا۔ وہ طلبا کے ساتھ خود احتجاج میں شامل ہو جاتا تھا۔ یہاں کتنوں نے یہ کام کیا؟

ریحان صدیقی :۔ یہاں قابل ذکر جو چند نقاد ہیں انہوں نے کچھ مفروضے گھڑ رکھے ہیں۔ آپ Terms of reference کہہ لیں۔ انہیں کی روشنی میں وہ تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور گمراہ کن نتائج اخذ کرتے ہیں افسانے کی تنقید بھی اسی انتشار فکری کا شکار رہی ہے۔

انور سجاد :۔ ریحان بھائی۔ اگر Terms of reference درست ہو اور اسی Framework میں تنقید لکھی جائے تب بات بنے گی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ارسطو نے جس وقت ڈرامے کے سلسلے میں اکائیاں بنائیں تو ڈرامہ پہلے سے موجود تھا۔ ارسطو نے اس میں ڈرامے کی ساری بوطیقا کو دریافت کیا تھا۔ موجود ڈراموں سے ہی اپنا Terms of reference بنایا تھا اپنے کسی خود ساختہ Terms of reference کی میزان پر ان ڈراموں کو نہیں پرکھا تھا۔ ڈرامہ نویسوں کو اس Frame میں فٹ نہیں کیا تھا۔ ایک زمانے میں ہمارے یہاں مارکسی نقاد ایک

فیتہ رکھتے تھے۔ جو فٹ آیا اسے وہ بڑا افسانہ نگار یا بڑا شاعر بلا تکلف قرار دے دیتے تھے۔ اب ہمارے ہاں ایک آدھ ہی سنجیدہ اور معتبر نقاد ہوگا۔ باقی تو سارے وہ بھی جو قابل ذکر ہیں محض Public relationist بن کر رہ گئے ہیں۔

ریحان صدیقی :۔ ساختیاتی قرأت کے اصولوں کے بموجب ایک آدھ کا مطلب تین چار بھی کھینچ تان کر برآمد کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال۔ میری سماجی وابستگی والی بات تو رہی جا رہی ہے۔ متجر العلم اور معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے آپ کی فن افسانہ نگاری کو سراہتے ہوئے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ انور سجاد کا فن دراصل یہ ہے کہ سماجی معنویت تو ہے لیکن وہ سماجی تاریخ نہیں ہے۔ اگر سماجی تاریخ کو محض سماجی تاریخ کے طور پر بیان کر دیا جائے تو وہ فکشن نہیں بنتا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں صرف بیان کر دیا جاتا تھا۔ لہٰذا وہ فکشن نہیں بن پایا۔ تو آپ کا Contribution یہ ہے کہ آپ نے سماجی معاملات، ان کے تضادات اور المیوں کو فکشن بنادیا۔ اسی لئے باقر مہدی نے آپ کو اردو کا پہلا ریڈیکل افسانہ نگار قرار دیا۔ باقر مہدی فن افسانہ نگاری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ احمد ہمیش کی افسانہ نگاری کے بھی بہت قائل ہیں۔

انور سجاد :۔ ریحان بھائی شکریہ آپ کا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں اور باقر مہدی صاحب کا بھی اور ان سب کا جنھوں نے میرے کام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ احمد ہمیش کا بھی شکریہ۔

ریحان صدیقی :۔ ساتھ ہی ساتھ گوپی چند نارنگ اور وارث علوی دونوں آپ کی اہمیت تو تسلیم کرتے ہیں مگر آپ کے افسانوں سے سرسری گزرتے ہیں۔ انتظار حسین جو اب تک اپنے بچپن کے ماضی میں پناہ گزین ہیں، فرماتے ہیں کہ انور سجاد اور ان کا معاملہ خرگوش اور کچھوے والا ہے۔ انور سجاد بہت تیز دوڑنا چاہتے ہیں اور ان کا حشر بھی وہی ہوا ہے جو تیز دوڑنے والوں کا ہوتا ہے وہ آپ کی کار کا حادثہ جو ہوا تھا جس میں آپ کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تھی تو ان کا کہنا ہے کہ آپ کی افسانہ نگاری مثل اس کار کی ہے جو بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی یا پھر اس ریس کی ہے جس میں کچھوا جیت گیا تھا بلکہ اس نے خرگوش کے کان بھی کاٹ لیے تھے۔ (قہقہہ)

احمد ہمیش :۔ یہ انتظار حسین کا بڑا معاندانہ رخ ہے!

انور سجاد :۔ یہ معاندانہ رخ نہیں ہے احمد ہمیش۔ چیزوں کو سراہنے کے لئے دو طریقے ہوتے ہیں۔ مانے ہوئے اور روٹھے ہوئے محبوب میں جو فرق ہے وہ یہی ہے۔ انتظار حسین اور میرا۔ (قہقہہ)

دراصل بات ہے رفتار کی جس نے انتظار حسین کو باطنی اور معنوی سطح پر پریشان کر رکھا ہے۔ جس شخص کا ذہن یکے سے متاثر ہو اور وہ ایک Pathological انداز میں یکے کو یاد کرے مگر سفر کرے ہوائی جہاز سے کہ اسے وقت پر پہنچنا ہے تو پھر ایسا شخص ذہنی اور عملی طور پر تضادات کا یقیناً شکار ہوگا۔ وہ Dichotomous اور Divided تو ہوگا ہی۔ تو یہ ہیں 'انتظار حسین! جو کچھوے کی طرح سفر کرتے ہیں۔ تو کچھوے اور خرگوش والی بات اس معنی میں صحیح ہے۔

ریحان صدیقی :۔ لیکن آپ اور انتظار حسین میں بعد قطبین ہے۔ ان کا سارا سفر جو ہے وہ Back to dark tunnel of history میں ہے جو حد محدود ہے۔ ان کا قیام بھی ماضی میں ہے۔ حال کیسا ہے؟ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ مستقبل کیسا ہونا چاہئے۔ اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی ساری تخلیقات اور تنقیدات کا بس ایک ہی محور اور مسئلہ ہے کہ 'ماضی بہت اچھا تھا'۔ جب کہ آپ ماضی سے Inspire تو ہوتے ہیں مگر مقیم حال میں رہتے ہیں اور سفر Future میں کرتے ہیں۔ آپ کا مجموعی رجحان Futuristic ہے۔ لہٰذا آپ کے فنی ابعاد وسیع اور مختلف النوع ہیں۔

انور سجاد :۔ میں رفتار کا آدمی ہوں اور زمانے کی رفتار سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو آپ کو Futuristic attitude لگتا ہے۔ اگر Speed میں حادثہ ہوتے ہیں اور آدمی Survive کر جاتا ہے تو یہ بڑی معنی خیز بات ہے۔ انتظار حسین کے کچھوے کا سفر درحقیقت سفر ہے ہی نہیں وہ ٹھہرے ہوئے آدمی ہیں۔

ریحان صدیقی :۔ وہ ایک ہی مقام پر بیٹھے ہوئے منجمد ہو چکے ہیں۔

انور سجاد :۔ اور بیٹھے ہوئے ایک Pathological بیماری کی حالت میں انہوں نے Nostalgia اختیار کیا۔ ان کی سوچ اور عمل میں بعد قطبین ہے۔ ان کو اچھے لگتے ہیں کچے گھر۔

ریحان صدیقی :۔ اور نیم کا درخت' تنگ گلیاں، دھول اٹے راستے، کھپریل کے مکان، مٹی کے برتن، تھالیاں، پانی کے گھڑے، دیئے، کچی دیواریں اور مٹی کے فرش، چارپائیاں، موڑھے اور لکڑی کے تخت، چوکیاں، رکابیاں اور مٹی کی ہانڈیاں اور بیل گاڑیاں اور ان پر مستزاد فرسودہ حکایتیں اور متروک محاوراتی زبان میں اظہار و بیان۔

انور سجاد :۔ مگر انتظار حسین رہتے نہیں ہیں کچے مکان میں۔ سواری بیل گاڑی پر نہیں کرتے۔ سوتے نہیں ہیں نیم تلے۔ انہیں ایسا کرنے سے کوئی منع نہیں کرتا۔ اظہار وبیان کے لئے وہ داستانی انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی شخصیت کی Dichotomy.

ریحان صدیقی :۔ اور انکے فن کا Dilemma۔

احمد ہمیش :۔ کیا یہ ان کی Intellectual Dishonesty نہیں؟

ریحان صدیقی :۔ منافقت آرٹ کی دشمن ہوتی ہے۔ ان کا داستانی انداز دراصل ایک Cover up ہے۔ ایک طرح کا Face lift ہے۔ وہ اساطیر اور داستانوں کو بطور Patch work شعوری طور پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں کھپا دیتے ہیں تاکہ انہیں جدیدیت سے ہم آہنگ سمجھا جائے۔ بہت سے لوگ بشمول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی وغیرہ اس التباس کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ رسالہ بادبان میں ممتاز نقاد حمید نسیم نے لکھا ہے کہ "انتظار حسین کے افسانوں میں کہانی کم ہی نظر آتی ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے بعد یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہانی کیا تھی؟ ان کے مفاہیم تنک مایہ ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر دل بجھ سا جاتا ہے۔ ان کے افسانے اعلیٰ پائے کی تخلیقات نہیں اور ان کا ناول "آگے سمندر ہے" ایک کمزور ناول اور ہر سطح پر مایوس کن ہے۔" دراصل ان کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو داستانوی رنگ تو دے دیتے ہیں مگر وہ انہیں ماضی کے مطلعے سے نکال نہیں پاتے۔ عموماً وہ اپنے کرداروں کو یاجوج ماجوج کی طرح سوئی دیواریں چاٹ کر اپنا راستہ بنانے کے کام پر لگا کر درمیان ہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ انہیں کوئی غیر معمولی معنویت نہیں دے پاتے۔

انور سجاد :۔ جو خود نکلے گا وہی تو دوسرے کو نکال پائے گا۔ انتظار حسین نقیب ہیں گزرے ہوئے زمانوں کی احیا کے۔ مہاجرت کے مگر وہ ہجرت کی اصل روح تک نہیں پہنچ پاتے۔ دنیا کی دو سب سے بڑی ہجرتوں کے حوالے سے دیکھیں تو ان کی ہجرت وہ ہجرت ہے ہی نہیں۔ ایک تو حضرت موسیٰ کا عظیم Exodus ہے۔ دوسری ہجرت رسول کریم ﷺ والی عظیم ترین ہجرت ہے جس کے پیچھے ایک بہت بڑا فلسفہ تھا۔ اور یہ بہت بڑا ثقافتی تجربہ تھا۔

انجلا ہمیش :۔ گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ انتظار حسین اس تجربے، اس کرب سے نہیں گزرے۔

انور سجاد :۔ نہیں بیٹے۔ کرب تو بہت ہے انتظار حسین کے ہاں۔ ان کا تجربہ واردات قلبی تو ہو سکتا ہے

لیکن یہ روحانی تجربہ نہیں بن سکا کیوں کہ اس کی ہجرت اتنی بڑی تاریخی نہیں ہے جتنی بڑی متذکرہ دو ہجرتیں ہیں۔ اس لئے ان کے تجربے کا Span بہت چھوٹا ہے۔

ریحان صدیقی :۔ شاید اسی لئے ان کے ہاں تکرار اور دہرانے کا عمل پایا جاتا ہے۔

احمد ہمیش :۔ اور ان کی فنی جہات بھی محدود اور Surface تک رہ جاتی ہیں۔

ریحان صدیقی :۔ اچھا یہ بتایئے کہ اب تک اردو ادب میں کوئی (Nobel Prize) کیوں نہیں ملا؟ کیا اردو ادب میں کوئی Genius پیدا نہیں ہوا؟

انور سجاد :۔ ان کی نظر میں یہاں کوئی بڑا ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا گیا۔ ورنہ یہاں اقبال کو یہ پرائز ملنا چاہیئے تھا۔

ریحان صدیقی :۔ اپنی مجموعی ادبی تخلیقات کے پیش نظر قرۃ العین حیدر (Nobel Prize) نوبل پرائز Fully deserve کرتی ہیں۔

انور سجاد :۔ مگر نوبل پرائز ملتا ہے ولیم گولڈنگ کو جو ایک تھرڈ کلاس برٹش رائٹر ہے۔

ریحان صدیقی :۔ اور مصر میں نجیب محفوظ کو۔ اس کے کئی ناول میں نے پڑھے ہیں۔ وہ ایک اوسط درجے کا رائٹر ہے۔ کوئی شاہکار ناول اس نے تخلیق نہیں کیا۔

انور سجاد :۔ اصل میں بات یہ ہے کہ نوبل پرائز کے پیچھے سیاسی Strings اپنا کام کرتی ہیں۔ اس لئے بیشتر Deserving لوگوں کو یہ انعام نہیں ملتا۔

ریحان صدیقی :۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ دنیا کے اہم ترین اور ممتاز ترین ادیبوں کو نوبل پرائز نہیں ملا۔ مثلاً ٹالسٹائی، چیخوف، ڈی۔ایچ لارنس، جیمس جوائس، مارسل پروست، گراہم گرین، ایزرا پاؤنڈ، فرانز کافکا، پال والیری اور ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن وغیرہ۔

انور سجاد :۔ حقیقت تو یہی ہے۔

ریحان صدیقی :۔ اچھا۔ ایک طرف ادیبوں کو یہ شکوہ رہتا ہے کہ نقاد ان پر توجہ نہیں دیتے تو دوسری طرف تخلیق اور اس پر تنقید کا کام اب ساتھ ساتھ Simultaneous ہونے لگا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک اخباری کالم میں آپ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ آپ بھی اپنا نقاد ڈھونڈ لیں تاکہ تخلیق اور تنقید ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

انور سجاد :۔ مجھے انتظار کے ساتھ بہت ہمدردی ہے کہ اسے کوئی معقول نقاد اب تک نہیں مل سکا۔ دراصل یہ مشورہ اس نے شاہین مفتی کے حوالے سے دیا تھا جو انیس ناگی کی ایک Admirer ہیں۔

ریحان صدیقی :۔ انیس ناگی کا ناول 'کیمپ' اور اس پر شاہین مفتی کی تنقیدی کتاب تقریباً ساتھ ساتھ شائع ہوئیں اور دونوں کتابوں کی تقریب اجرا بھی ایک ساتھ منعقد ہوئی۔ یہ Efficiency اور پھرتی لائق تحسین ہے!

احمد ہمیش :۔ لاہور کی Manipulative ادبی سماجیات کیا کیا گل کھلاتی ہے۔

انور سجاد :۔ اصل میں بات یہ ہے کہ شاہین مفتی کو انیس ناگی کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے جو کتاب لکھی Anti Hero پر اس میں انہوں نے انیس ناگی پر یہ بڑی زیادتی کی کہ انہیں Stretch کر کے کرنگار کے Passivism اور Alienation والے تصور پر ان کے ناول کو فٹ کر دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب آپ کسی ادیب کو Stretch کرتے ہیں تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ میں نے انیس ناگی سے کہا بھی تھا کہ یہ تمہارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اس کتاب سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

احمد ہمیش :۔ انتظار حسین کو اصل تکلیف کیا تھی؟

انور سجاد :۔ وہ مجھے اور انیس کو لڑانا چاہتا تھا کہ انیس کو نقاد مل گیا۔ تجھے نہیں ملا۔ (قہقہہ)

احمد ہمیش :۔ تو کیا آپ لڑے؟

انور سجاد :۔ اتنا چغد میں نہیں ہوں۔ یہ میرا Concern نہیں ہے۔ (قہقہہ)

ریحان صدیقی :۔ آپ نے انتظار حسین سے انٹرویو بھی تو کیا تھا؟

انور سجاد :۔ ہاں جب اس کی کتاب 'شہر افسوس' آئی تھی۔ اس میں میں نے ایک سوال یہ بھی پوچھا تھا کہ ادیب اپنے پیش رووں سے بھی کچھ سیکھتے ہیں آپ سے بھی کسی نے کچھ سیکھا یا نہیں سیکھا؟ وہ کہنے لگے ہاں میاں تم نے جو سیکھا ہے۔ میں نے کہا ہاں انتظار حسین میں نے تم سے سیکھا ہے۔ میں نے یہ سیکھا ہے کہ کہانی کیسے نہیں لکھنی ہے۔ یہ بھی سیکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ ریحان بھائی انتظار حسین میرا Concern نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ آج کے انسان کی کہانی لکھ ہی نہیں رہا۔ ہم عصر نقطہ نظر اور فکر اس کی کہانیوں میں ہے ہی نہیں۔ اس کا Vision جو ہے وہ بالکل Stale ہے۔ نیا Angle اسکے ہاں کوئی نکتا ہی نہیں contemporary point of

view تو اس کے ہاں ہے ہی نہیں۔

ریحان صدیقی :۔ وہ بار بار آدم اور حوا کی کہانی لکھے جا رہے ہیں۔ بغیر کوئی نیا رنگ، Shade یا Dimension دیئے ہوئے۔

انور سجاد :۔ یہی بات جب انتظار سوچتا ہے تو اس کے اعصاب پر میں سوار ہو جاتا ہوں اور وہ میرے خلاف لکھنے لگ جاتا ہے۔

ریحان صدیقی :۔ راولپنڈی کے چند شاعروں نے وہاں 'اردو نظم کے پچاس سال' کے موضوع پر منعقدہ ایک شائع شدہ مذاکرے میں یہ بار بار کہا کہ اس عرصہ میں اردو میں اچھی اور بڑی نظمیں اس لئے لکھی نہ جا سکیں کہ اردو ایک Imported زبان ہے اور پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں پر یہ زبردستی تھوپی گئی ہے۔ گویا علاقائی زبانوں میں تو بڑی نظمیں لکھی گئیں! میرا سوال یہ ہے کہ آخر اقبال، راشد، میرا جی، فیض، مجید امجد اور منیر نیازی بھی تو اسی خطے کے باسی تھے اور ہیں۔ انہوں نے کیسے اردو کی بیشتر بڑی اور بہترین نظمیں لکھ ڈالیں۔ ان لوگوں کی مادری زبان بھی تو اردو نہ تھی۔

احمد ہمیش :۔ صرف چند کند ذہن، غبی، نااہل اور تھرڈ ریٹ شعرا اس قسم کے متعصبانہ Issues اٹھا رہے ہیں۔

انور سجاد :۔ جی ہاں۔ اگر وہ لوگ بری بھلی نظمیں اردو زبان میں نہ لکھ رہے ہوتے تو آج بالکل گمنام ہوتے۔ انہیں اردو زبان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

ریحان صدیقی :۔ احباب راولپنڈی میں افسانہ نگاروں کا بھی ایک گروپ ہے۔ جس میں رشید امجد، منشا یاد اور مرزا حامد بیگ وغیرہ شامل ہیں۔ اردو افسانے کے پچاس سال، کے موضوع پر وہاں ایک مذاکرے میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ پچاس سال میں صرف راولپنڈی اسلام آباد کے افسانے نگاروں نے بڑے افسانے لکھے۔

انور سجاد :۔ سبحان اللہ!

ریحان صدیقی :۔ یہ دونوں مذاکرے رسالہ 'عبارت' اسلام آباد میں چھپے تھے۔ انہوں نے لاہور کے انتظار حسین کو ایک سطر میں اور دوسری میں انور سجاد کو Dismiss کر دیا۔ اعتراض یہ صادر ہوا کہ انتظار حسین قدیم کہانیاں داستانی زبان میں لکھتے ہیں اور انور سجاد ہم عصر کہانیاں جدید زبان میں لکھتے

ہیں! کراچی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا انہوں نے۔ باقی بچا۔

احمد ہمیش :۔ پنڈی وال گروپ۔

ریحان صدیقی :۔ جی ہاں! اس گروپ کے افسانہ نگار منشایاد نے اپنے ایک انٹرویو میں انور سجاد۔ آپ کی کہانی "گائے" پر حملہ آور ہوتے ہوئے یہ کہا کہ یہ گائے ہندوستان، پاکستان اور بر صغیر کی نہیں ہے۔ یہ امریکن Imported گائے ہے۔ جب کہ اسی کہانی کو جوگندر پال نے اپنی تنقیدی کتاب کے کئی صفحات میں کافی تعریف کی ہے۔ بہت سراہا ہے۔ گائے کی علامتی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے کہ جس کی تفہیم منشایاد کو نہ ہو سکی۔ "گائے" اردو کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جیسی کہ احمد ہمیش کی "مکھی" آپ دونوں کو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے یہ ایک ایک کہانی ہی کافی ہے۔ منشایاد نے خالدہ حسین کو ایک میڈیا کر افسانہ نگار قرار دیا اور احمد ہمیش کے بارے میں کہا کہ انہیں مکھی کی بھنبھناہٹ بہت پسند ہے۔ آخر کس خوش گمانی میں یہ لوگ مبتلا ہیں؟

انور سجاد :۔ یہ بینڈ باجے والے لوگ ہیں۔ یہ پنڈی وال جب تک میں انہیں Encouraging words کہتا تھا وہ خوش رہے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ لوگ میری بہت تعریفیں کیا کرتے تھے خاص طور پر رشید امجد اور منشایاد۔

ریحان صدیقی :۔ رشید امجد نے 1982 میں اپنے ایک مضمون میں آپ کی بہت تعریفیں کی تھیں کہ آپ جدیدیت کے اعلیٰ ترجمان ہیں۔ بہت اچھی تجریدی نثر اور افسانے لکھتے ہیں۔ اچھی علامت نگاری کرتے ہیں اور آپ پائے کے افسانہ نگار ہیں۔ ایسا ہی کچھ لکھا تھا۔ لیکن اب وہ اپنے حالیہ اخباری انٹرویوز۔ "نوائے وقت" اور "احساس" میں اپنے سابق خیالات سے منحرف ہو کر یہ کہتے ہیں کہ جدید اردو افسانے کا المیہ یہ ہے کہ اس کو پہلا افسانہ نگار انور سجاد جیسا آدمی ملا۔ وہ۔۔۔۔

انور سجاد :۔ (قہقہہ)

ریحان صدیقی :۔ وہ (انور سجاد) مغرب سے کچی پکی چیزیں اٹھالایا اور اسے اوٹ پٹانگ زبان میں بیان کر دیا۔ جس سے لوگ جدید افسانے سے متنفر ہو گئے۔ اور یہ پنڈی وال افسانہ نگاروں کا ہی کارنامہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانہ نگاری کو دوبارہ Establish کیا۔

انور سجاد :۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا کیا خوش فہمیاں پال رکھی ہیں! ان کے بارے میں کسی معتبر نقاد نے بھی کیا ایسی کوئی بات کہی ہے؟

ریحان صدیقی :۔ کوشش تو انہوں نے بہت کی تھی مگر کوئی معتبر نقاد ہاتھ نہیں لگا۔ غالباً اسی لئے رشید امجد نے اپنے مذکورہ انٹرویو میں شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر اپنی شدید برہمی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نارنگ صاحب اپنے کسی مفاد کے تحت کسی ایک کو Pick کر لیتے ہیں جیسے یہاں منشایاد کو اور پھر اس کی توصیف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں اور فاروقی صاحب جو ہیں وہ جدید تر نسل کے یعنی ان لوگوں کے افسانے پڑھتے ہی نہیں۔ بہ قول ان کے جب رشید امجد نے فاروقی صاحب سے گزارش کی کہ ہمارے افسانوں پر بھی کچھ تنقید لکھیں تو انہوں نے جواب دیا کہ بھائی میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ میرے ذمے ادب کے اور بھی بہت سے اہم کام ہیں۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ (تعریف و توصیف کے لئے) اپنی ہی نسل کا کوئی نقاد پکڑ لیں۔

انور سجاد۔ احمد ہمیش :۔ (ملے جلے قہقہے)

ریحان صدیقی :۔ پنڈی وال افسانہ نگاروں کا اصل مسئلہ کیا ہے۔

انور سجاد :۔ ریحان بھائی۔ بات وہاں سے شروع ہوتی ہے جب راولپنڈی کے یہ افسانہ نگار میری ہمت افزائی پر قناعت نہ کرتے ہوئے اپنی Literary evaluation مانگنے پر بضد ہو گئے۔ جس کو احمد ہمیش Verdict کہتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کے افسانے بیس برس پڑھے تھے اور اب ایک نتیجہ پر میں پہنچ گیا تھا کہ یہ لوگ کس سطح کے افسانے لکھ رہے ہیں اور اب یہ آگے نہیں جا سکتے۔ جو کچھ انہیں کرنا تھا اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا کر یہ کر چکے ہیں۔ یہ لوگ Exhaust ہو چکے ہیں۔ چنانچہ 'نوائے وقت' والے اپنے انٹرویو میں جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ لوگ جدید افسانے سے کیوں الرجک ہو گئے تو جواب میں میں نے کہا کہ پنڈی گروپ کے افسانہ نگار جدید افسانے کے حشرات الارض ہیں جن کے ادھ کچرے اور کچے پکے افسانے پڑھ کر بیشتر قارئین جدید اردو افسانے ہی سے الرجک اور بیزار ہو گئے۔ یہ میری ان لوگوں کے بارے میں دیانتدارانہ رائے تھی۔ مگر وہ لوگ بھڑک اٹھے۔ سخت ردعمل ہو گا یہ مجھے پتہ تھا۔ کیوں کہ ان کے Shock observer بے حد کمزور بلکہ ناکارہ ہیں۔ اور ان کا دائرہ فکر بہت محدود ہے۔ ان لوگوں کا ادب یا افسانہ چھوٹا ہے۔ شخصی طور پر بھی یہ چھوٹے لوگ ہیں۔ چھوٹے پن سے میری مراد Restricted vision ہے۔ یہ لوگ کنویں کے مینڈک ہیں۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بھی محدود ہے۔ ان کے افسانے تو یہی بتاتے ہیں۔ بہر حال

میرے بیان کے رد عمل میں ان لوگوں نے میرے خلاف Tirade شروع کر دیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ میرے ہی فقرے مجھے لوٹانے لگے۔

احمد ہمیش :۔ یہ عالم ہے ان کی صلاحیتوں کا!

انور سجاد :۔ اصل میں انہیں امید تھی کہ ان کے Tirade کے جواب میں میں اپنا مذکورہ بیان Withdraw کرلوں گا۔ ویسے وہ لوگ خواہ کیسے بھی ہوں۔ میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن جب Literary Evaluation ہوگا تو صرف ادب کی Merit ہی پر ہوگا۔ ادب کے حوالے سے آپ کائنات کو دیکھیں تو سب سے اچھا اور بہتر اور بڑا حشرات الارض تو خود میں ہوں۔ دنیا کے ادب میں کیا کیا بھرا پڑا ہے۔ ایک دستوو سکی مجھ سے سنبھالا نہیں جاتا۔ اس کے سامنے میں کیا ہوں۔ پنڈی گروپ کیا ہے۔ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں وہ لوگ۔ دستوو سکی نے ساری زندگی کو Encompass کر کے تین کتابوں میں مقطر کر دیا آپ کے لئے۔ میرے لئے تو محض اس کی ایک ہی کتاب کافی ہے Notes from underground تو یہ لوگ میر الٹریری Concern نہیں ہیں۔

احمد ہمیش :۔ آپ کا Concern وہ انسانی ذمہ داری ہے جو آپ نے قبول کی ہے جو دنیا اور انسانی زندگی کے بڑے سوالات ہیں۔

انور سجاد :۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ ہر وہ شے جو انسانی Vision یا اس کی آزادی کو Restrict کرتی ہے یا انسان کو جبر کے تحت لاتی ہے میں اس کے خلاف ہوں چاہے وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو۔

انجلا ہمیش :۔ آپ نے پہلے کہا ہے کہ جینوئین نقاد اب نہیں رہے۔

انور سجاد :۔ پہلے چند تھے۔ اب ایک آدھ ہو گئے۔

انجلا ہمیش :۔ ایک فنکار اس لئے لکھتا ہے کہ قاری کے دل میں اترے نہ کہ اس لئے کہ نقاد اس کی تعریف کرے۔

انور سجاد :۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ پہلے جینوئن قاری یونیورسٹیوں میں پیدا ہوتے تھے۔ اب پورے برصغیر میں ان کا برا حال ہے۔ نقاد تو نقاد اب تو جینوئن قاری بھی پیدا نہیں ہو رہے۔ (قہقہہ)

ریحان صدیقی :۔ اور افسانہ نگار؟

انور سجاد:۔ بھئی۔ سلسلہ تو کسی نہ کسی طرح جاری رہتا ہے۔ جہاں کہیں صلاحیت نظر آجاتی ہے میں اس کا دیانت داری سے برملا اظہار کر دیتا ہوں مگر امکانات میرے لئے امکانات ہی ہوتے ہیں۔ میری نظر میں جن لوگوں سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں پاکستان میں ان میں محمد الیاس، آغا گل، اور اسلم سراج الدین سر فہرست ہیں۔

ریحان صدیقی:۔ 'تشکیل' میں آپ کے حشرات الارض والے بیان بلکہ Verdict کا سارے بر صغیر کے ادبی حلقوں میں بڑا چرچا رہا اور ہے۔

انور سجاد:۔ احمد ہمیش نے رشید امجد کو طویل القامت ہونے کے باوجود "تشکیل" میں پروجیکشن دیکر ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ ان کے پیر اب زمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ ابراہیم لنکن سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی ٹانگیں اس قدر لمبی کیوں ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے معلق قد کو زمین سے ملانے کے لئے اتنے ہی لمبے قد کی ضرورت تھی۔ گو رشید امجد کا ادبی قد سطح سمندر سے ذرا نیچے ہے مگر وہ اسے اپنے جسمانی قد سے ناپنے لگا ہے۔ ایک بات تو ہے کہ میرے بیان سے جہاں سارے حشرات الارض بہت پریشان ہوئے اور اپنے شدید معاندانہ رد عمل کا اظہار کیا وہاں دو افسانہ نگار مرزا حامد بیگ اور مظہر الاسلام بہت مہذب اور اعلیٰ ظرف کے مالک نکلے۔ انہوں نے اپنی Animal instinct کو قابو میں رکھا اور کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ مطلب یہ کہ انھیں اپنی افسانہ نگاری پر کچھ کچھ اعتماد ہے اور میں اس جذبے کا احترام کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں پیغمبری کے جھوٹے دعویدار تو پیدا ہوتے ہیں مگر اپنے کذب کے ذریعہ آسانی سے شناخت ہو جاتے ہیں۔ پکاسو کے زمانے میں بہت سے جعلی Piccasoids پیدا ہو گئے تھے۔ انھیں حشرات الارض کی طرح! (قہقہہ) گویا حشرات الارض ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر زمانہ بہت انصاف پسند ہوتا ہے۔ وہ غیر جینوئن لوگوں کو اگل دیتا ہے۔ قے کی طرح!

ریحان صدیقی:۔ انتظار حسین نے اپنے اخباری کالم میں آپ کو ایٹم بم کا حمایتی اور مداح باور کرایا ہے۔ اپنے مضمون میں بھی جو اسی موضوع پر آپ کے مضمون کے ساتھ رسالہ 'آئندہ' میں چھپا تھا؟

انور سجاد:۔ میں ایٹم بم کا سخت مخالف ہوں جیسا کہ ہر ذی شعور کو ہونا چاہئے۔ میں نے تو محض منٹو کے حوالے سے اس کا ذکر کیا تھا۔ اب انتظار حسین کی بد نیتی دیکھئے کہ وہ میرے مضمون کو Twist کر کے مجھے ایٹم بم کا حمایتی باور کرا رہا ہے۔ حالانکہ میرا پورا مضمون ایٹم بم کے خلاف ہے۔ آپ نے بھی پڑھا ہوگا۔ شاید انتظار کا ادراک ہی اتنا ہو کہ باریک طنز اس کی سمجھ سے باہر

ہو۔ وہ سرسری پڑھنے کا عادی ہے اور سرسری لکھنے کا بھی! (قہقہہ)

ریحان صدیقی :۔ احمد ہمیش نے اپنے لئے لکھا ہے کہ شیر سؤروں کے نرغے میں ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

انور سجاد :۔ احمد ہمیش سے میری Love and hate کی Relationship رہی ہے ایک بڑے عرصے تک۔ جو بڑے مزے کی چیز ہوتی ہے۔ اب صرف Love and love کا رشتہ ہے مگر احمد ہمیش مجھے اس وقت بھی اچھے لگتے تھے جب میں ان کے لئے غیر موجود تھا۔ میرا ایقان ہے کہ شیر سؤروں کے نرغے میں نہیں ہو سکتا۔ سؤر بڑی موذی شے ہوتی ہے۔ مگر شیر کو تو Liliputians تنگ کر رہے ہیں۔ شیر کو اسے Enjoy کرنا چاہئے۔

ریحان صدیقی :۔ حال ہی میں اسلام آباد میں اکادمی ادبیات نے ایک سرکاری ادبی میلہ بڑی دھوم دھام سے لگایا۔ جس میں بہ استثناء جینوئن ادیب، سیکڑوں ادیبوں کو مدعو کیا گیا۔ اور بہت سے مستحق اور غیر مستحق ادیبوں کو مختلف انعامات سے نوازا گیا۔ جس میں احمد ندیم قاسمی کو پانچ لاکھ روپے، ان کی متبنیٰ بیٹی اور بقول ڈاکٹر انور سدید قاسمی صاحب کے کاروبار کی منیجر منصورہ احمد کو انکے پہلے ہی مجموعہ کلام پر ایک لاکھ روپے، اور آصف فرخی کو ترجمے پر پچاس ہزار روپے، شامل ہیں۔ اسی ادبی میلے میں مرکزی تقریر کرتے ہوئے مشہور سیاست داں حمیدہ کھوڑو نے ادبی میلے میں شریک ہونے والے ادیبوں کو بکاؤ مال قرار دیا۔ انتظار حسین نے اپنے اخباری کالم میں اس ادبی میلے کی شان میں طویل قصیدہ لکھا ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ان انعامات کے ایک جج خود احمد ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ کے علاوہ انتظار حسین بھی تھے مگر انھوں نے اپنے کالم میں مصلحتاً حمیدہ کھوڑو کی اس تقریر کا کوئی ذکر نہ کیا۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے؟

انور سجاد :۔ میرا ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہے کہ Establishment کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ باوقار اور خوددار رائٹرس اور شہریوں کو اپنے حضور جھکایا جائے۔ اس کام کے لئے انھوں نے مختلف ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ مثلاً پہلے رائٹرس گلڈ اور اب اکادمی ادبیات یہ ادارے حق اور ناحق میں امتیاز نہیں کرتے۔ مستحق اور غیر مستحق میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ جو ان کا راگ درباری گانے پر آمادہ ہو جائے وہی ان کے لئے مقدم، انعام واکرام اور تمغوں کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ یہ ادارے آڑھتی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ مارکیٹ اکانومی دلالوں پر چلتی ہے۔ خواہ وہ سیاست کی منڈی ہو یا ادب کی منڈی یا کوئی اور۔ بکاؤ مال ہمیشہ موجود ہوتا ہے اور برصغیر ہر قسم کے دلالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ادبی دلالوں سے بھی ہر حکومت اپنے اپنے دلال لاکر بٹھا دیتی

ہے۔ ان کی نیت ادب کا فروغ ہوتا ہے نہ ہی انسانی مسائل کو حل کرنا۔ یہ ان کے ایجنڈے میں ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی اس کی اجازت ہوتی ہے۔ البتہ جینوئن ادیب ان سے ہمیشہ نبرد آزما اور برسرپیکار رہتا ہے اور رہنا چاہیے۔

ریحان صدیقی :۔ احمد ہمیش نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پاکستان میں اب تک کوئی انسانی معاشرہ نہیں بن سکا۔ یہ بیشتر آدم خوروں اور حرام خوروں کا معاشرہ ہے۔ Animal instinct پر مبنی اس معاشرہ کو انسانی معاشرے میں تبدیل کرنے کے لئے ادیبوں اور دانشوروں کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

انور سجاد :۔ اس آدم خور اور حرام خور میں ہر قسم کا خور آجاتا ہے۔ پلید خور، ضمیر خور اور مردار خور تک سب۔ لیکن احمد ہمیش تخلیقی سطح پر خود خوری اور خود سوزی کیوں کرتے رہتے ہیں۔ یہ بے حد اذیت ناک مگر زبردست کام ہے جو عصری طور پر نہ سہی بعد میں آنے والوں کی فہم و فراست کے لئے ایک تاریخی کام ہوگا۔ اب احمد ہمیش پر یہ فرض ہے کہ وہ ان حرام خوروں اور حرام زادوں کی ذات کو ان کے قول و فعل ان کی تخلیقات اور عملی زندگی کے سیاق و سباق میں، ان کے کردار کی نظریاتی اور فلسفیانہ چیر پھاڑ کرتے رہیں۔ معاشرے کی تبدیلی کے لئے اجتماعی جدوجہد لازم ہے۔ میں بھی اپنے طور پر یہ جنگ لڑ تا رہا ہوں اور لڑتا رہوں گا۔ بطور ایک جینوئن اور Authentic ادیب، احمد ہمیش کو اور مجھے اور تمام ادیبوں اور دانشوروں کو چاہئے کہ وہ ناانصافی پر مبنی استحصالی نظام، جابر، ظالم اور کرپٹ حاکم طبقوں اور جعلی منافق معاشرے کے درباری Pen coolies اور بونے ادیبوں کی جعل سازیوں، منافقت اور دوغلاپن کو برابر Expose کرتے رہیں اور تخلیقی اور مدبرانہ سطح پر معاشرے کی تبدیلی کی جدوجہد شروع کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک معاشرے میں مثبت تبدیلی نہ آجائے۔ اور یہ تبدیلی آئے گی ضرور۔ یہ میرا ایمان ہے۔ خود سے برسرپیکار رہنا تخلیق کا جوہر ہے اور بد معاشرے سے نبرد آزما رہنا انسان کا۔ لہٰذا جینوئن ادیب جو دونوں خصوصیتوں سے متصف ہوتا ہے، معاشرے کی ماہیت تبدیل کر سکتا ہے۔

ریحان صدیقی :۔ آپکا بے حد شکریہ۔

انور سجاد :۔ آپ لوگوں کا بے حد شکریہ۔

کہانی

احمد ہمیش	مرقعِ ذات
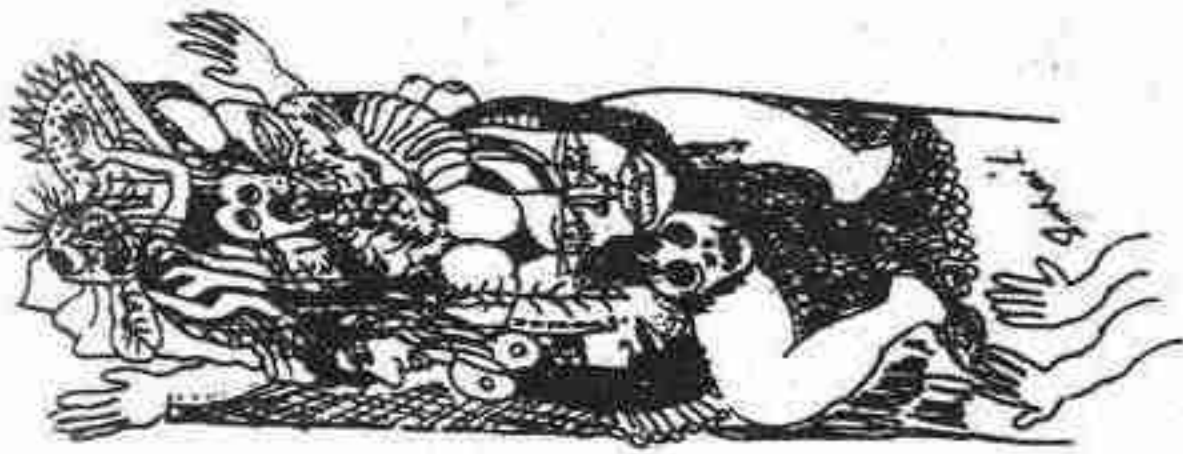
اس بار سہ ماہی تشکیل میں شامل انور سجاد نے اپنے انٹرویو میں ریحان صدیقی کے ایک سوال کا جواب مکمل کرتے ہوئے محمد الیاس، آغا گل، اور اسلم سراج الدین کا ذکر بڑی اہمیت سے کیا ہے۔ البتہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی درباری ادبی سماجیات سے بے نیاز عرفان احمد عرفی نے "آخری صدی کی کہانی" جیسی اہم کہانی خلق کی۔ مگر جہاں کردار کثرتِ معنی اور وحدتِ معنی سے زیادہ موضوع کی عمل داری کا حصہ بنادیا جائے، وہاں کرداری نفسیات سے ہٹ کر موضوع سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس سے کہانی کار کے اسلوبِ ذات کو تحریک ملتی ہے۔ مثلاً حسن جمال کی کہانی "چشم دید مجرم" اس اقتباسِ صداقت پر پوری اترتی ہے۔ مظہر الزماں خاں کی کہانی "چھپا" میں چھپا کردار کا ہمزاد ہے۔ اسی طرح حامد سراج نے "موری کا کیڑا" میں سادہ بیانیہ سے کام لیا ہے مگر موضوع کے اعتبار سے بات گہری ہے۔ یہی وصف ڈاکٹر شہناز شاہین کی کہانی "زندگی کی قیمت" اور لبنیٰ عروج کی کہانی "کہانی کار" میں پایا جاتا ہے۔ البتہ خالد سہیل ملک کی کہانی "راوی کی موت" میں ایک ناگزیر پراسراریت رکھی گئی ہے تاکہ موضوع کی معنویت پر غور کیا جائے۔ وحدتِ موضوع کی ایک بڑی مثال مشرف عالم ذوقی کی کہانی "یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے" قابلِ توجہ ہے۔ انجلا ہمیش کی کہانی "یادگارِ عاد و ثمود" میں کرداری زوال کو اگلے پچھلے زمانوں کے زوال سے تمثیلی پیرائیہ بیان میں مدغم کردیا گیا ہے۔ لگتا ہے جیسے اب کسی شے پر حیران ہونا کارِ عبث ہے تاہم اب اس کا انحصار کہانی کار کے باطن پر ہے کہ اس میں اشیاء کے نظام پر غالب آنے کی کتنی طاقت ہے! کہانی کار میں کوہ پیما جیسی ہمت اور بے خوفی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی پہاڑ کی چڑھائی سے گر کے مرنے کے خوف میں مبتلا ہو تو وہ کوہ پیما یا کہانی کار نہیں ہو سکتا۔ بریڈ فورڈ میں بھی کہانی کا ایک پہاڑ ہے، جس کی مسلسل چڑھائی میں مقصود الٰہی شیخ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزر گیا۔

اسد شہریار کے نام۔

ہوا نے پانی پر لکھا

مقصود الٰہی شیخ کہانی

خوشی کی تلاش ہے'

خوشی کی تلاش ہے'

سیٹی بجی

امید بندھی!

موسم خوشگوار تھا'

اور دن روشن تھا'

چھت کی تھوڑی اکھڑی کھپریل پر بیٹھی چڑیا چہکی' اڑی مکان کے عقب سے سامنے والے باغیچے کو فٹ پاتھ سے جدا کرتی منڈیر پر بیٹھ کر' چور آنکھوں سے اندر جھانکا------

ہوا کا ایک جھونکا ادھر ہی آگیا-

گدگدی ہوتے ہی چڑیا گیت گانے لگی-

گیت میں خوشی اور غم گھلا تھا!

وہ ایک امیگرنٹ چڑیا تھی!!

وہ ڈری سہمی ادھر ادھر تکے جا رہی تھی!!!

ہوا ہر روزنِ دیوار سے اندر چلی گئی- ہوا کے دوش پر دور سے شامل آوازیں بھی اندر پہنچیں تو داخلی سکون ارتعاش کی نذر ہو گیا- خاموشی ٹوٹ گئی- سکوت ذرا دیر کو ہی درہم برہم ہوا ہو گا کہ سرسراہٹ وہاں کی فضا کا حصہ بن گئی- فرش سے چھت تک در و دیوار میں سرگوشیاں ہونے لگیں-

وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے-

چپے چپے سے ہوا کا ملن' ان ساعتوں کے لئے امر ہو گیا!

ہوا نے پوچھا'

گپ' چپ کیوں تھے؟

"اپنی تاریخ میں گم تھے"

"سنو! تمہاری آمد' تمہارے اندر گھلی آوازیں اور وہ صدائیں جن میں روتی خوشی اور ماتمی کھلکھلاہٹیں یادوں کی پھواریں لئے اندر آئیں تو ہمیں وہی موسیقی سنائی دی جو اس گھر کی سجاوٹ تھی۔

ہم کبھی بھلا نہ پائے'

وہ ان کی سہاگ رات تھی۔

پہلا طِلِن بوسوں کے مدھم سر' ہنسی کی شہنائی' قہقہوں کا ستار چھڑ گیا۔ چاہتوں نے سر گم گایا۔ قرب نے رقص کے جھنن جھنن کرتے وائرے بنائے اور وہ تمام سانسیں' نمی اور حرارتیں ہم نے جذب کرلیں ا

یوں'

ہم بھول گئے غم بھی ہوتا ہے۔ رنج بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ خوشی کو' ہنسی کو' مسرتوں کو قرار نہیں------"

ہوا پریشان ہو گئی۔

"تم رو رہے ہو؟"

"یہی ہمارا احتجاج ہے---

جب غم پھٹتا اور پھوٹتا' پھیلتا ہے تو درد کے اشکوں کی برسات ہوتی ہے۔ زمینوں پر' سمندروں پر' سمندروں پر' سمندروں کے پار--- تمہیں کیا خبر'

کبھی چپ ہوتی' کبھی شور کرتی' بے قرار مسافر ہوا!

ہم نے آخری کنوارے لمحے دیکھے تھے۔ بے لباسی کی جلوہ یکھی تھی۔ ہم نے دو چاہنے والوں کا سچا طِلِن دیکھا تھا۔ جاوداں ملاپ کے روپ میں

گندھے عشق سے رمق رمق ایک ان جانا' نادیدہ بھرم ابھرتے دیکھا تھا!

جاؤ سر پٹکتی پھرو آوارہ ہوا!

جب تم ہمارے پاس آئیں' اپنے دکھ بھول کر تمہیں خوش آمدید کہا مگر ہم نے تمہارے اندر بھی طربناکیوں کا نیا نوحہ سنا! درد کو جاگتے اور پیڑ کو زہر میں ڈھلا دیکھا۔ شادمانی کے شادیانے رول کرکے ٹوٹتے دیکھے!!

ہوا جو چار دیواری میں رضاکارانہ مقید ہو گئی تھی وہ دہلیز پر سر پٹکنے لگی۔ وہ رو رو کر گا رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ۔ مجھے بتاؤ"

صدر دروازے کے دونوں پٹ ج اٹھے وہ پہلے جیسے مربوط نہ رہے تھے بکھر گئے- دیواریں ہل گئیں- چھت لرزنے لگی-
ہوا کو اپنی نادانستہ تباہ کاری کا احساس ہوا- اس کا پردہ دریدہ ہوا- اس کے کان کھڑے ہو گئے-

ایک دستک-
ایک ہلکی سی تھپک-

اس نے دروازہ کھولا'
دلہن نے دروازہ کھولا اور اسے اندر بلا لیا-
وہ زخموں سے چور بھوک سے نڈھال تھا-
کوئی مکالمہ نہ ہوا- آنے والا نفرت کے دریاؤں' ڈاکے' فساد' لوٹ' قتل' بدامنی' بے چینی اور بداعتمادی کے طوفانوں سے گزر کر آیا تھا-
وہ کیا کہتا؟ وہ کیا سنتی' پوچھتی؟ سب جانتے تھے- فضا اور ماحول بدلا ہوا تھا- ہر طرف خون برس رہا تھا- تڑتڑ ہو رہی تھی- زمین و آسمان احساس جرم میں مبتلا تھے- وہاں کوئی محفوظ نہ تھا- نہ تھا
دولہا نے پوچھا' کوئی آیا تھا؟"
"------------"
"تم نے کسی کو پناہ دی تھی؟" سوال کے الفاظ بدل دیئے گئے-
"بولو نہ بولو- دیواروں کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی ہوتی ہیں-" حقیقت بیان کی گئی-
"پڑوسن دیکھ رہی تھی--"
"وہ میرا سگا تھا- خالہ کا بیٹا-" اعتراف ہوا کہ اجالوں کی چوری نہیں چھپتی-

"وہی تمہارا منگیتر! کیا نام تھا------؟"
"جی!"
"تم نے اس کا نیا نام سنا؟ اسے مفرور کہا جاتا ہے- وہ دہشت گرد قرار دیا گیا ہے- اس کے سر پر انعام ہے------ تمہیں معلوم ہے نا اسی لئے تمہاری منگنی ٹوٹی------"
"یہ جھوٹ ہے- الزام ہے---!!"
"یہ الزام اب ہم پر لگنے والا ہے!"

اندر حبس تھا- گھٹن بڑھ گئی تھی- ہوا باہر نکلنے کو سر پٹک رہی تھی- درو دیوار غمناک یا نم ناک ہو چکے تھے- یہ باہر سے نئے آنے والے ہوا کے جھونکے کا اثر بھی ہو سکتا ہے- آوازوں میں آوازیں ملتی چلی جا رہی تھیں- شور میں انتہا کا اضافہ ہو گیا پھر آسمان کوئی چال چل گیا- تبدیلی آتے آتے رک گئی-

وہاں چپ کی ایکتا چھا گئی۔

دہلیز۔ دروازہ۔ دیواریں۔ دروسھوں نے سب کچھ مستقلاً قبول کر لیا۔

کیا ہوا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ہوا بھی سوچ بن گئی۔

دولہا دلہن کی بات ہو رہی تھی۔ کہانی تھی کیا؟ انجام کیا ہوا؟

چپ ہوا کے کان کھڑے تھے۔

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ سب خاموش تھے۔ سرسراہٹ تک نہ ہوئی۔ کوئی سرگوشی نہ سنائی دی۔ فضا غم سے بوجھل تھی۔ اندر چھپا راز بھاری پڑ رہا تھا۔

شاں۔ شاں۔

ہوا چیخ اٹھی۔ "بولو تو۔۔۔۔ وہ دو انسان تھے۔ کیا لڑ پڑے؟ ایک دوسرے کو کھا گئے؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ میاں بیوی یہیں رہے۔ مدتوں رہے۔ وہ کھاتے پیتے تھے۔ بولتے چالتے تھے۔ بچے ہوئے۔ بچے اپنے گھروں میں گئے۔"

"پھر۔۔۔۔۔۔ دکھ کس بات کا کرتے ہو؟"

"دکھ تو رہے گا"

وہ نو بیاہتا کھلکھلاتی ہنسی' خوشی کے بوسے' گندھی چاہتوں کے پچکارے' اکیلے میں خاموش باتیں' تنہائی کی سرگوشیاں' بے لباس حیا کی پاسبانیاں' روحوں کا ملن' پل پل تھرکتی خوشیوں میں ملفوف اتراتی شہنائیوں کی گونج' خفتہ و خوابیدہ مسرتوں سے لدے پھندے خوف' تھمی تھمی قرب کی گھڑیاں' وہ روٹھنے منانے کی اداؤں بھری ساعتیں' وہ روشن سویرے' وہ ممتا بھرے رتجگے۔ ننھی ننھی کلکاریاں۔ ہنسنے رونے کی آوازیں۔۔۔۔۔ جانے کہاں گئیں؟"

"سب خاک ہو گئے؟ کیا سب کچھ خاک میں مل گیا؟"

ہوا نے وحشت میں بین کرنا شروع کر دیا۔ مگر در و دیوار چپ تھے۔

ہر سو قنوطیت کا ڈیرا تھا۔

وہ اب بھی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

لپٹے لپٹے ہوا اندر ہی سو گئی۔ باہر بھی سناٹا تھا۔
کوئی چڑیا بھی نہیں گا رہی تھی۔
وہاں کوئی نہیں تھا۔ کسی کو کسی کی تلاش نہ تھی۔ نہ رنج کی نہ خوشی کی!!
عام خبر تھی پانی آلودہ ہے!!!

اب سب نے گنتی کرنی چھوڑ دی ہے۔ جیسے مرنے کا حساب رکھنا فضول ہے۔ جب دکھ کا انت نہیں ہوتا تو خوشی، بناوٹ اور سنگھار کا سہارا لے کر متوازی چلنے لگتی ہے مگر پہلے سا نکھار اور تقدس رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ چڑیوں کے گیت بے کشش ہو جاتے ہیں۔ ہوا کی تازہ و خنک مہک گم ہو جاتی ہے اور کھڑے پانی میں گدلاہٹ آجاتی ہے۔

مقصود الٰہی شیخ :۔ سکونت (بریڈ فورڈ برطانیہ۔)

کوبرا

کہانی

محمد الیاس

حجامت کروانے کے لیے قاری دکان میں داخل ہوا ہی تھا کہ دِیمے کو وہاں موجود پایا۔ اُس نے واپس پلٹ جانا چاہا لیکن دِیمے نے آگے بڑھ کر روک لیا اور ایک ایسی بات کہہ دی کہ اُس کی کھوپڑی گویا بھک سے اُڑ گئی ہو۔ وہ مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی چاروں اُنگلیاں باہم جوڑ کر چلاتے ہوئے پٹاخ پٹاخ کی آوازیں پیدا کر رہا تھا جیسے نائی اُسترے کی دھار ملائم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ بتیسی مستقلاً نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں اور چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

"ہائے او قاری! میں واری، تیرے اَبّے نے تیری اماں.... پُتّو! خیر نہیں۔ بچا لے اپنی اماں کو۔ آج مولوی صاحب نے تیاریاں پکڑ لی ہیں"۔ دِیمے نے اپنی بکواس کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا۔

"مولانا آج اُسترا لے کر گئے ہیں، کالے دستے والا...... ہوں ں ں ں...... شی ی ی ی...... شیش ناگ...... ہائے تجھے کالا ناگ دکھائے"۔ اُس نے ہاتھ کو کوبرے کے پھن کی شکل دے کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت دی۔ گویا بین کی آواز پر جھوم رہا ہو اور ایک بار پھر منہ سے پھنکار کی سی آواز نکالی۔

پہلے تو قاری کو سمجھ نہیں آئی کہ دیماں کیا بکواس کر رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اُسترے سے شیو وغیرہ بنائی جا سکتی ہے یا کسی کو خون چکاں چوٹ لگائی جا سکتی ہے۔ والد بزرگوار سے تو کسی ایسے فعل کے ارتکاب کا کوئی احتمال نہیں۔ وہ کسی دشمن کو گزند پہنچانے والے نہیں تو اپنی زوجہ کے بارے میں اُن کے عزائم خطرناک کیونکر ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہت جلد دِیمے نے وضاحت کر کے اُس کی ساری اُلجھن دُور کر دی تو قاری کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ وہ دِیمے کو مارنے کے لیے بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ دِیما جسامت اور عمر میں قاری سے تین گنا تھا، اور چھٹا ہوا بدمعاش، لیکن ہاتھ اٹھانے کی بجائے بڑی خبیث سی مسکراہٹ

بکھیرتے ہوئے خوشی خوشی خود کو پٹنے کے لیے پیش کر دیا۔ قاری کے دو چار اوچھے سے ہاتھ پڑے تو دیما بولا۔ "ہائے! پھول برس رہے ہیں"۔ قاری نے بوائلر کے آگے پڑا ہوا لکڑی کا گٹکا اُٹھا کر اُس کی طرف اچھال دیا تو وہ جھکائی دے گیا لیکن کونے میں کھڑا پڑوسی چچا عظمت زد میں آگیا۔ قاری گھبرا کر باہر کی طرف دوڑ پڑا۔

سوچ سوچ کر قاری کا دماغ شل ہو گیا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے والد یا والدہ اس طرح کے ہو سکتے ہیں۔ سکول میں بھی اُس کے کان میں کبھی اس طرح کی گندی بات کا کوئی ایک آدھ لفظ پڑ جاتا تو وہ جھٹ دھیان اِدھر اُدھر کر کے لاحول پڑھنے لگتا۔ اُسے معلوم تھا کہ چھوٹی عمر کے باوجود کئی ہم جماعت خاصی لچر اور واہیات باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن اُس کا یہ ایمان تھا کہ انسان کو اگلے جہان اپنے جسم کے اعضا کا بھی حساب دینا ہوگا اور جن کانوں سے وہ اللہ کا کلام اور پاک گفتگو سنتا ہے، ان سے حرام اور پلید الفاظ سننا عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

قاری تنویر الاسلام صحیح معنوں میں ایک شریف النفس لڑکا ہونے کے ناتے مولانا نصیر الاسلام کا فرزندِ ارجمند ہونے کا حق ادا کر رہا تھا۔ پورے قصبے میں اِس گھرانے کی بڑی عزت تھی اور اکثر لوگ کہا کرتے کہ بسم اللہ پڑھ کر مولانا یا بیوی جی کا نام لینا چاہیے۔ قاری کی والدہ، المعروف "بیوی جی" ایک عبادت گذار، باپردہ، باحیا اور بہت ہی حلیم الطبع خاتون تھیں۔ اَن گنت لڑکیاں اُن سے دینی تعلیم حاصل کر چکی تھیں اور فیض کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ اُسے اپنی ماں اور باپ کے جسم سے پاکیزگی کی مہک آتی تھی اور اس تصور سے ہی اطمینان کا احساس ہوتا کہ وہ ایسے صالح کردار والدین کی اولاد ہے، جن کی معاشرے میں بڑی عزت ہے۔

تھانیدار کا بگڑا ہوا بیٹا ندیم عرف دیما قاری کے لیے مستقلاً دردِ سر بنا ہوا تھا۔ بازار، سکول یا مسجد سے آتے جاتے سامنا ہو جاتا تو دیما اپنی تمام تر باطنی پراگندگی کا مظاہرہ زبان آنکھوں چہرے اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے کرنے لگتا۔ قاری نے ایک دو مرتبہ مولانا سے دبے لفظوں میں ذکر کیا تو انہوں نے بڑی شفقت سے شر اور دنیاوی آلائشوں سے دُور رہنے کی نصیحت کی اور دعا دی کہ خدائے بزرگ و برتر اُسے زندگی کے خارزار میں اپنا دامن بچا کر چلنے کا سلیقہ اور ہمت بخشے۔

کچھ عرصہ پہلے دیمے نے قاری کو زیادہ ہی زچ کیا تو مولانا اُسے ہمراہ لے کر

تھانیدار کے پاس گئے۔ ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔ "اوئے مولوی صاحب! ایسے ہی عورتوں کی طرح شکائتیں لگا رہے ہو۔ دیما تو پکا مادر...... ہے۔ مار اُس حرامی کے تُوتھاڑ پر دو چار لپڑ۔ خود ہی سیدھا ہو جائے گا۔ میری طرف سے کھلی اجازت ہے"۔ پھر وہ قاری کو براہِ راست مخاطب کر کے بولا۔ "اوئے تم کوئی لڑکی ہو؟ دکھاؤ اُس کنجری کی اولاد کو ناڑا کھول کر۔" دونوں باپ بیٹا بُری طرح خفیف ہو کر اُٹھ گئے اور راستے بھر ایک دوسرے سے سامنا کیا اور نہ ہی کلام۔

حجام کی دکان والا واقعہ ایسا تھا کہ جس نے قاری کو ہلا کر رکھ دیا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بے حد و کنار بیاباں میں تنہا بھٹک رہا ہے۔ دیمے کی بات پر اُسے کسی طور بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ جس ذہنی اذیت کا وہ شکار ہوا پڑا تھا، اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی طرح حقیقت کا کھوج لگائے۔ دیمے کی بکواس کی روشنی میں اُسے ایک سراغ مل سکتا تھا۔ وہ فکرمند اور خوف زدہ تھا کہ دیمے کا کہا ہوا اگر سچ ثابت ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔ بار بار اندر سے یہی جواب آتا کہ اُس کے والد اور والدہ ایسے ہو ہی نہیں سکتے، لہٰذا حوصلہ کر کے اٹھا اور گھر کے واحد غسل خانے میں داخل ہوا۔ بالٹی اُلٹی کر کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ روشندان میں جھانکا تو اُسکی نظر سیاہ دستے والے اُسترے پر پڑی۔ اُسے یوں لگا جیسے کالے کوبرا نے اُس کے ماتھے پر ڈنک مار دیا ہو اور سارا زہر آنکھوں میں اُتار کر اندھا کر گیا ہو۔

قاری نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ بے شک والد صاحب نائی کی دکان سے اُسترا لے آئے ہیں۔ لیکن ضروری بھی نہیں کہ دیمے نے جو کچھ کہا ہے، انجام کار وہ اسے سچ ثابت کر کے دم لیں اور ایک ایسی نفیس اور خدمت گزار خاتون کے ساتھ نازوا سلوک کر گذریں۔ اُس نے تو کبھی اپنے والدین کو ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چارپائی پر دونوں آج تک اکٹھے بیٹھے نظر نہیں آئے۔ والد صاحب نے کبھی اس کی والدہ کو "تم" یا "تُو" نہیں کہا۔ اونچی آواز میں بولے نہیں۔ تو پھر ایسی گھٹیا حرکت اُن سے منسوب کرنا کتنا بڑا ظلم ہے۔ تاہم دل میں شک سا گھر کر گیا تھا۔ نائی نے اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا تھا کہ اس میں بُرا منانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو سب کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی انسان پیدا ہی نہ ہو۔ جیسے تم یا میں۔ حجامت کرواتے ہوئے ایک بزرگ نے لقمہ دیا۔ "جیسے دیمے کا ابا کرتا ہے"۔ دیما خوب چہک کر بولا۔ "ہاں تو اور کیا؟ میرا ابا تو کسی کو بھی نہیں

خستہ۔ اماں بے چاری تو اب ترس گئی ہوگی"۔ لیکن قاری کی سوچ جوں کی توں تھی کہ دنیا ساری معیوب حرکتیں کرتی ہے تو بڑی خوشی سے کرتی رہے لیکن اسکے والد اور والدہ ایسے ہو سکتے ہیں نہ ہونے چاہئیں۔ وہ خود کیسے پیدا ہوا؟ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔

سو جانا یا نیند نہ آنے کی صورت میں بستر پر کروٹیں بدلنا شاید اس قدر تکلیف دہ نہیں، جتنا خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنا عذاب ناک ثابت ہوا۔ آج تک یہ معمول رہا تھا کہ قاری عشاء پڑھتے ہی گھر آجاتا، جب کہ مولانا ذرا دیر سے لوٹا کرتے لیکن آتے ہی اپنے بستر پر لیٹ جایا کرتے۔ قاری تو آج گیا ہی نہیں تھا۔ مولانا آئے تو بولے۔ "تو یہ جلد سو گیا ہے، نماز بھی نہیں پڑھی، لگتا ہے اس کی طبیعت آج ٹھیک نہیں۔" والدہ نے کیا جواب دیا، وہ صحیح طور پر سُن نہیں سکا۔ تاہم اُسے پتا چل گیا کہ والد صاحب نے بتّی بجھائی اور اپنی چارپائی پر لیٹنے کی بجائے درمیانی دروازے سے گذر کر سیدھے پار کونے میں چلے گئے...... قاری کو محسوس ہوا کہ وہ ذلتوں کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔

قاری دن چڑھے تک مضمحل سا بستر پر پڑا رہا۔ صبح بار بار جگانے کے باوجود مسجد نہیں گیا۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ اُس کا جی چاہتا کہ کونوں کھدروں میں گھس کر زور زور سے روئے یا کسی جنگل میں نکل جائے۔ وہ گلی یا بازار میں نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں کتنے ہی دِیے گھومتے پھرتے تھے۔ شیطنت سے پُتا ہوا دِیے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا اور مغلظ لہجے میں ڈوبے ہوئے الفاظ سنائی دیتے "کیوں چھُو! میں نے سچ کہا تھا ناں"۔ وہ اپنی دانست میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا دل یک دم اچاٹ ہو گیا اور دنیا سے نفرت ہو گئی۔ اعتبار اٹھ گیا۔ فیصلہ کر لیا کہ خودکشی کر لے۔ چپکے سے باورچی خانے گیا اور چھری لا کر اس کی باڑ کا بغور معائنہ کیا۔ سوچنے لگا کہ اپنے پیٹ میں گھونپے یا گردن پہ پھیر لے۔ اُسے جُھر جھری محسوس ہوئی لیکن شدید ذہنی اذیت اور ندامت سے چھٹکارا پانے کی خاطر اسے ناگزیر سمجھا۔ اُس نے نلکے کے کھرے کی چھوٹی سی منڈیر کو پانی سے تر کیا اور سیمنٹ والی سطح پر چھری تیز کرنے لگا۔ اس دوران اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ اُس کا جگر کٹ کے رہ گیا کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ ابھی تو اُسے مڈل پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے استاد محترم کے درس میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لینا تھا۔ ایک بہت بڑا عالمِ دین بننا تھا لیکن سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ اب کس کے لیے جیتا رہتا۔

جس باپ اور ماں سے اُسے محبت تھی اور وہ انھیں عصرِ حاضر کے اعلیٰ ترین انسان سمجھتا تھا، اندر سے اس طرح کے ثابت ہوئے تو وہ کیوں اور کس منہ سے زندہ رہتا۔

خودکشی کرنے کے لیے وہ کسی مناسب جگہ کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ جسم میں کپکپی ہونے لگی اور ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ وہ منتظر رہا کہ اندھیرا ہو جائے تو اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے تاکہ اماں اور ابا تہجد کے لیے اٹھیں تو اسے مرا ہوا پائیں۔ تہجد کے لیے اٹھ کر دونوں اکثر بیٹے کے چہرے پر بوسہ دیا کرتے تو اُس کی آنکھ کھل جایا کرتی۔ تصور کی آنکھ سے اس نے کٹی ہوئی شہ رگ یا چاک شدہ پیٹ کے ساتھ اپنی میت پر ماں باپ کو روتے ہوئے دیکھا تو طمانیت کا احساس ہوا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ”ایسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے، جو اوپر سے کچھ ہوں اور اندر سے کچھ“۔

دوپہر تک قاری بخار میں پھنکنے لگا۔ اُس کے اردگرد دوائیاں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی اشیا بکھری پڑی تھیں۔ والد اور والدہ بستر سے لگے پڑے مسلسل زیرِ لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔ نرم ہاتھوں سے جسم اور سر دباتے ہوئے دونوں نے باری باری اس کا بوسہ لیا تو قاری کو کراہت محسوس ہوئی۔ وہ شدید نوعیت کے جسمانی آزار کے ساتھ ساتھ ذہنی دباؤ اور اذیت میں بھی مبتلا تھا۔ اس کے اندر بغاوت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ جن چہروں سے اُسے نور کی کرنیں اور جسموں سے پاکیزگی کی مہک اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، انھی سے نتھنوں میں بدبو گھسنے لگی۔ بار بار اُبال اٹھ رہا تھا۔ نہ جانے اب بھی حدِ ادب کیوں مانع تھی ورنہ کب کا یہ جملہ اُگل پڑا ہوتا۔ ”منہ مومناں کرتوت کافراں۔ ہٹ جاؤ میری نظروں سے“۔ خود پہ مسلسل جبر کرنے کی وجہ سے اُس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔

بخار تو اتر گیا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ عرصہ تک بیمار رہا ہو۔ اُس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دماغ کی سکرین پر بڑی گندی گندی تصویریں متحرک ہوئی رہتیں۔ اِسے بار بار رونا آجاتا۔

چھت پر کتابیں کھولے وہ منتشر ذہن کے ساتھ کھویا کھویا بیٹھا تھا کہ پڑوسی چچا عظمت کی بیٹی عصمت نے منڈیر سے جھانکا۔ وہ اس کی ماں کے پاس پڑھنے آیا کرتی تھی اور اکثر اپنے ابا کی دکان سے کھانے کی کچھ چیزیں چرا کر قاری کو دیا کرتی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی۔ بیری، ٹافیاں، املی، یا مربّہ وغیرہ۔ دن میں ضرور ایک آدھ بار چٹخارے لے لے کر اچار

کی پھانک چاٹ رہی ہوتی۔ قاری کے منہ میں پانی بھر جاتا۔ وہ اسے پیش کرتی تو نیم دلی سے دو چار بار انکار ضرور کیا کرتا لیکن آخر کار نظریں جھکا کر لے لیا کرتا۔

قاری آج بجھا بجھا سا تھا۔ عصمت نے قاری کو کیک پیس کی پیش کش کی تو اُس نے بیٹھے بیٹھے سر کی ہلکی جنبش سے انکار کر دیا۔ عصمت چند لمحے اُسے دیکھتی رہی اور بولی۔ "قاری! تم نے میرے ابّا کو اتنی موٹی لکڑی مار دی۔ پتا ہے؟ اُسے ٹانگ پر نیل پڑ گیا ہے"۔ قاری کچھ نہیں بولا تو وہ پھر کہنے لگی۔ "مجھے معلوم ہے تمہاری دِیسے سے لڑائی کس بات پر ہوئی ہے۔ ابّا میری اماں کو ہولے ہولے بتا رہا تھا تو میں سب کچھ سمجھ رہی تھی۔" قاری نے چونک کر ایک نظر اُسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اُس نے سر اوپر اٹھایا تو عصمت کی شریر نگاہیں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تاب نہ لا سکا تو دوبارہ گردن خم کر دی۔ عصمت کہنے لگی۔ "رونی شکل! میری بات سنو۔ سارے ابے اور امیاں یہی کچھ کرتے ہیں"۔ قاری کے کان سرخ ہوئے تو اگلے ہی لمحے چہرہ لال ہو گیا۔ تاہم وہ لرزتی ہوئی دھیمی آواز میں بولا۔ "تمہاری امی اور ابّا بھی؟"..... وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

"روز...... ابھی تو ہم سوئے بھی نہیں ہوتے...... ابّا شور مچانے لگ جاتا ہے، چلو بتی بجھاؤ اور سو جاؤ...... مجھے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کیوں ہمیں زبردستی سُلا رہا ہے"۔ قاری ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا اور حیرت آمیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی ایسی بے حیائی کی باتیں کرتے ہوئے"؟ وہ کہنے لگی۔ "پتا ہے ابّا نے مجھے سکول میں کیوں داخل نہیں کروایا تھا؟..... وہ امی سے کہتا تھا کہ سکول میں پڑھنے والی لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ کئی کتابوں میں بڑی بے شرمی اور بد معاشی والی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ دکان کے آگے فٹ پاتھ پر ایسی کتابیں بھی پڑی ہوئی ہیں، جن میں گندی گندی تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں۔ لڑکیوں کو رقعہ بازی کرنی آجاتی ہے اور وہ بے شرمی کی باتیں بھی سیکھ جاتی ہیں۔ بیٹی بس قرآن پاک پڑھ لے اور گھر میں رہے..... لیکن میں ساری باتیں جانتی ہوں۔ اگر یہ بے شرمی ہے تو بڑے خود کیوں اتنے شوق سے کرتے ہیں..... قاری تمہارا دل نہیں کرتا"؟..... قاری کو اچھا بھلا جھٹکا لگا لیکن عصمت بولتی رہی۔ "ہم سب چچا اور تایا کے لڑکے لڑکیاں بڑوں سے چھپ کر یا بستروں میں گھس کر اکٹھے کھیلتے ہیں تو جھوٹ موٹ کے ابے امیاں بن جاتے ہیں..... تم تو نرے بدھو ہو۔ تمہیں پتا ہی نہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں

گی"۔

بیڈ رُوم میں داخل ہونے سے پہلے اُس کی بیٹی اور بیٹا دستک دیا کرتے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ ایک روز اُس نے دونوں کو بازوؤں میں بھر کر پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب ملا۔ "مس (Miss) نے بتایا ہے"۔

بیوی نے ایسے ہی کہہ دیا کہ آپ دونوں باپ بیٹا ایک جیسے ہو تو بیٹی نے Genetics پر ہلکی پھلکی روشنی ڈالنے کی کوشش کی لیکن ماں کے ٹوکنے پر چپ ہو گئی۔ آج تو بیٹی اور بیٹے نے دونوں میاں بیوی کو خوشگوار حیرت سے ہمکنار کر دیا۔ وہ دونوں کسی کام سے رات گئے گھر لوٹے تو بیڈ روم کو سالگرہ کے اہتمام سے پوری طرح سجا ہوا پایا۔ انھیں اپنے "میزبان" بیٹے اور بیٹی سے پتا چلا کہ ان کی شادی کی سالگرہ ہے۔ کیک کاٹنے سے پہلے بہن بھائی نے مل کر امی ابو کا میک اپ کر کے انھیں تیار کیا اور خوشبو لگائی۔ بیٹا باپ سے بولا۔ "دیکھیں ابو! میری امی کتنی خوبصورت ہیں۔ آپ ایسے ہی اپنی سیکریٹری سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

دونوں بچے عمر کے اِسی دَور میں سے گذر رہے تھے، جس میں خود تنویر الاسلام کو پینتیس چھتیس سال پہلے سیاہ کوبرے نے ڈس لیا تھا۔

مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں

محمد الیاس

نقشِ خیال میرپور (آزاد کشمیر)

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے

مشرف عالم ذوقی

کہانی

"سارا کچھ بس تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ یقیناً تم بھی دیکھو گے۔" شمو بھائی نے اتنی زور سے مکا مارا کہ میز پر رکھے شراب کے گلاسوں میں تھر تھراہٹ دوڑ گئی۔

پرویز احمد نے جیب سے ٹرپل فائیو نکال کر سگریٹ سلگایا...... "ممکن ہے ایسا ہوتا ہو۔ مگر تعجب ہے۔" وہ دیر تک تعجب ہے کی گردان کرتے رہے۔ میز پر شراب کے خالی گلاس پڑے تھے۔ "آفیسر چوائس" کی بوتل خالی تھی اور اس کی شراب ہمارے اندر اتر کر دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔

شمو بھائی نے پھر زور سے کہا۔ تبدیلی ایک الگ چیز ہے، اور تبدیلی ضروری ہے۔ دنیا گھومتی ہے، زمین کے نیچے پڑا قارون کا خزانہ گھومتا ہے...... اور ایک خاص وقت میں...... میں تو کہتا ہوں اگر اسے مذہب سے نہیں جوڑا جائے تو...... اور اگر جوڑ بھی لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں سب کچھ الٹا پلٹا ہو سکتا ہے، یعنی ہم جانور بننے کی حد تک جانور بن سکتے ہیں یا جانور انسان بننے کی حد تک انسان...... نہیں، شاید اپنی بات ٹھیک طرح سے کہہ نہیں پا رہا ہوں،...... مسٹر کمال تم اب کہو......"

وہ لاچاری سے، بے بسی سے اپنے کمزور لفظوں کا ماتم کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"میں......!" میں تھوڑا جھجکا۔ مگر صداقت یہ تھی کہ اس بحث کا آغاز بھی میں نے ہی کیا تھا۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"تو میرے معزز دوست......! یقین کیجئے جو میں کہنے جا رہا ہوں وہ میری موجودگی کے امکان تک، جو آپ بھی اس وقت محسوس کر رہے ہیں، صحیح ہے، درست ہے اور اس میں شک کرنے جیسی کسی بات کو دخل نہیں۔"

پرویز احمد نے اس طرح برا منہ بنایا جیسے سے میری تمہید ناگوار خاطر گزری ہو۔
میں نے گہرا سانس کھینچا۔ "مجھے معاف کیجئے گا، مجھے قصہ بیان کرنے کا ہنر نہیں آتا، مگر اس دن میں سچ کہتا ہوں وہ۔ میری بیٹی نے جو ابھی کانوینٹ میں پڑھتی ہے، بڑی سمجھدار ہے، آپ .... تو ملے ہیں...... وہی ایلیشا کمال، آپ اسے بے بی یا کسی دوسرے نام سے پکار کے تو دیکھئے۔ آپ کا اگر جینا دوبھر نہیں کردے تو پھر بیشک میرا نام بدل دیجئے۔" ایلیشا کمال" وہ اسی نام سے آپ کو ملے گی، اور آپ سے بھرپور قابلیت اور ذہانت کی باتیں کرے گی۔ میری بیٹی مجھ سے برابر کہتی ہے .... دیکھئے تعجب مت کیجئے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ سو فیصدی سچ ہے....... کہ ڈیڈی ادھر بہت دنوں سے میں نے جلتا ہوا مکان نہیں دیکھا۔ اور آپ یقین کیجئے کہ کسی دھواں دیتے مکان کی سچی تصویر کھینچنے کے لئے وہ کس قدر پاگل ہو چکی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں سانس لینے والے ایک باپ کی حیثیت سے، آپ سمجھ سکتے ہوں گے، بیٹی کی کیفیت دیکھ کر مجھے کس قدر کوفت اور تکلیف ہوتی ہوگی۔ نہیں، آپ فرض نہیں کرسکتے۔ مگر اس دن....... ایک پیگ بنالوں۔ اس کمبخت آفیسر چوائس کا بھی جواب نہیں۔"

"نہیں مسٹر کمال۔!" شمو بھائی نے ناراضگی دکھائی۔

"آپ پہلے ہی بہت پی چکے ہیں۔"

"اوہ! ہاں تو میرے معزز دوستو! اس دن، آپ کو شاید یاد ہوگا۔ دسمبر کی ۲۶ تاریخ تھی، اور آس پاس کے مکانوں سے دھواں اٹھتے ہوئے کچھ ایسے لگتا تھا جیسے بچپن میں اپنے ننہال والے گھر کے پاس والی چمنی سے اٹھتا دیکھتے تھے اور آپ مجھے ایک کمزور باپ سمجھ کر معاف کردیں۔ میں نے دیکھا، ایلیشا کمال کے چہرے پر حیرت کی حد تک خوشی کی جگمگاہٹ ہے۔ وہ ممی پر قدرے خفا تھی۔ کہنے "تم کچھ بھی سنبھال کر نہیں رکھتیں ممی۔ تم میں یہی بہت بری عادت ہے، میرا وہ جاپان والا کیمرہ کہاں ہے؟ جو مارگریٹ آنٹی نے دیا تھا۔"

صوفے پر چائے کے خالی کپ رکھتے ہوئے میں نے اپنی جانب سے ایک کمزور سی مدافعت کی۔ "ایلیشا بیٹی، باہر گھر جل رہے ہیں......." وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر یعنی اپنے باپ پر جھپٹی۔ "تو۔؟ مجھے بھی معلوم ہے" لیکن آخر آپ چاہتے کیا ہیں ڈیڈی۔ کیا آگ لگانا میری

دانست میں، کم از کم میرے لئے، لیکن آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ کو صبح میں ایک کپ چائے اخبار سے پہلے آپ کو دینا کوئی بھول جائے تو آپ گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں........ نہیں، ایسا ہے تو آپ کو میری بات سمجھنی چاہئے کہ جو رشتہ ایک کپ چائے سے آپ کا ہے وہی۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ........ آگ اور دھویں کو دیکھنا۔" بات پوری نہ کرنے کی صورت میں وہ تھوڑی جلائی بھی تھی...... "میں ضروری نہیں سمجھتی ڈیڈی کہ آپ کو ہر بات کی وضاحت کرتی چلوں۔"

"نہیں........ تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ ویسے ہر بات کی وضاحت ضروری بھی نہیں۔" میرے چہرے پر جیسے کہ اس طرح کے موقع پر ایک پھیکی ہنسی آجاتی ہے.......... مجھے کہنے دیجئے، میں اپنی ضدی اور سرکش ایلیشا کمال کی باتوں کی تائید میں ہاں میں ملا رہا تھا۔ ایک کمزور باپ کی طرح۔ نہیں میرے معزز دوستو، آپ اداس مت ہوئیے۔ یہ ہم جیسے تمام باپوں کا مقدر ہے اور میں تو کہتا ہوں، اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میرے ہاتھوں میں شاید اس دن کا اخبار بھی تھا جس میں مرنے والوں کی اور........ کہنے دیجئے، مختلف طریقوں سے مرتے والوں کی خبریں اتنی کم تھیں کہ مجھے پورا اخبار ہی غیر دلچسپ، باسی اور مسکرایئے نہیں، جھوٹا محسوس ہوا۔ میں نے ایلیشا کی طرف دیکھا جس کے غصے بھرے چہرے پر کیمرہ مل جانے کی وجہ سے گمشدہ ایکسائٹمنٹ واپس مل گیا تھا۔ پھر وہ ممی کو لئے ہوئے تیسری منزل کی سیڑھیاں تیز تیز طے کرنے لگی۔

پرویز احمد نے برا سا منہ بنایا۔ "چھوٹی سی بات ہے، اتنی تمہید کی ضرورت نہیں۔ میرے بچوں کو بھی دھواں پسند ہے اور میں بتاؤں۔ یوں تو وہ محض آٹھ سال کا ہے، چھوٹی چھوٹی کاغذ کی جھونپڑیاں بناتا ہے پھر انہیں آگ دکھا دیتا ہے، پھر خوش خوش اپنی ممی کو آواز لگائے گا کہ "ممی دیکھو، جھونپڑی جل گئی۔" وہ لتنے مزے میں کہتا ہے کہ ہمیں سنتے ہوئے اچھا لگتا ہے کہ کاش، وہ کاغذ کی ایسی ہی اور جھونپڑیاں بناتا اور انہیں آگ دکھاتا۔"

شمو بھائی نے منہ بنایا۔ "کوئی نئی بات نہیں مسٹر کمال، آپ آگے کہیں۔"

آگے۔ میں آنکھوں کے سامنے ایلیشا کو اوپر چھت پر دیکھ رہا تھا، وہ ایسے ایکسائٹیڈ تھی جیسے بچپن میں، میں پہلی بار سمندر اور تاج محل کو دیکھ کر ہوا تھا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں، ہمارا گھر تین منزلہ ہے۔ تیسری منزل سے سارا شہر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، شرپسندوں نے جو دو چار گھر

پھونک ڈالے تھے یہ اسی کا دھواں تھا۔ آگ اور دھویں کی کالی لپٹوں سے آسمان بھر گیا تھا۔ معزز دوستو! آپ فرض نہیں کر سکتے، میری ایلیشا اس موقع پر کیسی خوش تھی۔ وہ آگ کی لپٹوں اور آسمان پر پھیلے دھویں کو کیمرے میں اضطرابی جوش کے ساتھ نظر بند کرنے لگی، تو میری بیوی چلائیں۔ ٹھہرو۔ اور پھر وہ چھت کی منڈیر پر، گالوں پر ہاتھ رکھ کر، کسی قدر بے نیازی ظاہر کرتی ہوئی پوز دینے لگیں، کہ "ہاں ایلیشا اب تصویر لے لو۔" میں نے دیکھا، میری بچی کے چہرے پر صبح کی تازگی کی طرح سکون کی آمیزش تھی۔ وہ مسکرائی بھی۔ "ممی! وہاٹ اے ونڈرفل آئیڈیا۔ دھویں میں تمہارا چہرا۔ نیور مائنڈ ممی۔ بڑھتی عمر، تمہارے چہرے کے رنکلس اور دھواں۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ تصویر اس ملک سے باہر چلی جائے تو کوئی بڑا انعام جیت کر ضرور لائے گی۔"

اور میرے معزز دوستو، ٹھیک اسی وقت راکسی، ہمیں نیچے نہ پاکر پونچھ ہلاتا ہوا اوپر چلا آیا تھا۔ بھونکتے ہوئے اس نے اپنی خفگی کا اظہار بھی کیا کہ ہم اسے بتائے بغیر کیوں چلے آئے۔ دوچار بار وہ مجھے بھی دیکھ کر بھونکا۔ پھر میرے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ ایلیشا نے چلا کر کہا" راکسی، ادھر ممی کے پاس، چلو کھڑے ہو جاؤ۔" وہ دھویں ممی اور راکسی کو کسی مخصوص پوز میں کیمرے میں بند کرنا چاہتی تھی۔

باہر جب کہ آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا، مجھے ایک کمزور باپ کو ...... آپ ہنسیں گے نہیں ...... اس وقت بھی، جس وقت ایلیشا اس پرآشوب منظر کی تصویریں لے رہی تھی، نہیں، آپ مانیں گے نہیں، میں کچھ کہنے کی ہمت جٹا رہا تھا کیونکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سب کچھ بدل رہا ہے اور یہ میرے گھر والے ابھی سے، اس طرح اپنی دیکھنے والی عینکوں کو نہیں بدلیں گے تو ...... شاید سب کچھ بہت جلدی بدل جائے ...... انہیں شمو بھائی میں نے پہلے ہی کہا ہے آپ ہنسیں گے نہیں۔ میں سچ بول رہا ہوں، میں نے ایلیشا کو ڈانٹ پلائی تھی۔ صحیح معنوں میں شمو بھائی ایک بھائی کی طرح، "ایلیشا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" تو کیا اس نے بھی آپ کو ...... شمو بھائی پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

دیکھئے، اب آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا، جبکہ میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ میں ماں بیٹی پر خوب ناراض ہوا، اور وہ راکسی ...... سچ کہتا ہوں، ساری کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ باہر

آگ دھواں، اور تصویر لیتی ایلیشا۔ پھر ہم تینوں کی زبردست جھڑپ، اور راکسی کا ہمیشہ کی طرح سہمے سہمے انداز میں یہ سب دیکھنا۔ جبکہ ایلیشا چلائی بھی تھی کہ ڈیڈ .... Communalism جیسی گپ کو اخباروں نے بھی چھاپنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور آپ .بہرکیف........ اصل بات تو یہی ہے کہ میں لڑائی کر کے ریڈنگ روم میں ہی سو گیا۔ رات کا پچھلا پہر بیت گیا تھا۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کے بولنے کی بھنبھناہٹ سنائی پڑی۔ آواز دھیمی اور مہذب اس قدر تھی کہ نیند اچٹ گئی۔ کیا یہ کوئی خواب تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ شاید رات میں کھلا رہ گیا تھا۔ اب مجھے خوف کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کوئی قریب ہی کھڑا تھا اور میں اس کی باتوں کو صاف سن رہا تھا۔ وہ جو بھی تھا، لیکن مجھ سے یوں مخاطب تھا۔

"سنیئے........، آپ ہماری درندگی اور جبلت سب کچھ لے چکے ہیں۔" نرم شائستہ لہجہ، "آپ سن رہے ہیں نا، مہینوں میں، برسوں میں اور شاید صدیوں میں آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے انسان ہونے کے خطرے کو (ہنسی) کم کرتے رہے ہیں۔ برا مت مانئے، انسان تو آپ کو اپنے علاوہ پسند تھے نہیں، جانور آپ کے پالتو بن چکے تھے........ آپ سن رہے ہیں نا، خیر۔ اس غیر دلچسپ گفتگو سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف اتنی التجا کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ کو ہم سے کچھ لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، آپ ہم سے ہماری جبلت لے چکے ہیں، آپ اپنی تھوڑی سی ہمیں انسانیت دے سکتے ہوئے..........

شمو بھائی نے پینترا بدلا۔

پرویز احمد نے ٹریپل فائیو کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی۔ میں اپنی دھن میں مزید آگے بڑھا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ہمارا راکسی تھا جو رات کے کسی پہر نیند نہ آنے کی وجہ سے چپ چاپ میرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور اب میرا پاؤں سہلا رہا تھا۔ میں نے جھٹ اٹھ کر بلب روشن کیا۔ اور سچ کہتا ہوں، راکسی کی آنکھوں میں......."

شمو بھائی نے زور سے ایک مکا میز پر مارا۔ "درست ہے، بالکل درست ہے، ایک وقت آتا ہے، جب ہر شے اپنی اصل سے فرار چاہتی ہے، اور کسی دوسرے روپ میں منتقل ہونے کے لئے زور مارتی ہے، اور اگر تم نے یہی کچھ سنانے کے لئے ہمیں یہاں بلایا ہے تو......."

پرویز احمد نے دھیرے سے ان کا ہاتھ پکڑا، بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "ہاں تو آگے کیا ہوا......؟"

میں نے پھر آفیسر چوائس کے ایک چھوٹے پیگ کی طلب ظاہر کی۔ شمو بھائی کے منع کرنے پر بھی میں نے قصہ کو جاری رکھا۔ ہاں تو، معزز دوستو، اس رات، اور سچ کہوں تو کہانی بس ایک رات کی ہی ہے۔ ان کا معاذ اللہ، کیسی خوفناک تاریک رات تھی۔ جس دن ایلیشا کمال آگ کی لپٹوں اور دھویں کی تصویر لے رہی تھی۔ شمو بھائی، میں نے ایلیشا کو سچ مچ ڈانٹا تھا۔"

"یہ کیا بات تھی ایلیشا، مکان جل رہے تھے اور تم تصویریں اتار رہی تھیں۔" اور ایلیشا کا جواب تھا۔

"مجھے مزا آتا ہے ڈیڈی، ایسی تصویریں اتارتے ہوئے، میں صحیح معنوں میں پاگل ہو جاتی ہوں۔"

میں نے ہونٹ چبائے۔ "یہ سب وحشی پن ہے، میں کہتا ہوں پوری قوم غیر مہذب ہوتی جارہی ہے۔" میں شاید چلایا تھا۔ "تم نہیں جانتیں ایلیشا، شرپسندوں کا اگلا نشانہ ہمارا اپنا گھر بھی ہوسکتا ہے۔"

میں نے سوچا تھا کہ یہ جملہ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہوگا، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چپی چھا جائے گی۔ وہ بوکھلا جائے گی۔ ہمی ہمی سی اپنی غلطی کی معافی مانگے گی۔ مگر نہیں میرے معزز دوستو۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا جوش تھا۔

"اوہ ڈیڈی! کیا سچ مچ ایسا ہوگا۔ نہیں آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے، دھویں سے مجھے کتنا پیار ہے۔"

"مجھے اس کی خبطی عادتوں کا پتہ تھا۔ بچپن میں ڈیزل کی مہک اسے اسی طرح پاگل اور بے چین بنا دیتی تھی۔

"پاگل!" میں دوبارہ چلایا۔ "ابھی شاید تمہیں فساد کا تجربہ نہیں ہے، فساد میں جانتی ہو اور کیا ہوتا ہے، ظالم صرف گھر ہی نہیں جلاتے ہیں بلکہ کمسن اور جوان لڑکیوں کو کھینچ کھینچ کر......"

ایلیشا نے جیسے سحرزدہ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آپ اپنے لفظوں سے مجھے بے خود اور پاگل بنا رہے ہیں ڈیڈی۔" وہ مسکرائی تو اسکی آنکھوں میں شیرنی جیسی چمک تھی۔ "آپ ہمیشہ

بھول جاتے ہیں، جبکہ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا جنم انہیں آگ اور دھویں کے درمیان ہوا ہے۔ ممی کہتی ہیں ناکہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو شہر یوں جل رہا تھا جیسے دیوالی منائی جا رہی ہو۔" ایلیشا سامنے والے صوفے پر دھنتی ہوئی بولی۔ "اوز آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ہسٹری کی اسٹوڈینٹ ہوں۔ قتل وغارت، قوموں کی جنگ، ورلڈ وار .... یہ سب میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔" وہ ھنس رہی تھی "اب آپ ان پر لکچر پلا کر زیادہ بور نہیں کریں گے ڈیڈی، میں کہہ سکتی ہوں، مجھے ان سب سے پیار ہے۔" پھر ایلیشا کوئی انگریزی گانے کی دھن گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے ایلیشا کی ممی کو بلا کر سمجھایا۔

"اسے روکو! وہ پاگل ہو رہی ہے۔"

اس نے برا سامنہ بنایا۔ "شادی کے فوراً بعد تمہیں بیٹا چاہیئے تھا۔ اس کی ہر بات میں پاگل پن نظر آتا ہے۔"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا کہ اس بڑھاپے میں، میں اس کے اندر اپنی بچی، اپنی ایلیشا کو جوں کا توں اترتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔

"دھواں تمہیں اچھا لگتا ہے کیا۔؟"

اس نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا۔ "تمہیں اچھا نہیں لگتا کیا؟ یاد ہے جب گیس کے چولہے کا رواج نہیں تھا تو ہم کچے چولہوں پر کھانا بنایا کرتے تھے۔ باہر اوسارا، اور باورچی خانے کی دیواریں سب دھویں سے بھر جاتی تھیں۔ تم برآمدے میں ہی کرسی نکال کر کتاب پڑھتے تھے۔ میں چلاتی بھی تھی کہ دھواں ہو رہا ہے، آنکھیں خراب ہو جائیں گی، اور تمہارا جواب ہوتا تھا "دھویں سے آنکھیں پڑپڑاتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

"تب جوانی تھی، جوانی میں ایسی سب پاگل حرکتیں اور عادتیں اچھی لگتی ہیں۔" "تو ایلیشا کو کیوں منع کرتے ہو؟ یاد ہے، جس روز وہ پیدا ہوئی تھی اس روز بھی شہر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر جب وہ اسکول جانے کو ہوئی تب بھی ہر دوسرے، پانچویں مہینے یہی عالم رہا۔ ہمیں بھی یہ سب دیکھتے ہوئے اب برسوں گزر چکے ہیں۔ اور ایلیشا کا تو بچپن ہی اس کے سائے میں پلا ہے یہ وہ مسکرائی "اب یہ دھواں اس کا دوست بن چکا ہے۔"

"لیکن کل معاملہ بھی تو دوسرا تھا، کم از کم اتنا خطرہ نہیں تھا۔"

"ہٹو۔" اس نے بے دردی سے میری بات کاٹ دی، خطرہ بس تمہاری گفتگو اور تمہارے لفظوں میں ہے، بیٹھے بیٹھے جب خود کو بہت بوڑھا محسوس کرتے ہو تو ڈر جاتے ہو، میں تمہاری طرح بوڑھی نہیں ہوئی ہوں۔" میں نے دیکھا، اس نے ایلیشا کے گانے کی بھونڈی نقل کی تھی اور شاید اسے ایلیشا کی نقل کرنی بھی چاہئے تھی۔ کیوں کہ اب وہ پہلے والی مسز کمال نہیں تھی، جو کہ ایک معمولی سا افسر تھا۔ اب اسے بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ دوسرے افسران کی بیویوں کی طرح کلب جائے اور کلب میں اپنے رنگ ڈھنگ کچھ ایسے ہی رکھے، جیسے کہ ایلیشا رکھتی ہے یا دوسرے افسران کی بیویاں .... "ہاں بے شک، مجھے اس کے بہروپ پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہین، کیونکہ شمو بھائی۔"

پرویز احمد نے ٹرپیل فائیو سے دوسرا سگریٹ نکال لیا۔

شمو بھائی بوجھل ہو کر بولے....... "اس رات؟"

"آپ نے خبر پڑھی ہوگی، فساد کی لپیٹ میں، ہمارا محلہ بھی آگیا تھا" میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" شمو بھائی نے خاصا بے زاری اور اکتاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

شام تک خبر آگئی کہ شرپسندوں کا ارادہ آج ہمارے محلے پر حملہ بولنے کا ہے اور ہمیں بھی اس کے لئے تیار رہنا چاہئے، آس پاس کے گھروں میں کوئی بھی اس رات نہیں سویا۔ میرے پڑوسی نے مجھ سے آکر دریافت کیا۔ "آپ کے پاس لائسنس والی بندوق وغیرہ تو ہے نا؟"

"ہاں۔"

"اسے سڑک کی طرف تانے ہوشیار رہئے گا۔"

میں نے دریافت کیا...... "اگر مان لو، بھیڑ حملہ کرنے پر اتر آتی ہے اور بچاؤ کے لئے گولی چل جاتی ہے، کوئی زخمی ہوتا ہے یا ہلاک تو اس صورت میں دفعہ ۳۰۲ تو نہیں بنتی۔"

پڑوسی نے مضحکہ اڑایا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، آپ جو کچھ بھی کریں گے اپنا گھر، اپنی جان بچانے کے لئے کریں گے۔ یاد رکھئے، باہر سڑک کی طرف بندوق تان کر........ ہشیار........

ویسے، ہم سب تیار ہیں......"

میں کمرے میں آیا تو ایلیشا ٹیپ ریکارڈر زور دار آواز میں بجاتی ہوئی کسی انگریزی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی......... "بند کرو........ "میں زور سے چلایا۔

اس نے گھوم کر ناگواری اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

"آج کی رات جنگ کی رات ہے۔ باہر سے حملہ ہو سکتا ہے، ہمیں تیار رہنا چاہئے۔" میں ذرا اونچی آواز میں بولا۔ پھر ٹھہر گیا، میں نے محسوس کیا، میری آواز میں بھی کسی خطرے اور خوف کو دخل نہیں تھا، بلکہ ابھی جو مکالمہ میں منہ سے نکلا تھا اس میں بھی ایک طرح کا ایکسائٹمنٹ پوشیدہ تھا۔ مجھے کیا چاہئے، مجھے استاد کھ ہوا کہ جوابی حملے کے طور پر میں نے زور زور سے بجتا ہوا ریکارڈ آف کر دیا۔ ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم چھتوں پر بندوق تان کر تیار رہیں۔ گھر کی تمام بتیاں بجھا دیں اور اس سے پہلے۔ آپ کو تعجب ہو گا آپ میرے چہرے پر سراسیمگی کی جگہ مسکراہٹ تھی۔ کیوں نہ ایک کپ گرما گرم چائے ہو جائے۔"

باہر سے ہنگامے کی آواز آ رہی تھی، ہم آرام سے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ باہر شاید پورا محلہ جمع تھا۔ ایلیشا کی آنکھوں میں جنگلی بلیوں جیسی چمک تھی، میں نے تیز آواز میں کہا۔ "چائے جلدی ختم کرو، پھر اوپر چلیں گے" مجھے خود پر بار بار غصہ آ رہا تھا، باہر پڑوسی کس قدر پریشان ہیں۔ مجھے جتنا پریشان ہونا چاہئے تھا، میں نہیں ہوں، اس کے برخلاف راکسی ہر جگہ خطرے کی بو سونگھتا چل رہا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ پریشان تھا، اور بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا۔ کبھی دروازہ جھانک کر چلا آتا، پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا جاتا۔ اس کے بعد ہمارے کمرے میں واپس آ کر بے چینی سی پونچھ ہلانے لگتا۔ جیسے ہمیں سوئے سے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

چائے پینے کے بعد ہم اٹھے تو ایلیشا نے چہچہاہٹ کے انداز میں کہا...... "ڈیڈی میں وہ مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن لوں، جسے پہن کر میں پوری انگریز لگتی ہوں۔"

"ہم گھر میں ہیں، کسی پکنک یا پارٹی میں نہیں جا رہے ہیں۔" میں نے لہجہ کو بھاری بناتے ہوئے کہا" باہر دھواں اٹھ رہا ہے........"

"اوہ........ میں تو بھول ہی گئی تھی ڈیڈی، اچھا وہ جاپان والا کیمرہ لے لوں؟"

اس سے پہلے کہ میں ناراضگی و خفگی کا اظہار کرتا، باہر گولی دغنے کا دھماکہ ہوا، ہم سے پہلے راکسی تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کوٹھے پر بھاگ گیا۔

سڑک سنسان ہو رہی تھی۔ بندوق کی نال سڑک کی طرف تانے، ہم چھپ کر بیٹھ گئے۔ آس پاس کے گھروں سے ایسی کئی کھڑکیاں (ممکن ہے میرا خیال ہو) وحشت زدہ سی باہر کو جھانک رہی تھیں۔ ہمیں ایک ہی طرح سے بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر گئے تھے، مگر ہم کس بات کا انتظار کر رہے تھے؟ راکسی بار بار پونچھ ہلاتا ہوا اوپر سے نیچے کو رہا تھا۔ ایلیشا کچھ دیر سانس روکے بیٹھی رہی، پھر اکتا گئی تو منع کرنے کے باوجود مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن کر اوپر آگئی اور چھت پر مزے مزے لے کر ٹہلنے لگی۔ دو تین گھنٹے جب اسی حال میں گزر گئے تو میں نے پلٹ کر بیوی سے کہا۔ "چلو چلتے ہیں" کچھ بھی نہیں ہوا۔ بندوق پکڑے پکڑے ہاتھ درد کر گئے۔"

شمو بھائی نے برا سا منہ بنایا۔ "جب کچھ بھی نہیں ہوا تو پھر کیا سنانے کے لئے آپ نے ہمیں یہاں روک رکھا ہے........."

"کیوں نے دوسری آفیسر چوائس کھول لی جائے" میں دھیرے سے مسکرایا۔ اس لئے کہ جو بات اب آپ کو سنانے والا ہوں اس کے لئے......... یہ بھی ممکن ہے آپ ملنے سے ہی انکار کریں، مگر میرے معزز دوستوں، آپ بہتر جانتے ہیں، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ میں نے اپنے لئے ایک بڑا سا پیگ تیار کر لیا۔ گلاس ہونٹوں سے ہٹایا پھر تلخی بھرا گھونٹ معدے میں اتارتا ہوا بولا۔ "دوستو! مجھے خود بھی اس بات کی حیرانی ہے کہ بندوق چھت پر لے کے ہم کچھ ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے، اگر نہیں تو پھر ہمیں دکھ کس بات کا تھا، کہ کچھ نہیں ہوا اور سچ پوچھئے تو اسی بات نے ہمیں کافی دیر تک پریشان کیا تھا۔ ایلیشا کا جوش کسی کمزور نشہ کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ میری بیوی کا موڈ بھی بہت خراب تھا۔ اس رات، ہم تینوں میں پھر جھگڑا ہوا۔ جس وقت جھگڑا ہوا اس وقت بھی راکسی ہمارے کمرے میں ہی تھا اور مہذب طریقے سے اپنی پونچھ ہلا ہلا کر شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

ایلیشا بولی۔ "تم جھوٹ بولتے ہو ڈیڈی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اچھی خاصی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی۔"

گو کہ میرے اپنے چہرے پر بھی کسی گلیمر کی پرت موجود تھی۔ اس پرت کو خارج کرتا ہوا میں ہونٹ چبا چبا کر اپنی صفائی دے رہا تھا اور فساد کے برے نتایج کو سفاک لفظوں کے ساتھ بیان کر رہا تھا۔ مگر حیرت ہے، میں ایلیشا اور اس کی ممی کو دونوں کے موڈ کو بحال کرنے میں ناکام رہا۔ غصے میں بغیر کھائے پیئے سب سونے چلے گئے۔ میں بھی اپنے بیڈ روم میں واپس آگیا اور نہ جانے کب میری نیند لگ گئی۔ میرے معزز دوستو۔ انگریزوں کا رہن سہن، قرینہ، لباس، مجھے بے انتہا پسند ہیں۔ میرے کپڑوں والی الماری میں نفیس سے نفیس لباس رکھے ہیں۔ ایلیشا جب دس سال کی تھی اور میرے سر کے بال سفید ہونے لگے تھے تو سیاہ و سفید بالوں کے امتزاج نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ میرے دوستوں کا بھی کہنا تھا کہ ان کی آمیزش نے میری شخصیت کو انتہائی سنجیدگی اور وقار عطا کیا ہے۔ میں سوٹ پہن کر، سر پر ہیٹ لگائے، ہاتھ میں اسٹک تھامے، رات کے وقت معزہ یعنی اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کو نکلتا تھا۔

پرویز کا چہرہ بدستور بوجھل تھا، اسے میری تمہید گراں گزر رہی تھی۔ اور اسی لئے وہ بار بار کرسی پر پینترے بدل رہا تھا۔ میں نے آفیسر چوائس کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر کہا "میری بات سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ جو ذائقہ اس شراب میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ کیوں شمو بھائی، آپ ناراض مت ہوئیے، میں اسی رات کے قصہ پر واپس آرہا ہوں۔ شک اور انکار کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے اور اب کہانی بالکل ختم پر ہے، میری نیند اچٹ گئی، وہی دھیمی اور مہذب لہجہ .... جیسے کوئی میرے قریب کھڑا چبا چبا کر نرمی اور متانت سے لفظوں کی ادائیگی کر رہا ہو، اور ادائیگی کرنے والا اتنے پاس کھڑا ہو کہ اس کی سانسیں بھی گننے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو........ وہی بزم ملائم اور مہذب انداز گفتگو۔ "سنئے! اب یہاں آپ کو یا سب کو میری ضرورت ہی کیا ہے۔ وفاداری اور غلامی کی آپ کی نظروں میں قیمت ہی کیا رہی، ناراض مت ہوئیے۔ غور کیجئے، آپ ہم میں سے سب کچھ لے چکے ہیں۔ ہماری حیوانیت، درندگی، جبلت۔ نہیں، اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی، بات نہیں ہے محترم۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ لیکن اتنا یاد رکھئے گا۔ اپنی وفاداری اور غلامی میں نے ٹھیک طرح سے نبھائی۔ کیوں، ٹھیک ہے نا۔ تو جاتے جاتے آپ سے تھوڑی انسانیت مانگ رہا ہوں۔ اگر آپ کے اندر بچ گئی ہے تو........ نہیں، اچھا الوداع......"

میں جانتا تھا شمو بھائی۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس وقت یہاں میری موجودگی کی حد تک جس کا آپ کہیں تو میں ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔ وہ راکسی ہی تھا، اور وہ وہی میرے مخصوص لباس میں تھا۔ سوٹ، ہیٹ، ہاتھ میں اسٹک۔ اس نے ہیٹ اتار کر، جھک کر مجھے سلام کیا پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

چیتا

ر الزماں خان کہانی

ایک لمبے عرصے کے بعد سعید بن سعد جب اپنے عزیز دوست خالد بن عزیز کے عظیم الشان گھر پہنچا تو
ت سے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کہ وقت نے خالد بن عزیز کے گھر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا کہ ہر طرف چشمہ سار۔
جگہ سر سبز چھاؤں درخت، آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی دھوپ، سفید اور سبز در و دیوار، ہر زمین کے بے شمار اچھے
، مہمان، ان گنت سپید و سیاہ ملازمین۔ چنانچہ خوشی سے سعید بن سعد کی آنکھیں بھیگ گئیں تھیں اور وہ ایک
ورت بڑے سے ہال میں بیٹھا اپنے دوست خالد بن عزیز کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ مسکراتے ہوئے ہال میں داخل
ے اور سعید بن سعد کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ کہو میرے بھائی۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد ہم تمہیں کیسے یاد آگئے؟ یہ
، موسم کیسے سر سبز ہو گیا؟!

"یاد تو آپ ہمیشہ ہی آتے رہتے ہیں دوست لیکن زمین اور سفر اپنی اپنی جگہ دیوار تھے یعنی وقت اپنی جگہ اٹل تھا
ں زنجیر تھے اور زمین غیر مطمئن تھی۔ اسی لئے ہم مجبور تھے ورنہ آپ تو ہمارے اندر پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی
دہیں۔

ہاں میرے عزیز! وقت، سفر اور زمین۔ تینوں کا ساتھ بہت ضروری ہے لیکن ان تینوں میں وقت سب سے
اہم ہے کہ وہ تمام کائناتوں کی تیز تر سانسوں پر مسلط ہے کہ ہوائیں اس کی گرفت میں ہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں
ے دوست۔ سعید بن سعد نے کہا کہ ہر چیز وقت کی مٹھی میں قید ہے کہ وقت سمندروں کی موجوں کی سانسوں کا
ں سلسلہ ہے کہ وقت ہواؤں کے جسموں کی لگاتار حرکتوں کا سفر ہے کہ وقت سیاروں کی آنکھوں میں پوشیدہ تصویر
، وقت موسموں کی تیز تر تمام تر آہٹوں کا چہرہ ہے کہ وقت پھولتی، سکڑتی اور اترتی چڑھتی ہوئی سانسوں کا آخری منظر
، وقت متواتر، بے تکان اور بے سمت دوڑتے ہوئے ان گنت گھوڑوں کا نامکمل خواب ہے کہ وقت مسلسل اگتے اور
ہوئے درختوں کا گھنا جنگل ہے کہ وقت چکراتی، گھومتی اور غبار بنتی ہوئی ہواؤں کا بے قرار جسم ہے۔"

"ہاں میرے دوست۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ تم نے تو وقت پر خاصا وقت لگا دیا۔ لگتا ہے کہ تم نے وقت کو
غور سے دیکھا، سمجھا اور پڑھا ہے۔

"ہاں میرے رفیق۔ ہم نے وقت کو دیکھ لیا ہے کہ ہم اس کی رفتار سے خوب واقف ہیں۔ سعید بن سعد نے
ج اور گزرے ہوئے کل کو دیکھو بلکہ ہر اس لمحے کو دیکھو جو آرہا ہے اور جا رہا ہے۔

"ٹھیک کہتے ہو کہ وقت ہی سب کچھ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ زندگی نے تمہیں کون کون سے راستے اور موڑ

میں جانتا تھا شمو بھائی۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس وقت یہاں میری موجودگی کی حد تک جس کا آپ کہیں تو میں ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔ وہ راکسی ہی تھا، اور وہ بھی میرے مخصوص لباس میں تھا۔ سوٹ، ہیٹ، ہاتھ میں اسٹک۔ اس نے ہیٹ اتار کر، جھک کر مجھے سلام کیا پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

چیتا

مظہر الزماں خان

کہانی

ایک لمبے عرصے کے بعد سعید بن سعد جب اپنے عزیز دوست خالد بن عزیز کے عظیم الشان گھر پہنچا تو
یرت سے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کہ وقت نے خالد بن عزیز کے گھر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا کہ ہر طرف چشمہ سار۔
گہ جگہ سر سبز چھاؤں درخت، آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی دھوپ، سفید اور سبز در و دیوار، ہر زمین کے بے شمار اچھے
رے مہمان، ان گنت سپید و سیاہ ملازمین۔ چنانچہ خوشی سے سعید بن سعد کی آنکھیں بھیگ گئیں تھیں اور وہ ایک
وبصورت بڑے سے ہال میں بیٹھا اپنے دوست خالد بن عزیز کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ مسکراتے ہوئے ہال میں داخل
وئے اور سعید بن سعد کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ کہو میرے بھائی۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد ہم تمہیں کیسے یاد آگئے؟ یہ
یا ایک موسم کیسے سر سبز ہو گیا؟!

"یاد تو آپ ہمیشہ ہی آتے رہتے ہیں دوست لیکن زمین اور سفر اپنی اپنی جگہ دیوار تھے یعنی وقت اپنی جگہ اٹل تھا
پاؤں زنجیر تھے اور زمین غیر مطمئن تھی۔ اسی لئے ہم مجبور تھے ورنہ آپ تو ہمارے اندر پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی
موجود ہیں۔

ہاں میرے عزیز! وقت، سفر اور زمین۔ تینوں کا ساتھ بہت ضروری ہے لیکن ان تینوں میں وقت سب سے
یادہ اہم ہے کہ وہ تمام کائناتوں کی تیز تر سانسوں پر مسلط ہے کہ ہوائیں اس کی گرفت میں ہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں
یرے دوست۔ سعید بن سعد نے کہا کہ ہر چیز وقت کی مٹھی میں قید ہے کہ وقت سمندروں کی موجوں کی سانسوں کا
سلسل سلسلہ ہے کہ وقت ہواؤں کے جسموں کی لگاتار حرکتوں کا سفر ہے کہ وقت سیاروں کی آنکھوں میں پوشیدہ تصویر
ہے کہ وقت موسموں کی تیز تر تمام تر آہٹوں کا چہرہ ہے کہ وقت پھولتی، سکڑتی اور اترتی چڑھتی ہوئی سانسوں کا آخری منظر
ہے کہ وقت متواتر، بے تکان اور بے سمت دوڑتے ہوئے ان گنت گھوڑوں کا نامکمل خواب ہے کہ وقت مسلسل اگتے اور
ٹوٹتے ہوئے درختوں کا گھنا جنگل ہے کہ وقت چکراتی، گھومتی اور غبار بنتی ہوئی ہواؤں کا بے قرار جسم ہے۔"

"ہاں میرے دوست۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ تم نے تو وقت پر خاصا وقت لگا دیا۔ لگتا ہے کہ تم نے وقت کو
بہت غور سے دیکھا، سمجھا اور پڑھا ہے۔

"ہاں میرے رفیق۔ ہم نے وقت کو دیکھ لیا ہے کہ ہم اس کی رفتار سے خوب واقف ہیں۔ سعید بن سعد نے
کہا۔ آج اور گزرے ہوئے کل کو دیکھو بلکہ ہر اس لمحے کو دیکھو جو آرہا ہے اور جا رہا ہے۔

"ٹھیک کہتے ہو کہ وقت ہی سب کچھ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ زندگی نے تمہیں کون کون سے راستے اور موڑ

دکھائیے۔ یعنی عمر کا اتنا لمبا عرصہ کیسا گزرا؟

"دنیا نے اپنا پاؤں ہمارے پاؤں پر رکھ دیا تھا۔ سعید بن سعد نے کہا۔ اور جب اس نے اپنا پاؤں ہمارے پاؤں سے اٹھالیا تو حالات بدل گئے کہ یہ دنیا جب بھی اپنا پاؤں کسی کے پاؤں پر رکھ دیتی ہے۔ وہ زمین ہو جاتا ہے اور جب اٹھالیتی ہے وہ آسمان ہو جاتا ہے کہ یہی اس کی تاریخ ہے۔ یہی اس کی فطرت اور یہی اس کا مزاج ہے۔" بچوں کا کیا حال ہے۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ تمہارے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟!

"اب بڑے ہو گئے ہیں۔ سعید بن سعد نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ اپنے سایوں سے لڑتے رہتے ہیں۔ پہلے ہماری انگلی تھام کر چلتے تھے۔ اب انگلی چھوڑ دی ہے۔ بے انتہا ہجوم میں بھی اکیلے اکیلے گھومتے ہیں...... بے پناہ ٹریفک میں بغیر خوف کے دوڑتے ہیں۔ پرانے درختوں کے سایوں پر دھوپ بچھاتے ہیں۔ بہر حال اب ہم پر ان کی انگلی تھام کر چلنے کا موسم آگیا ہے۔ لیکن وہ ہمیں اپنی انگلی پکڑنے ہی نہیں دیتے۔ بیچ راستوں پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے اندر مسلسل خوف پل رہا ہے.......... بڑھ رہا اور اس خوف اور ڈر کو لئے لئے ہم اپنے راستے پر پاؤں پاؤں چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ تمام راستے پتھروں سے اٹے ہوئے ہیں۔ زمین پریشان، ناہموار اور اونچی نیچی ہے گو کہ آنکھیں ابھی دیکھتی ہیں، سمجھتی اور محسوس کرتی ہیں لیکن احتیاط کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے اور بے بھروسہ پاؤں گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں اور پھر سنبھل کر چلنے لگتے ہیں کہ بڑھاپا شیر خوار ہو گیا ہے۔ بہر حال یہی ہماری زندگی کے شب و روز ہیں۔ حالانکہ اس عرصے میں دولت میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے مگر بہت ساری چیزیں کم ہو کر رہ گئی ہیں۔ کاش دولت کی جائے بہت سی دوسری اہم چیزوں میں اضافہ ہو جاتا ہے تو کم از کم اس عمر میں بچوں کی انگلیاں تو ہمیں مل جاتیں...... آپ کی مصروفیات تو خاصی بڑھ گئی ہوں گی۔ سعید بن سعد نے ہنستے ہوئے کہا۔ پہلے کچھ نہیں تھا تو مصروفیات نہ تھیں اب تو سب کچھ آگیا ہے۔

"ہاں! خالد بن عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گھروں کی دیواروں کو روغن کروانا' ان کی دیکھ بھال اور تحفظ کرنا۔ مختلف زمینوں سے آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا۔ ان کا پوری طرح خیال رکھنا۔ مختلف موسموں کا استقبال کرنا اور بھٹے ادھورے کاموں کو پورا کرنا۔ خدائے برتر کے آگے سربہ سجود ہونا۔ اس کے علاوہ اپنے بعض عزیزوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ناخن کٹوانا چنانچہ ایسے بہت سے کام ہیں جو سانسوں کی آمد و رفت کی طرح چلتے رہتے ہیں کہ بس یہی ہمارے صبح و شام ہیں اور انہی صبح و شام کے درمیان ہم گھوم رہے ہیں۔

"انہی مسائل کے درمیان تو ساری زمین اور ساری قوم گھوم رہی ہے کہ اب مسائل، حالات اور تمام موسم اندھے آئینے کی طرح ہو کر رہ گئے ہیں کہ اب اس میں کچھ نظر آتا ہی نہیں۔ سعید بن سعد نے کہا...... ابھی ابھی جو ایک آدمی یہاں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں یوں لگا کہ وہ کچھ سہما سہما، ڈرا ڈرا سا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی بدک رہا

ہے۔ اندر اور باہر سے غریب ہو گیا ہے کچھ یوں لگتا ہے کہ اندر سے کوئی چیز اسے پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ روک رہی ہے، لگتا ہے کہ اسے اپنے کمتر ہونے کا شدید احساس ہے۔ زندگی سے فرار ہو جانے کی کوشش اور گر کر ٹوٹ جانے والے کھلونے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے۔

"یہ ایک صومالی ملازم ہے میرے بھائی۔ بڑا خوف زدہ رہتا ہے اور اس کے اندر ہی اندر یہ خوف مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ خالد بن عزیز کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور پھر ان کی انگلی کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا تو سعید بن سعد نے خوف کے مارے اپنے دونوں پاؤں کرسی کے اوپر رکھ لئے اور بھیگے ہوئے آدمی کی طرح تھر تھر کانپنے لگا تو خالد بن عزیز نے محبت آمیز نگاہوں سے چیتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈرو نہیں میرے دوست یہ کچھ نہیں کرے گا۔ پالتو ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بہت بے ضرر ہے، ہمارے گھر کے تقریباً سبھی افراد اس سے بڑی محبت کرتے ہیں اور ہمارا بھی یہ بڑا خیال رکھتا ہے۔ بہت دیکھ بھال کرتا ہے ہمارے اس گھر کی۔

"ہمیں تو بڑا ڈر لگ رہا ہے بھائی۔ اسے دور ہٹائیے۔ سعید بن سعد نے کہا۔ دیکھئے آپ کی انگلی پر لگی تازہ خراش کو وہ کس طرح اپنی زبان سے چاٹ رہا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اس کا اس طرح آزادانہ گھر میں گھومنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کب ...... آپ اسے یہاں سے ہٹائیے یا پھر اس کے گلے میں زنجیر ڈال دیجئے۔

...... آپ بے کار خوف کھا رہے ہیں۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ ہم نے کہا نا کہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ بہت سمجھدار اور بڑا مخلص ہے۔ اور پھر اپنے گلے میں وہ کسی بھی زنجیر کو برداشت نہیں کرتا کہ زنجیر کو وہ غلامی سمجھتا ہے۔

"کیا یہ یوں ہی سارے گھر میں آزادانہ گھومتا پھرتا ہے؟ سعید بن سعد نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ کیا آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟!

"نہیں میرے دوست۔ یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ آپ بے فکر بیٹھیں۔

"ہوں! سعید بن سعد نے سانس کو آہستہ سے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کا یہ پالتو چیتا روز آپ کا کتنا گوشت کھاتا ہے۔ یعنی میری مراد ہے کہ کیا چیتے کی خوراک میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنی مقرر خوراک پر ہی اکتفا کرتا ہے؟!

"اکثر اپنی روزمرہ کی خوراک ہی پر اکتفا کرتا ہے"۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ ویسے کبھی کبھی زیادہ گوشت بھی کھا لیتا ہے۔ مگر ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے۔ لیکن میرے عزیز آپ اس چیتے سے اس قدر خائف کیوں ہیں کہ ابھی تک کانپ رہے ہو۔ کوئی دوسری باتیں کرو کہ اس چیتے کے سوا اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد ملے ہو۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے گھر کی باتیں کرو۔ اس بیچارے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ یہ اب ہمارے گھر کا ایک فرد بن چکا ہے یعنی ہمارا اپنا ہو گیا ہے۔ اور پھر ہمیں دیکھ کر بہت سے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں میں اپنی اپنی حفاظت کے لئے چیتا پال رہے ہیں اور کچھ پال لینے کی سوچ رہے ہیں۔

"لیکن مجھے تو اس سے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں کہ جب سے میں اسے آپ کے اس عظیم گھر میں اس طرح آزادانہ گھومتے ہوئے دیکھ رہا ہوں...... میرے تو ہوش اڑ گئے ہیں۔ دیکھئے وہ مجھے کس قدر خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے لگتا ہے کہ موقع ملتے ہی کھا جائے گا۔ اب مجھے تو اجازت دید یجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ زندگی باقی رہی تو پھر آپ سے ملاقات ہو گی۔ ویسے میں آپ کے اس شاندار مکان کو دیکھنے کا ایک عرصے سے آرزو مند تھا۔ بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا اور آپ کو دیکھنے کا۔ سو، دیکھ لیا۔ مل لیا۔

"نہیں میرے عزیز تم ڈرو نہیں۔ کہا نا کہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ خالد بن عزیز نے چیتے کی پیٹھ اور گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ دیکھو ہمارے ہاتھوں کو وہ کس طرح مسلسل چاٹ رہا ہے۔ ویسے کبھی کبھی غرانے بھی لگتا ہے۔ مگر اس کی غراہٹ میں محبت شامل ہوتی ہے۔

"میری آپ سے گزارش ہے۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی آپ یہاں سے ہٹائیے۔ سعید بن سعد نے کہا۔ دیکھئے وہ مجھے پھر گھور رہا ہے۔

"پھر وہی بات۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ میرے دوست بچپن میں تم کس قدر نڈر تھے اور اب آخری عمر میں اس قدر خوفزدہ کیوں ہو گئے۔ ہم نے کہا نا کہ یہ ہمارے گھر کا محافظ ہے۔ ہمارے گھر کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے اور ہم نے بڑی جی جان سے اس کی پرورش کی ہے اور کر رہے ہیں کہ اس کی ہر بات کا خیال رکھتے ہیں...... ڈرو نہیں اطمینان سے بیٹھو اور سکون سے باتیں کرو کہ تم ہمارے بہت عزیز دوست ہو۔

"آپ روز اس چیتے کو کتنا گوشت کھلاتے ہیں۔ سعید بن سعد نے کہا۔"

"بہت گوشت کھاتا ہے۔ خالد بن عزیز نے چیتے کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔"

"کیا آپ اسے خون آلود گوشت کھلا رہے ہیں یا بغیر خون کا۔ یعنی دھویا ہوا گوشت؟ سعد بن سعد نے چیتے کی لپلپاتی ہوئی زبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ویسے دنیا کے بہت سے ملک اس چیتے کے ویٹرنے ہوئے ہیں اور بہت سے کچے گوشت کے خون آلود ٹکڑے بنے اس کے ٹیبل پر رکھے ہوئے ہیں......

......"بغیر خون کا"۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

"کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپ کی خراش لگی انگلی کو مسلسل چاٹ رہا ہے۔ سعید بن سعد نے کہا اور یہ خراش شاید کچھ عرصہ پہلے آپ کے ایک عزیز کی وجہ سے آئی ہے۔"

"ہاں! خالد بن عزیز نے کہا۔ ہمارے زخم کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس لئے چاٹ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور جانور ہمارے اس مکان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ لے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ اور پھر آج کل زمین پر کتے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے شیر اور چیتے پالنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"میں نے راستے میں یعنی ہماری زمینوں کے بیچ ایک ایسی قوم دیکھی جو ڈھلتی دھوپ میں اپنی پرچھائیوں پر کوڑے مار رہی تھی۔ سعید بن سعد نے کہا۔ لگتا ہے وہ اپنے سائیوں سے ڈرتی ہے۔

"ہاں میرے دوست"۔ خالد بن عزیز نے کہا وہ شروع ہی سے بڑی بے اختیار قوم ہے۔ اس قوم کو خود پر اختیار ہے اور نہ اپنے پیدا کرنے والے پر بھروسہ ہے کہ وہ صدیوں سے ایک بے اعتبار اور ناشکری قوم ہے اور مسلسل ہماری زمینوں پر اپنے خواب دیکھتی ہے۔ خوابوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری زمینوں کے خوابوں کو جلانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ ہر زمین کی نسلوں اور سرسبز خوابوں کو آگ لگاتی ہے اور جب خواب جلنے لگتے ہیں تو وہ جشن مناتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسروں کے سروں پر نیندیں بچھاتی ہے کہ یہی اس قوم کا کاروبار ہے۔ آج سے تین دہے قبل اس قوم نے ہمارے گھر میں بھی داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ہم نے ایک روبوٹ (Robot) کو اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن وہ بڑا کمزور تھا۔ سو، ہم نے اس بے کار Robot کو باہر نکال دیا۔ اب حال ہی میں اس روبوٹ کے تمام اعضاء بکھر گئے ہیں کہ اس کا بکھر جانا ہی بہتر تھا کہ مصنوعی جسم بھلا کب تک باقی رہ سکتا ہے سو ٹوٹ گیا اور ایسا ٹوٹا کہ اس کے پرزے پرزے الگ ہو گئے۔

"دیکھئے کہ آپ کا چیتا پھر مری طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھ کر اپنے اندر ہی اندر غرا رہا ہے۔ سعید بن سعد نے کہا۔ کیا بھوکا ہے؟

"نہیں! خالد بن عزیز نے کہا۔ اسے بڑی پابندی سے غذا دی جاتی ہے۔"

"اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ سعید بن سعد نے اٹھتے ہوئے کہا"۔ اپنا گھر چھوڑے مجھ پر تین دن اور تین راتیں گزر چکی ہیں اور اب اپنے گھر کی دیواریں مجھے آواز دے رہی ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی میرے دوست۔

خدا حافظ!

اللہ حافظ!

اور سعید بن سعد سفر کے بعد جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو چیتے کی خونخوار آنکھیں ہنوز اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ چنانچہ اسی رات سعید بن سعد نے خواب میں دیکھا کہ خالد بن عزیز اپنی خواب گاہ میں خالی ہاتھ اور اکیلے لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے سینے پر وہی چیتا بیٹھا ہوا غرا رہا ہے !!!

مظفر الزماں خان: سکونت: حیدرآباد - آندھرا پردیش (بھارت)

چشم دید مجرم

حسن جمال　　　　　　　　　　　　　　　　　　　کہانی

ایسا نہیں ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی غلطی نہ کی ہو- ایسا بھی نہیں ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو مادر زاد حالت میں نہ دیکھا ہو- اسے چھوایا چکھا تک نہ ہو- میں کوئی پارسا یا پاکباز آدمی نہیں ہوں- میری کوشش یہی رہتی ہے کہ میں ایسا نظر آؤں- ہم ساری زندگی کوشش ہی تو کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں ایسا بننا چاہئے- لیکن بننے اور ہونے کے درمیان ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے- جو ہونا ہوتا ہے وہ بس ہو جاتا ہے- جو بننا ہوتا ہے وہ بن نہیں پاتا اور اس کش مکش میں زندگی گزر جاتی ہے-

موقع واردات پر میرا موجود ہونا اس ہونے کی وجہ سے ممکن ہوا- ورنہ اس شہر میں لاکھوں افراد ہیں' وہ کیوں نہ ہوئے؟ اس معاملے میں میرا کوئی Excuse نہیں ہے- وہ چھ تھے- ساتواں میں ہو سکتا تھا مگر عین وقت پر مجھے لگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے- آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ڈر گیا تھا- میری ہمت جواب دے گئی تھی' جو لوگ بزدل ہوتے ہیں وہ وہی سب سے زیادہ اخلاقیات کی دہائی دیتے ہیں- لیکن میں کیسے مان لوں کہ میں بزدل تھا!--- اس سے قبل بھی میں ایسے کھیلوں میں شریک ہو چکا تھا- اگر میں اس کھیل کا کھلاڑی ہوتا تو اس برستی دوپہر میں اس ہاسٹل میں جاتا ہی کیوں؟ رندھیر نے اتنا ہی تو کہا تھا "ایک چڑیا پھانسی ہے، پہلے آؤ"

میں جب گھر سے نکل رہا تھا تو میری چھوٹی بہن نے پوچھا تھا- کس کا فون تھا؟ میں دیر تلک اس کا چہرہ تکتا رہ گیا تھا اور پھر چپ چاپ زینے سے اتر گیا تھا- کیا پتہ' میری بہن ہی ہاسٹل تک میرے ساتھ چلی آئی ہو!- اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا تھا-

میرے چھ یار وہاں موجود تھے- ہاسٹل کی راہ داریوں میں ہو کا عالم تھا- بیشتر لڑکے پکنک پر جا چکے تھے' یا سینماؤں کا رخ کر چکے تھے کیونکہ زیادہ تر کمروں پر تالے لٹکے ہوئے تھے جو کمرہ نمبر بتایا گیا تھا' اس کا دروازہ نیم وا تھا-

مَیں نے دروازہ دھیرے سے دھکیلا- اندر گھمسان مچا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی چیخیں زخمی پریوں کی مانند کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھی- لڑکی بالکل مادر زاد- منوج کے بدن پر صرف بنیان- ہاں' وہ منوج ہی تھا- میں اس کی پشت سے اچھی طرح واقف ہوں- کشادہ شانوں سے اترتی ہوئی چیتے کی طرح اس کی پتلی کمر اور دو سخت فٹ بال- کسی مشین کی طرح تیز حرکت کرتے ہوئے اور لڑکی کی صاف شفاف

ٹانگیں۔روشن ٹیوب لائٹ کی طرح اوپر اٹھی ہوئی بس اتنا ہی دیکھ پایا اور میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔جیسے کوئی نوعمر لڑکا اپنے بزرگوں کو نازیبا حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر گھبرا جائے۔

قاعدے سے مجھے اس وقت جلد حاصل ہونے والی لذتوں کا خیال کر کے خوشی سے جھوم اٹھنا چاہئے تھا لیکن آج بالکل الٹا ہوا۔مجھے لگا کہ یہ مناسب نہیں ہے۔میرا سوچنا ایسا ہی تھا جیسا ایک چور سوچنے لگے کہ چوری چکاری اچھا کام نہیں ہے۔اس گھماسان میں لمحہ بھر کو میری نگاہ اس لڑکی کی آنکھوں پر جا ٹھہری تھی۔بس اب نہیں بتا سکتا کہ اس میں کس طرح کی التجا تھی یا مجھے بھی منوج کا دوست سمجھ کر نفرت سے مجھے دیکھا تھا۔اتنا البتہ یاد ہے کہ اس سے نگاہ ملتے ہی میں کانپ گیا تھا۔جانے کیوں؟

پاس والا کمرہ بھی ادھ کھلا تھا۔میرے داخل ہوتے ہی سب کی باچھیں کھل گئیں۔سب آہنی چارپائی پر گھبرائے سے بیٹھے تھے اور شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاس ان کے ہاتھوں میں تھے ان کی سرخ آنکھیں شیطانی مسکراہٹ سے چمک رہی تھیں۔میرے لئے جگہ بناتے ہوئے رندھیر بولا۔"آبیٹھ 'منو مہاراج (منوج) نے بڑی دیر لگا دی۔تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔پنڈت" ایک پیگ اس کے لئے بھی بنا یار۔تھوڑا جگر اس کا بھی کھل جائے!

کھڑکی میں رکھی وہسکی کی بوتل آدھی سے زیادہ کالی ہو چکی تھی۔بوتل کے پاس ہی 'مستی کا پیکٹ کھلا پڑا تھا۔جب سے "ایڈز" کی وبا پھیلی ہے' کوئی جوکھم اٹھانا نہیں چاہتا۔مگر بہ ظاہر یہی کہتے تھے کہ ہم لڑکی کے مستقبل کو تباہ و برباد نہیں کرنا چاہتے۔ہم اپنے خوف و حراس کو "سیف گیم" کے لبادے سے ڈھانپ دیتے تھے۔شادی کے پہلے کا یہ "ایڈوانچر" ہمیں در حقیقت کبھی دلیر نہ بنا سکا۔ہم دراصل بہت خوفزدہ اور سہمے ہوئے لوگ تھے۔اپنے بزرگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ذرا دیر کے لئے زندگی کا مزا چرانے کو ہی اپنی کامیابی مانتے تھے۔آگے تو گھپ اندھیرا تھا۔

میں نے پیگ نہیں لیا۔میں عجیب کشمکش میں تھا۔آج سے پہلے مجھے میرے یار اتنے بیگانے کبھی نہ لگے تھے۔مجھے لگا' میں غلط جگہ آگیا ہوں اور اجنبی لوگوں کے درمیان میں ہوں۔

فقط اتنا ہی رول تھا میرا۔رات نیند میں جانے سے پہلے تک مجھے افسوس ہوتا رہا کہ میں نے بہتی گنگا میں ہاتھ کیوں نہ دھوئے؟ عین وقت پر میں بزدل کیسے بن گیا؟ مجھے اپنی کمزوریوں پر قابو پانا چاہئے۔مجھے کم از کم اس قدر مضبوط بن جانا چاہئے کہ دوستوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔میں نے اپنے آپ کو Stupid اور بزدل بھی کہا۔

صبح اٹھا تو ہنگامہ میرے سر پر تھا۔تمام اخبارات زنا بالجبر کی خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ایک

معمولی سا روٹین کھیل ایک طوفان کی شکل اختیار کرے گا ایسا تو کسی کے گمان میں نہ تھا۔ Just For Fun میں امکانی خطرے کے خوف سے کانپنے لگا۔ میرے گھر والوں نے مجھے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ میرے بے وجہ کانپنے کی وجہ دریافت کرتے میں بخار میں گرفتار ہو چکا تھا اور اسی حالت میں پولیس مجھے لے گئی تھی۔

لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ سات تھے۔ وہ چھنوں تو جانے کہاں روپوش ہو گئے تھے اور ساتواں میں' بغیر زیادہ تلاش کے پولیس کی گرفت میں تھا۔ تھرڈ ڈگری کا نام میں نے بہت سن رکھا تھا مگر جب اس سے واسطہ پڑا تو میرے ہوش خطا ہو گئے۔ میں زرد پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میری پتلون گیلی ہو چکی تھی اور میرے دماغ نے کچھ سوچنے کہنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری گڑگڑاہٹ بے معنی تھی۔

قانوناً مجرم میں تھا کیونکہ میں موقع واردات پر موجود تھا۔ دس لاکھ کی آبادی والے شہر میں صرف میں ہی کیوں موجود تھا؟ جب کہ چوکیدار' وارڈن اور دوسرے تمام لڑکے ناموجود تھے۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اب عدالت طے کرے گی کہ میں بے قصور تھا یا مجرم؟ ایک بار گرفت میں آ جاؤ پھر قانون اپنا کام کرے گا۔ کرتا رہے گا۔ بعد میں خواہ آپ بری ہو جاؤ' لیکن تفتیش اور تحقیق کے دوران آپ پر جو گزر جاتی ہے' اسے آپ مرتے دم تک بھول نہیں سکتے۔ یہی قانون کا انصاف ہے۔ قانون آپ کا بہت کچھ چھین سکتا ہے' لوٹا نہیں سکتا' کیونکہ وہ لوٹانے کے لائق ہے ہی نہیں۔ سب کچھ تو پولیس کی مٹھی میں ہے۔ چاہے تو آپ کو دس بیس دفعات لگا کر سلاخوں کے پیچھے کر دے یا پھر آپ کی جان بخشی کر کے آزادانہ گھومنے کی اجازت۔ قانون صرف کاغذ کالے کرنا جانتا ہے۔ سطحی طور پر نظر آتا ہے کہ عدلیہ ابھی مکمل طور پر لاغر نہیں ہوئی ہے۔ مگر جو لوگ فیصلے صادر فرماتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کتنے مجبور اور بے کس ہیں۔ ان کی ساری طاقت تو جھوٹ کے پلندوں سے سچ کی تلاش کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اتنی مشقت کے بعد کوئی بھی دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے حقیقت کو تلاش کر لیا ہے۔ جو حقیقت نکل کر آتی ہے وہ محض کاغذ کی ہوتی ہے!

معاف کیجئے گا' میں ذرا بھٹک گیا ہوں۔ میں تو ایک مجرم ہوں۔ چشم دید مجرم! مجھے یہ سب سوچنے اور کہنے کا حق نہیں ہے' حق تو انہیں بھی نہیں ہے جو آزادانہ طور پہ غور و فکر و بے خوف اپنی آواز بلند کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی آواز کا اثر بھلے ہوتا ہو' اکثر تو ریگستان کی گونج بن کر رہ جاتی ہے۔

سپریم کورٹ کی ہدایات کے باوجود مجھے اس اندھیرے غار سے گزرنا پڑا جہاں ہرے کاغذوں کی

ہوا نہ لگے تو آدمی دم گھٹنے سے مر جائے - میں نہیں کہہ سکتا کہ اندھے غار سے باہر نکالنے میں کس کا رول نمایاں رہا؟ پولیس کا جس سے رحم دلی کی توقع کرنا ہی فضول تھا' یا میرے گھر والوں کا جن کی میری طرح کوئی حیثیت نہیں تھی' نہ رسائی نہ پیسہ! یا پھر اس لڑکی کا جو جانتی تھی کہ میں بے قصور تھا - اس نے ساتویں کے طور پر مجھے پہچان لیا تھا اور میری بے گناہی کی شہادت بھی دے دی تھی - مگر اس نے I.O (آئی او) کے سامنے ایک سوال کیا تھا جس کا جواب آج بھی میرے پاس نہیں ہے -

"اس نے مجھے بچایا کیوں نہیں؟"

لڑکی کا سوال بہت واجب تھا اور میرے پاس کوئی مدلل جواب نہ تھا - میں اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں خود راں ٹپکا تا وہاں آیا تھا - آج اپنے دماغ میں مجھے خود کو Innocent کہنا پڑ رہا ہے میرا دل جانتا ہے کہ میں کتنا Innocent تھا؟ یا ہوں! جب آدمی خود اپنے بچاؤ میں لگا ہو تو وہ دوسروں کو کیسے بچائے گا؟ ویسے بھی وہ چھ تھے - میں تو خیر Out Sider تھا لیکن ہوسٹل کے چوکیدار کو کیا ہوا تھا؟ وہ تو چوراہے کی تھڑی پر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا اور وارڈن اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ پکنک پر گیا ہوا تھا اور پرنسپل صاحب سیاست کے نقطے تلاش کر رہے تھے - ویسے بھی میں کیا کر سکتا تھا! ہزاروں ظلم شب و روز میرے سامنے ہوتے ہیں - ناانصافیوں اور حماقتوں کا ننگا ناچ رات دن میں دیکھنے کے لئے مجبور ہوں - افسوس اس بات کا کہ میں اس میں شریک کیوں نہیں! ایک ساڑھے پانچ فٹ گوشت کا تودہ جسے ہر حالت میں زیر ہونا ہے - خاوند کے ہاتھوں یا شکاری دوستوں کے ہاتھوں! بعد میں میں نے یہ بھی سنا کہ رندھیر سے اس کے مراسم پہلے سے چلے آ رہے تھے - اس روز کچھ زیادتی ہوگئی تھی دوستوں کا بھلا کرنے کی "یاری" اسے لے ڈوبی تھی - بڑا لیڈر بنا پھرتا تھا - خود بھی مرا اور دوسروں کو بھی لے ڈوبا -

پولیس ان روپوش مجرموں کو نکالنے میں خوب ہاتھ پاؤں مار رہی تھی - مجھے بھی ان سب ٹھکانوں پہ لے جایا گیا جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا - مگر وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے - بس ان کے نام باقی رہ گئے تھے جو اخباروں' گھروں یا بازاروں یا دفتروں اور اسمبلی میں گونج رہے تھے - دیکھتے ہی دیکھتے نیم خوابیدہ عظمتیں جاگ اٹھی تھیں - مخالفت اور احتجاج کا ایسا شور برپا ہوا کہ ذرا دیر کے لئے بقیہ Issue دب گئے - پولیس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میرے "ساتھی" نہیں پکڑے گئے تو وہ مجھے مجرم بنانے میں ہچکچائے گی نہیں - چیف منسٹر اور ہوم منسٹر نے اعلیٰ افسران کی ناک میں دم کر رکھا تھا - یہ حکومت کی Credit کا سوال تھا - ایک لڑکی کے ساتھ اس پاکیزہ جگہ پر زنا بالجبر ہوا اور ایک بھی ملزم گرفتار نہیں کیا جا سکا - شیم! شیم!!

سب سے پہلے ببتا کی گرفتاری عمل میں آئی- پھر منوج کی- آہستہ آہستہ۔ راجہ 'اور پرجا' کو یقین ہونے لگا کہ دو گرفتار ہوئے ہیں تو بقیہ پانچ بھی دیر سویر گرفت میں آئیں گے- آخر پولیس کے ہاتھ لمبے ہیں! بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ ایسے زناکاروں کو چوراہے پر پھانسی دے دینی چاہئے تاکہ دوسرے بد معاشوں کو عبرت حاصل ہو- لیکن قانون تو اپنے حساب سے کام کرتا ہے- اسے لوگوں کے جذبات سے کیا لینا دینا! سلسلہ طویل ہو گیا- اخباروں میں اس واردات کا چرچا کم سے کم تر ہوتا چلا گیا- کبھی کبھی چار پانچ سطر کی تفتیشی خبر شائع ہو جاتی یا پھر پولیس کی کارکردگی کا رونا رویا جاتا کہ وہ ملزموں کو بچانے کی سازش میں شامل ہے- اس پر مبینہ بڑے لوگوں کا دباؤ ہے- اخباروں میں Statement خواہ Straight Forward ہوں یا Under Current چھانے کی کوششیں چلتی رہتی ہیں اس لئے مجرم مقابل کھڑا ہو تو بھی پولیس کو نظر نہیں آتا- رندھیر کسی لیڈر کا سالا تھا- سالے پر آنچ آئے ایسا وہ کبھی نہ چاہیں گے- ان کے فارم ہاؤس پر چھاپا مارنے کی حماقت پولیس نہیں کر سکتی- کیا پتہ 'یہی لیڈر کل منتری سنتری بن جائے- پچھلی سرکار میں تھے بھی- لڑکی کو انصاف دلانا ایک بات ہے اور اپنے آپ کو انصاف دلانا دوسری بات اگر لوگوں کی باتوں پر جائیں گے تو ہو چکی پھر تفتیش! ہم یوں ہی پولیس میں نہیں آئے ہیں- بہتوں کو خوش کرنا پڑتا ہے- بہتوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے- یہ تو ہمارا روز مرہ کا کام ہے-

رندھیر کے علاوہ بقیہ تین بھی جلد پکڑ میں آ گئے- تفتیش کی رفتار بڑھ چکی تھی- پولیس کی تفتیش سے معاملہ یہ بنا کہ دراصل وہ پانچ ہی تھے- لڑکی کا حساب کمزور تھا- روندے جا رہے شخص کو اتنا ہوش کہاں رہتا ہے کہ وہ شمار یاد رکھے- کل اگر وہ دس تک گنتی کرے تو ہم کہاں تلاش کرتے پھریں گے! اگر کچھ زیادہ ہی احتجاج ہوا تو بقیہ چارج شیٹ اور پیش کر دی جائے گی فی الحال تو اس کیس سے نجات پائی جائے-

ملزمان کے خلاف چارج شیٹ پیش ہونے کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا کہ بلا ٹلی لیکن یہ میری خوش گمانی تھی- اب میرے سر پر زیادہ بڑی بلائیں منڈلا رہی تھیں-

میں چشم دید گواہ تھا اور یہی میرا سب سے بڑا جرم ثابت ہوا- کل تک جو میرے دوست تھے' آج وہ میرے ساتھ دشمنوں سے بھی برا سلوک کر رہے تھے- وہ گھات میں تھے اور میں بچاؤ میں- میں اتنا دہشت زدہ تو پولیس کسٹڈی میں بھی نہ تھا-

مجھے مسلسل دھمکیاں ملنے لگیں کہ اگر میں نے دوستوں کے خلاف شہادت دی تو میرا جو حشر ہو سکتا ہے 'وہ ہوگا- یہ جانتے ہوئے بھی ایسے معاملوں میں لڑکی کی شہادت اہم ہوتی ہے' وہ چشم دید گواہ تو توڑنا چاہتے تھے- یہ ایک ایسی دہشت تھی جس سے میرا کبھی سابقہ نہ پڑا تھا- میں گھبرائے ہوئے میمنے کی طرح

کبھی اس عزیز کبھی اس رشتے دار کے ہاں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گیا اور ان کی آنکھیں Big Brother کی طرح ہر وقت میرے تعاقب میں تھیں۔

میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کبھی بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ میری زندگی اب دوستوں کے رحم و کرم پر ہے۔ انہیں اپنی زندگی عزیز ہے۔ مجھے اپنی۔ کتے بلی کا یہ کھیل کون جانے کب تک جاری رہے گا۔؟

ابھی مقدمہ شروع ہی ہوا ہے۔ لڑکی مطمئن ہے کہ میرے بیان اس کے کیس کو مضبوط کردیں گے اور مجرموں کو سزا ضرور ملے گی۔ میں حیران و پریشان ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

حالانکہ پولیس نے ضمانت پر آزاد دو ملزموں کی ضمانت منسوخ کرنے کی درخواست پیش کردی ہے اور مجھے "محفوظ" رکھنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ لیکن دہشت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ میں خوف کی تاریک اور گہری سرنگ میں اترتا چلا جارہا ہوں۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ کہنے کے لئے زندگی حسب معمول رواں دواں ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرا جرم کیا ہے؟ موقعۂ واردات پر میرا موجود ہونا؟ کیا میرا چشم دید ہونا ہی میرا جرم ہے؟ لیکن یہ جرم صرف میں نے ہی نہیں کیا؟ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد اس کے گواہ ہیں۔ ان کے خلاف فرد جرم عائد کیوں نہیں ہوتا؟ چند برسوں بعد جب کروڑوں ملزمان سے دریافت کیا جائے گا کہ زنا کا ارتکاب ہورہا تھا تب وہ خاموش کیوں تھے اور نیرو کی طرح چین کی بنسی کیوں بجارہے تھے۔ وہ ایسا مقدمہ ہوگا جس کا کوئی ثانی نہ ہوگا۔ وہ دن دور نہیں ہے۔ میں غریب تو ناحق پھنس گیا۔

پرتھوی، غوری

کہانی

آغا گل

برف زار وادیوں میں سناٹوں کا راج تھا۔ درخت لرز رہے تھے، ٹھٹھرتے درخت آنے والی رات کے تصور سے ہی کانپے جا رہے تھے۔ رات قریب آ رہی تھی، چپکے چپکے، دبے پاؤں، بے جان سورج ساری تپش کھو چکا تھا۔ یخ بستہ ہوائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھیں۔ بار بار اس کھائی میں اتر آتیں' جہاں دونوں زخمی ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا خون منجمد سا ہونے لگا تھا۔ قیامت خیز سردی کے سبب زخموں سے خون صرف رس رہا تھا، جنہیں سرسری سا باندھا گیا تھا۔

نیم جاں پرتھوی کی نگاہیں سر دھوئی جا رہی تھیں، اس نے پھر للکارا "کچھ دیر میں ساتھی آ پہنچیں گے، پھر تمہاری لاش بھوکے بھیڑیوں کے لئے چھوڑ جاؤں گا۔ البتہ تمہارے زینک بطور یادگار ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے ڈرائنگ روم میں سجے رہیں گے۔ تم کسی طور تو زندہ ہو گے"۔ غوری کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری بائیں کندھے میں۔ اس نے چٹان سے کمر لگا رکھی تھی، انگلی ٹریگر پر تھی اور جی تھری کا رخ پرتھوی کی جانب تھا۔ وہ دونوں ہی برفانی طوفان میں بھٹک کر جانے کہاں سے کہاں آن پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے پر گولیاں برساتے رہے، پوزیشن بدل بدل کر۔

چٹانوں کی آڑ سے، درختوں کے عقب سے، جھاڑیوں کی اوٹ سے۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ پرتھوی نے یہ تاثر دینے کی سعی کی کہ اس کے ساتھ دیگر حملہ آور بھی ہیں۔ غوری کو اندازہ ہوا تھا کہ دشمن کو ایک گولی تو ضرور لگی ہے۔ کیونکہ اس نے پرتھوی کو چٹان کی آڑ میں جھٹکا کھاتے دیکھا تھا۔ جیسے سخت کرنٹ لگا ہو۔ جیسے جھنجھنا سا گیا ہو۔ پرتھوی برف پر گرا اور چٹان کی آڑ میں کھسک گیا مگر پوزیشن بدل کر برق رفتاری سے دائیں جانب کی چٹان پر نمودار ہوا اور فائر کھول دیا۔ غوری کٹے ہوئے درخت کی مانند برف پر آ رہا۔ پرتھوی برف پر پھسلتا، قلابازیاں کھاتا، لڑھکتا ہوا غوری کے سر پر آ پہنچا۔ اسی لمحے غوری سنبھلا، اس نے بندوق سیدھی کرنی چاہی مگر پرتھوی کی بندوق اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان نشانہ لے چکی تھی۔ پرتھوی کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے عین سامنے بیٹھ کر پوزیشن لے رکھی تھی۔ خون اس کے ہونٹوں سے جھلک رہا تھا۔ غوری کے ہاتھوں میں بندوق ساکت ہو گئی، موت بیرل سے جھانک رہی تھی۔ غوری نے باآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ پرتھوی کے چہرے پر

فاتحانہ مسکراہٹ تھی، چہرے پر زخموں کا اذیت ناک کھنچاؤ بھی تھا لیکن آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"کیا یاد کرو گے، ایک بار اور پڑھ لو"

اس بار غوری کے ہونٹوں کو محض جنبش سی ہوئی، آخری لمحوں میں وہ دشمن کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔

"تم آنکھیں بند کر سکتے ہو، میں تین تک گن کر گولی چلاؤں گا"۔ غوری کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "میں موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر سپاہی کے دل میں اسی ایک لمحے کی تو آرزو ہوا کرتی ہے"۔ پرتھوی نے ہنسنے کی کوشش کی تو منہ سے خون ابل آیا۔ "اچھا! پھر تو تم خوش قسمت ہو ایک، دو"۔ پرتھوی نے گنتی روک کر غوری کا چہرہ جانچا۔ غوری بدستور اسے گھورے جا رہا تھا۔

"تین" پرتھوی چلایا، اور ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔ ایک کلک سی گونجی، فائرنگ پن سر پٹخ پر رہ گئی۔ چیمبر خالی تھا۔ عین اسی لمحے غوری نے بندوق چھتالی۔ پرتھوی گھبرا کر کھسکتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کی کمر چٹان سے جا لگی۔ غوری نے فائر نہ کیا۔ وہ بھی کھسک کر چٹان سے جا لگا تقریباً بیس فٹ کے فاصلے سے، چٹانوں سے ٹیک لگائے وہ ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ سرد ہواؤں کا ڈریکولا ان کا خون چوس رہا تھا۔

"اس میگزین کے علاوہ بھی گولیاں ہیں، مگر میں تمہیں ماروں گا نہیں، قیدی بنا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارا نام اور رینک، اور کس یونٹ کے ہو۔"

"رینک نہیں بتاؤں گا، نہ ہی یونٹ، میرا نام ہے پرتھوی راج چوہان"۔ "تمہیں یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی کہ میرا نام غوری ہے۔ محمد غوری"۔ پرتھوی نے اسے غضبناک نظروں میں تاڑا۔ جیسے موقع پاتے ہی جھپٹ پڑے گا۔

"بہتر ہو گا کہ اپنے زخم باندھ لو، مگر چالاکی نہ دکھانا، ورنہ" غوری کی آواز میں دھمکی تھی۔ انہوں نے جیسے تیسے اپنے زخم باندھے اس عرصہ میں بھی دونوں ایک دوسرے پر چیتوں کی مانند نظریں جمائے رہے۔ وقت کے سرد ریلے گزرے جا رہے تھے، دونوں منجمد ہو رہے تھے، دھیرے دھیرے، آہستہ۔ بے جان، بے تمازت سورج، کھوکھلا سا لگ رہا تھا۔ جیسے غزنی کا سورج۔

برفانی بادلوں کے دل کے دل اترے چلے آ رہے تھے۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا، چوٹیوں کے درخت سرد ہواؤں سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔

دونوں اپنی اپنی پوزیشن میں مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ چبھتی ہوئی کینہ توز نظریں، دلوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی ہوائیں دم سادھ لیتیں، پھر یکلخت درختوں سے الجھنے لگتیں۔ سورج کی نظریں بجھنے کو تھیں، گہرے بادلوں کے سبب فضاء میں ملگجی سے روشنی بھری ہوئی تھی، جیسے جھٹپٹے کا عالم ہو۔

"پرتھوی! تمہارے پاس ماچس ہوگی؟"۔ غوری کا انداز جارحانہ تھا۔ پرتھوی نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ماچس نکالی اور پتھر کی طرح غوری کے منہ پر دے ماری، ہواؤں نے لپک کر غوری کی گود میں ماچس گرادی۔

"ہمیں لکڑیاں بھی جمع کرنا ہوں گی۔ میرا ساتھ دو"۔ پرتھوی نے قہر آلود نگاہ ڈالی اور پھر آس پاس سے لکڑیاں چننے لگا۔ لکڑیاں وہاں خاصی تھیں۔ مگر بہت گیلی تھیں، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر برف سے نکالنا پڑتا تھا۔ وہ دونوں زخموں سے چور تھے۔ ایک گولی پرتھوی کی ٹانگ میں پیوست اور دوسری پھیپھڑے کو کترتی ہوئی کہیں سینے میں چھپ گئی تھی، دونوں گرتے پڑتے، برف پر گھسیٹتے لکڑیاں جمع کرتے رہے۔ جھاڑیاں، ٹوٹی ہوئی شاخیں، شکستہ ٹہنیاں، رات بھر کا سامان جمع ہوگیا' غوری اپنی بندوق بیساکھی کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک بار وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہوگیا مگر جابجا بمشکل ستی سے سنبھل کر پرتھوی پر محتاط نظر ڈالی کہ حملہ نہ کردے۔ غوری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ تیلیاں محدود تھیں۔ چند ایک تیلیاں جھلملا کر بجھ گئیں تو وہ متوحش ہوگئے۔

"مجھے دو ماچس"۔ پرتھوی نے مطالبہ کیا۔

غوری نے ماچس اس کی جانب اچھال پھینکی۔ پرتھوی نے بمشکل تمام بٹوہ باہر نکالا، بٹوے میں سے نوٹ نکالے اور لکڑیوں کے نیچے بکھیر دیئے۔ شعلہ کوندا اور نوٹوں نے آگ پکڑ لیا۔ جھاڑیوں پر پڑی لکڑیاں چٹخنے لگیں، دھواں پھیلا اور حدت سی محسوس ہونے لگی، غوری کو معاً خیال آیا، اس نے بمشکل تمام جیکٹ کی جیب سے پلاسٹک کی بوتل نکالی اور سیاہی مائل سفوف لکڑیوں پر چٹکی بھر چھڑک دیا۔ آگ تیز ہوگئی، آگ کی زبان لپکنے لگی۔ موت کے خشک قدم تھم سے گئے۔ وہ دونوں آگ کے اور قریب آگئے۔ دونوں نیم جان ہو چکے تھے، کسی میں بھی حملے کی سکت نہ تھی' اس لئے الاؤ کے پاس وہ قدرے دوستانہ انداز میں آگ تاپتے رہے۔

پرتھوی کی گود میں خالی بٹوہ پڑا تھا، جس پر اس کی نظریں ٹھوکر کھانے لگتیں۔ کانپتی لو میں بٹوہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ "نوٹوں کے جلنے کا افسوس ہو رہا ہے"۔

"نہیں" پرتھوی بولا تو اس کے ہونٹ خون میں بھیگ سے گئے۔ "اس میں میری بیٹی کی تصویر ہے۔ اپنی ماتا کی گود میں بیٹھی ہے"۔ پھر اس کی نظریں بیوی کے چہرے میں ڈوب گئیں۔ "موہ، شردھا، سیوا، پوجا، بھگتی اور بلیدان" وہ اپنی بیوی سے ہم کلام ہوا۔ سے سسکیاں لینے لگا۔ رات سراسیمہ ہوگئی، الاؤ میں پرتھوی کی انا پگھلتی جا رہی تھی۔ دونوں کپتان لڑنے سے غافل ہو رہے تھے۔ "ہم جن نوٹوں کے لئے لڑتے ہیں، وہی ہم آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ انسان خود ہی کاغذ کے یہ رنگین ٹکڑے چھاپتا ہے اور خود ہی ان پر بک جاتا ہے۔ کیسا احمق ہے"۔ پرتھوی نے خود کلامی کے عالم میں تبصرہ کیا۔ غوری کے چہرے پر نیلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ "انسان دولت کے لئے نہیں عقیدے کی خاطر جان دیا کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ مضبوط ہوا کرتے ہیں جن کا کوئی عقیدہ ہو۔ ہمارے نبی

عقیدے مضبوط کرنے کے لئے ہی تو آئے تھے۔ عقیدہ یوں ہے جیسے مریض کو دوا پلا دینا، جیسے ناتواں کو بیساکھی کا سہارا دینا"۔ موت دھیرے دھیرے اتری چلی آرہی تھی' رات کے سائے میں دبے پاؤں جس کی دھمک ان کے چہروں پر محسوس ہو رہی تھی۔ سورج دم توڑ چکا تھا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے دلوں میں ناامیدیاں براج رہی تھیں جو کبھی کبھی رینگتی رینگتی آنکھوں سے جھانکنے لگتیں۔

"غوری! تم فائر کرو۔ شاید کوئی ہماری مدد کو پہنچ جائے"۔ غوری نے تامل کیا، اب کوئی چارہ بھی تو نہ تھا لیکن یوں تو وہ دشمن کے نرغے میں بھی آسکتا تھا لیکن کیا ہوا جو آگئے، چند ایک کو ساتھ لے کر تو مروں۔ یہ سوچ کر اس نے بندوق کا بٹ زمین پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے سے جنگل گونج اٹھا۔ انگارہ آسمانوں کو چیرتا ہوا نکل گیا مگر پھر وہی جنگل کا شور۔ ہوائیں بھیروں ناچ رہی تھیں۔ یم دیوتا سیاہ لباس سے میں ہمالیہ سے اتر آیا تھا۔ برفانی ہوائیں انہیں نوچ رہی تھیں۔ رگ و پے میں نشتر چبھو رہی تھیں۔ ہندہ کی طرح ان کا جگر چبا رہی تھیں۔ آگ سلگ رہی تھی، لکڑیاں چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھیں۔ "غوری میری بیٹی کو بتانا اس کا باپ ایک دلیر انسان تھا۔ اس نے دلیری سے جان دی۔ تم اس کے گواہ ہو"۔

"ظالم کو دلیر کہنا میرے لئے مشکل ہوگا۔ پرتھوی تم نے اسلحے کے زور پر اس وادی کو غلام بنا رکھا ہے۔ دلیری کسی اچھے کام کے لئے بھی تو ہو سکتی ہے۔ کیا دنیا کے سارے جلاد دلیر تھے۔ میں شاید اتنا جھوٹ نہ بول سکوں"۔

پرتھوی آگ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، جیسے وہ الاؤ کی حدت آنکھوں سے دل میں کشید کر لینا چاہتا ہوں۔ اس کا ذہن برفانی سلوں میں ڈوبتا رہا تھا۔ یادداشت کمزور پڑتی جارہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے دانت بجنے لگے۔ "میرے وطن کا مفاد میرا دھرم ہے"۔ پرتھوی نے سکوت توڑا۔ یہ تمہارے وطن کا مفاد نہیں پرتھوی، حکمرانوں کا مفاد ہے۔ حکومت اور وطن میں فرق ہے، تم وطن کے نہیں پرتھوی حکومت کے وفادار ہو۔ تمہاری حکومت میزائل بنا رہی ہے۔ اگنی میزائل، پرتھوی میزائل، ترائن کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ سنجوگتا کو پھر چتا پر بٹھانا چاہتے ہیں"۔

"غوری! میں خاصہ زخمی ہوں، اب کیا تم اپنی زبان سے بھی مجھے زخمی کرنا چاہتے ہو"۔ "نہیں پرتھوی میں تمہارے اندر کے راجپوت کو جگانا چاہتا ہوں۔ جو کمزوروں، نہتوں اور سوئے ہوؤں پر وار کرنا پاپ سمجھتا ہے۔ تم ان نہتوں پر کیوں گولیاں چلا رہے ہو"۔

"کیونکہ یہ وادی ہماری ہے"۔

"زمین انسان کی نہیں ہوتی، انسان زمین کے ہیں"۔

پرتھوی نے چند اور لکڑیاں الاؤ میں سجا دیں۔ "تمہاری بچی جیسی سیکڑوں بچیاں یتیم ہو جائیں گی۔ تمہارے

لوگ بھوکے ہیں، انہیں بارود نہ دو اناج دو۔ ان کے پیٹ کاٹ کر تم میزائل مار رہے ہو۔ شہر اجاڑنے کے لئے، دھرتی کی کوکھ بانجھ کرنے کے لئے"۔

اچانک برفباری ہونے لگی۔ اندھیر امڈھ گیا۔ برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں نے ہواؤں کے لشکر وادیوں میں اتار دیئے۔ الاؤ ٹمٹمایا وقت تھم گیا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔ کتنے دن کتنے ماہ کتنے سال بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں دم توڑتے ہوئے الاؤ پر تھیں۔ امید کی ایک کرن اسی اندھیرے میں جگمگا رہی تھی کہ رات بھر الاؤ جلتا رہے اور صبح دم انہیں مدد مل جائے۔ امید کی حدت نے انہیں اب تک بچائے رکھا تھا لیکن ہر آنے والے لمحے میں ان کا خون سرد ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں کے دوش پر ہلکی اور باریک آوازیں ابھریں۔ دونوں متوجہ ہو گئے۔ پھر یہ آوازیں بلند اور گھمبیر ہونے لگیں۔ ایسی وحشت ناک جیسے اندھیری رات ویرانوں میں روتی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہو جسے اس قیامت خیز سردی سے بچنے کی راہ نہ مل رہی ہو۔

"پرتھوی! اندھیرا، ٹھنڈک، تنہائی اور نفرت انسانی روح کو کمزور کر دیتی ہے۔ آگ کو تیز کرو اور دل میں محبت پیدا کرو۔ ہم بھیڑیوں کے نرغے میں آ رہے ہیں"۔

پرتھوی نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی جس سے اس کے دانت بجنے لگے۔ "بہت دیر سے خنجر تمہارے سینے میں اتارنے کے لئے چھپا رکھا تھا، اس سے بھیڑیئے ہلاک کروں گا"۔ پرتھوی نے الاؤ تیز کر دیا۔ کچھ لکڑیاں غوری نے بھی پھینکیں۔ وہ دونوں زخموں سے چور تھے۔ جیسے تیسے حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔

"سفید بھیڑیئے دندناتے پھرتے ہیں، سو برس قبل یہ محض چند ہزار تھے، ان کی تعداد کبھی بھی دس ہزار سے زیادہ نہ ہوئی مگر یہ کروڑوں انسانوں کا خون پیتے چلے آئے ہیں۔ سارے وسائل ان کے قبضے میں ہیں"۔

لرزتی آگ پرتھوی کے چہرے پر سائے بن رہی تھی۔ دانتوں سے بھوک ٹپک رہی تھی پر تھوی ان کی زد میں تھا، بچے تلے قدم اٹھاتے وہ پہلے پرتھوی کی جانب بڑھے۔

"گولی چلاؤ، فائر کرو، پرتھوی پکارا"

شست باندھے غوری ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ بھیڑیوں کی نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ اس کی بندوق جنبش کر رہی تھی۔ مگر اس نے فائر روک رکھا تھا۔ سردی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی رہی۔

بھیڑیئے اب ایک جست کی دوری پر بھی رہ گئے تھے۔ "گولی چلاؤ، فائر کرو، یا بندوق مجھے دے دو، یا تم پاگل ہو گئے ہو"۔ پھر ایک مشترکہ غراہٹ کے ساتھ بھیڑیئے پرتھوی پر ٹوٹ پڑے، پرتھوی نے خنجر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

"جے ماں کالی" فلک شگاف نعرہ بلند ہوا، جونہی بھیڑیا جھپٹا پرتھوی نے خنجر دونوں ہاتھوں سے سینے میں اتار

دیا، مگر بھیڑیئے کا وزن نہ سہار سکا اور بھیڑیئے سمت زمین پر آرہا وہ بھیڑیئے کے نیچے دب گیا۔ فضاء میں بلند ہونے والے چار پانچ بھیڑیئے زمین پر گرنے سے پہلے ہی چھلنی ہو چلے تھے جنگل دھماکوں سے گونج اٹھا۔ چھے بھیڑیئے خون میں غلطاں پڑے تھے۔ باقی غول چیختا چلاتا بھاگ نکلا۔ سنسان وادیوں کی جانب جہاں برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔

"میں دراصل ان بھیڑیوں کو اپنے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ ان کے جسم گرم ہیں۔ ان کی کھالیں بچاؤ کا سامان کریں گی۔ ان کا خون ان کی گرمی پہلی بار ہم اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اب لوپس انسانوں کے کام آئیں گے"۔ شعلے بھڑکتے تو اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ پھر وہی ازلی و ابدی اندھیرا "اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا"۔ اچانک دم توڑتا الاؤ بجھ گیا، کچھ سسکتے کوئلے دھوئیں میں جی رہے تھے۔

"انسانوں میں بھی بھیڑیئے کی روح گھس جاتی ہے۔ انسانی روح شکست کھا کر مغلوب ہو جاتی ہے۔ ان عفریت صفت انسانوں کی شکلیں انسانوں جیسی ہی رہتی ہیں۔ دراصل وہ بھیڑیئے ہیں۔

ولوا، وپس، ولف، وے جائینا، جنسی جنون، وحشی پن، حیوانیت، یہ عقیدوں کے قاتل ہیں۔ انسانوں کو بانٹنے والے، رشتوں کی پہچان مٹانے والے، عقیدے برباد کرنے والے۔

انسان عقیدے کے لئے جان دیتا ہے، روپے پیسے کے لئے نہیں، یہ سب چیزیں تو وہ جان بچانے کے لئے نچھاور کر دیتا ہے۔ جیسے تم نے نوٹ جلا دیئے تھے"۔ یکایک جھاڑیاں ہلنے لگیں۔ یہ کھائی تین جانب سے بند تھی۔ صرف ایک تنگ سی دراڑ سے حملے کے امکانات تھے۔ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے، "بھیڑیئے نہیں غوری! شاید میرے ساتھی آگئے ہیں، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے غوری!"

دونوں میں طاقت لوٹ آئی، وہ سنبھل کر بیٹھ گئے، جھاڑیاں ہلتی رہیں مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ پھر جھاڑیوں کی اوٹ سے انگارے سے بلند ہونے لگے جیسے سرخ سرخ گرم گرم جگنو، انگارے جھاڑیوں کو چیرتے آگے بڑھنے لگے۔ انگڑائیاں لینے، غرانے اور پنجے گھسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جب انگارے سر پر بھی آپہنچے تو انہوں نے پہچانا۔ وہ برف کے ستائے ہوئے بھوکے بھیڑیئے تھے۔

غوری نے تمام تر طاقت مجتمع کرتے ہوئے بندوق چھپالی، ایک میگزین گود میں رکھ لیا۔ شست باندھی مگر فائر نہ کیا۔ بھیڑیئے دانت نکوسے قریب سے قریب چلے آرہے تھے۔ اپنے شکار کو ساکت و جامد دیکھ کر بھیڑیئے غرانے لگے۔ ان کے نوکیلے خون آشام انہوں نے گرتے پڑتے، کراہتے، سنبھلتے جیسے تیسے خنجروں سے دو بھیڑیوں کی کھال نوچ کھینچ کر اتار ہی لی۔ باقی بھیڑیوں کو آس پاس رکھا۔ جسموں کو حدت پہنچانے کے لئے زخموں کی پرواہ کئے بغیر ہی آپس میں لپٹ گئے کیونکہ الاؤ بجھ چکا تھا اور سردی خون میں اترتی جا رہی تھی۔ خون آلود کھالیں انہوں نے گرم کمبلوں کی طرح اوڑھ لیں۔ کاٹتی، چیرتی، کچوکے لگاتی ہواؤں کا دباؤ کم پڑ گیا۔

"غوری! یہ لڑائی کب ختم ہو گی"۔ پرتھوی نے سوال کیا۔

"میری تمہاری"

"نہیں پرتھوی اور غوری کی لڑائی جو صدیوں سے جاری ہے"۔ "جب تمہارے حکمرانوں کی سوچیں بدلیں گی"۔ غوری بولا۔ دوسرے دن دونوں کے ساتھی ان کی تلاش میں تقریباً ایک ساتھ کھائی کے پاس آپہنچے۔ انہوں نے سفید جھنڈے لہرا لہرا کر ایک دوسرے کو حملے کرنے سے روکا اور دونوں طرف کے کچھ لوگ اس کھائی میں اتر گئے۔ جو تین اطراف سے بند تھی۔ بھیڑیوں کی خون آلود کھالوں کے نیچے خود میں ڈوبے ہوئے آپس میں لپٹے ہوئے دو انسان پڑے تھے۔ یخ بستہ آپس میں لپٹے ہوئے جنہیں کاٹے بنا الگ کرنا ناممکن تھا۔ مگر ان دونوں کا الگ الگ کیا جانا ضروری تھا کیونکہ ایک کو دفنانا تھا دوسرے کو جلانا تھا۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ۔

آغا گل : سکونت، کوئٹہ (بلوچستان) پاک

آخری صدی کی آخری کہانی

عرفان احمد عرفی

کہانی

کہانی ساعت سے جنم لیتی ہے، کائنات کے سناٹے میں جب پہلی ٹک ہوئی ہو گی، کہانی شروع ہو گئی ہو گی۔ پھر کہانی کتنی ساعتیں، مدتیں، موسم، برس اور صدیاں طے کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کہانی ختم نہ ہوئی البتہ اس کے کہنے، سننے اور دیکھنے والے آتے اور ختم ہوتے رہے، بلکہ کہانی کہنے، سننے اور دیکھنے والے بھی وہی ہیں جو کہانی بنے ہوئے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہانی جو ساعت سے شروع ہوتی ہے تو کیا ساعت پر ہی جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کہانی وقت دیکھ کر ختم نہیں ہوتی بلکہ جب کہانی چلتے چلتے تھک جاتی ہے تو کسی بھی ساعت کی اوک میں اتر ستا لیتی ہے۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اپنے نئے سفر کو روانہ ہو جاتی ہے لیکن کچھ کہانیاں ہوتی ہیں جو اتنی زیادہ تھک جاتی ہیں کہ مرنے سی لگتی ہیں۔ ہوتے ہوتے وہ آپ ہی اپنی موت مر بھی جاتی ہیں۔ شاید ایسا تب ہوتا ہے، جب کہانی کے پاس کوئی حیرت باقی نہیں رہتی گویا اسے آگے کچھ بھی کہنے کو نہیں ہوتا۔ ایسے میں کہانی پرانی ہونے لگتی ہے، سنی ہوئی کہانی جسے پھر کوئی بار بار سننا پسند نہیں کرتا۔ اور ہاں ایک اور بات! یہ صرف کہانی ہی نہیں ہوتی جسے سنا جاتا ہے دراصل کہانی کے بھی کان ہوتے ہیں اور وہ خود بھی سنتی ہے اگر کہانی بول سکتی ہے تو پھر بہری کیونکر ہو۔ لیکن کچھ کہانیاں ہوتی ہیں جو سنتی نہیں یا پھر سننا چاہتی نہیں بس اپنی کہے جاتی ہیں جبکہ کہانی زندہ وہی رہتی ہے جو کہنے کے ساتھ ساتھ سنتی بھی رہے۔

دیکھا جائے تو کہانی ایک ہی ہے اور وقت سے بڑا کہانی کار کوئی نہیں۔ جس کی میز پر جتنے ورق ہیں اتنی کہانیاں، صدیوں کے پیپر ویٹس میں دبی کہانیاں۔ جب تک حیرت باقی ہے کہانی زندہ رہے گی' جس کے اندر جتنی حیرتیں' اس کے پاس اتنی کہانیاں لیکن اپنے اندر کی حیرت کسی دوسرے تک پہنچانے کا ڈھنگ بھی لازم ہے۔ سو جسے یہ ہنر آ گیا وہ کہانی کہنے والا ہو گیا۔ لیکن اپنے اندر کی حیرت، کسی دوسرے میں اتاری بھی تو اس طور جائے کہ حیرت کہنے والے ہونٹوں پر سے رینگتی جب کسی کان کی پٹاری میں اترے تو وہاں پہلے سے موجود حیرتوں کو ڈس نہ لے بلکہ ان کے ہمراہ ہنسی خوشی رہنے پر آمادہ ہو جائے۔

شاید اپنے اندر کی حیرت کسی دوسرے تک پہنچانے کی ہنر مندی میں کمی تھی کہ میری کہی ہر کہانی مسترد ہو گئی یا پھر کوئی دوسرا اتنا حیران ہونا ہی نہیں چاہتا۔ اب پتہ نہیں میری کہانی میں حیرت نہیں کہ سننے والے کو حیرت قبول نہیں۔ قبولیت کی منزل بھی تو کڑی ہے۔

مجھے کہانی بنے کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا' یہی کوئی جب پہلی ٹک ہوئی تھی میری حیرت بھی شروع ہو گئی تھی' لیکن میں نے کہانی کہی بہت بعد میں۔ کیونکہ مدتوں تو میں خود حیرت میں ڈوبا رہا۔ آپ ہی آپ حیران ہوتا رہا'

اندر ہی اندر سسکتے کی دیوار میں چنا رہا۔ اس قدر حیران کہ تنہائی سے بھی اپنی حیرت کہنے کی فرصت نہ ملی' ایک مدت تک تو پتہ ہی نہ چلا کہ جو کچھ ہے دراصل وہ حیرت ہے۔ پھر جب خوب حیران ہولیا تو سوچا کسی دوسرے سے کہہ دوں اور جب کہنے پہ آیا تو توجہ کے بند کواڑ پیٹنے پر کسی نے کان نہ دھرا۔ جس کے کانوں پڑتی، یہی کہتا کوئی بھی نہیں بس وہم ہے' سایا سا ہے۔ ہم نے تو یہی سن رکھا ہے کہ آدمی کے اندر ایک ہی حیرت تھی، جو پسلی کے راستے باہر آگئی اور پھر سامنے کھڑی حیرت کے لئے جو کچھ بھی اس کے اندر باقی تھا اسے محبت کہتے ہیں جو بذات خود بھی نہ ختم ہونے والی ایک ایسی حیرت ہے کہ اس کے بعد جتنی بھی حیرتیں مسخر ہوئیں اسی کی مرہون منت ہیں۔

جس حیرت کی بات میں کر رہا ہوں اس کا چہرا بھی تو محبت نے ہی دکھایا ہے۔ یہ الگ بات کہ میں اپنی اس حیرت کے ساتھ تنہا تھا۔ اسی لئے اس حیرت کو سچ نہ مانا گیا کہ اسے تجربہ کرنے والے اگر کہیں تھے بھی تو یا تو وہ ابھی حیرت سے باہر نہ آئے تھے اور اگر باہر آچکے تھے تو پھر انہیں اسے کہنے کا حوصلہ یا ہنر نہ تھا اور یوں میرے اندر کا سچ خوف کی کوکھ میں پنپتا اور پلتا رہا حتیٰ کہ بچپنے سے بڑھاپے تک کا سفر کر گیا مگر اپنے وجود کو جنم نہ دے سکا۔

کہانی صرف اتنی سی ہے کہ ابھی کچھ حیرت باقی تھی، جسے پسلی میں سے باہر آنے کا راستہ نہ ملا۔ جس نے مجھے اندر ہی اندر روکے رکھا اور یوں میں اپنے آپ میں گم ہوگیا' اپنے سامنے کھڑی حیرت سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا البتہ کہیں بھی اگر میں نے اپنے سامنے اپنا چہرا دیکھا میں اپنی بچھڑی ہوئی حیرت میں پھر سے ڈوب گیا۔ مجھے پسلی میں سے نکلی اس حیرت میں جو میرے سامنے لا کھڑی کردی گئی تھی، اپنا چہرا دکھائی نہیں دیا تھا۔ سو، مجھے اسی آئینے پر رکنا تھا، جس نے میرا عکس سجا رکھا تھا۔ لیکن میری اس بات پر کسی نے بھی اثبات میں سر نہ ہلایا اور یوں میری کہانی مسترد ہوگئی۔ نتیجتاً میں تنہائی کی گم نام چٹان پر اپنے سچ کی صلیب اپنے ہی شانوں پر اٹھائے چڑھتا رہا کہ شاید مصلوب ہو جاؤں تو اپنی اپنی حیرت میں ڈوبے اپنی اپنی تنہائی میں بکھرے بہت سے اپنے جیسوں کی نجات کا باعث ہو سکوں۔

کہانی یہ ہے کہ میری کہانی کو کہانی بننے نہ دیا گیا، کہانی والی ہر عظیم کتاب نے میری حیرت کو مسترد کیا۔ یہ کسی نے نہ جانا کہ حیرت مسترد کرنے سے ختم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ حیرت سے انکار بذات خود ایک اور بڑی حیرت ہے۔ اور یوں حیرتوں کے موسم ثمر آور ہوتے چلے گئے اور حیرت کی مٹی اور زرخیز ہوگئی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میری آنکھوں میں آج بھی مرا ہوا وہ سمندر سانس لے رہا ہے، جس میں کبھی صدیوں پہلے میری حیرتوں کے مسمار شدہ شہر عذابوں میں بہا دیئے گئے تھے۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ سمندر کی اس سانس لیتی لاش پر تیرتی ویرانی اسی حیرت کو آج بھی زندہ کئے ہوئے ہے۔ کہانی تو یہ ہے کہ جرم بہت سے اور بھی تھے جن کی پاداش میں شہر والوں کو سزا کا مرتکب ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن یاد صرف میرے ہی جرم کو رکھا گیا جو مجھے محبت نے دیا تھا اور یوں میری حیرت نے پھر کبھی بھی سر نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میری کہانی نے فقط سننے

رہنے پر اکتفا کر لیا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اگرچہ اپنی اپنی حیرت میں ڈوبے اپنی اپنی تنہائی میں بکھرے میری طرح کے بہت سے تھے جو کھوئے ہوئے سچ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ پھر یہی تلاش انہیں ایک دوسرے کی پاس لے آئی اور جب بھی کہیں سب سے پہلے ایک ہی حیرت میں ڈوبے دو ملے تو سچ ہاتھ آگیا۔ سو، اپنے جذبوں کی گرہیں مجھے بھی کھولنا تھیں۔ پس میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہی میں رہوں، جن کی اور میری حیرت مشترک ہے۔ سو پستیوں میں بسی یہ بے خدا بستیاں ہی میرا مسکن ٹھہریں کہ بلندیاں تو انہوں نے ہسار رکھی تھیں جو اہل خدا تھے اور یوں ایک اقلیت نے جنم لیا۔ اقلیت بھی تو شاید اس احتجاج کا نام ہے جو اکثریت کے انکار کے رد عمل کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ خود کو اقلیت میں تقسیم کرنے میں بھی تو میرا اپنا ہاتھ ہے۔ میں بھی تو اپنی حیرت چھپاتا رہا دوسروں سے تو دور کی بات، اپنے آپ سے بھی اپنی حیرت سے شرمسار رہا اور اپنی کہانی کو لفظ نہ دیئے۔

سو، خود سے اس معذرت خواہانہ رویے نے مجھے ایک دوہرے پن کا شکار کر دیا اور یوں میں اپنے آپ سے بددیانت ہو گیا، جس نے مجھے دوسروں سے بھی بددیانتی کرنے پر اکسایا۔ یہی وجہ تھی کہ میں عذابوں کا مرتکب ہوا اور استرداد کا نشانہ بنا۔ دراصل میں اپنے آپ پر ہی منکشف نہ ہو پایا تھا خواہ مخواہ خوفزدہ رہا۔ اسی لئے مجھ پر سزاؤں اور عذابوں کے قصے قلم بند ہوئے، حقارت اور ناپسندیدگی کے پتھروں کی بارشیں میرا مقدر ٹھہریں۔

لیکن یہ کسی نے نہ جانا کہ حیرت بنیادی طور پر معصوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب تک حیرت، حیرت ہے ایک سوال ہے اور سوال تو جرم نہیں ہوتا۔ کائنات بذات خود بھی تو ایک عظیم حیرت ہے۔ جس کا جواب کسی کے پاس نہیں پھر مجھے ہی کیوں اپنا جواز پیش کرنے کو کہا گیا۔ میں کیونکر جسم کے کٹہرے میں سانس لینے کے جرم میں دھر لیا گیا ہوں کہ اپنی صفائی پیش کروں۔ کائنات میں اور کچھ بھی ہے کیا اس کا کوئی جواز ہے؟ سوائے اس کے کہ طاقتور فطرت کی بقاء کے لئے ہر جاندار شے خوراک اور کھاد کا کام دے رہی ہے۔

زندگی کے ریگ زار کا ہر مسافر کسی نہ کسی سراب کی تلاش میں ہے اور یہ پیاس ہے جو اس تلاش کا محرک ہے۔ سو، مجھے بھی میری پیاس کے ساتھ رہنا پڑا لیکن اکثریت کے بنائے ہر ضابطے نے مجھ پر سرابوں کے راستے بند کر دیئے اور میں اپنی ہی پیاس کی چھاؤں میں ٹھہر گیا۔

سو، میں اپنی اس پیاس میں "خوش" ہوں۔ مجھے میری پیاس میں ہی رہنے دیا جائے اور یوں میں نے خود کو "خوش" کہلو لیا "خوش" منوا لیا مگر جس ساعت میری پیشانی پر سے "خوش" کی تختی سرکنے لگے گی میری کہانی دم توڑ دے گی جب میری کہانی میں حیرت نہ رہے گی یا پھر اکثریت قبولیت کی کڑی منزل طے کر لے گی۔ لگتا ہے وہ ساعت آخری صدی کی پہلی ساعت ہو گی جب آخری کہانی بھی شروع ہو جائے گی۔

عرفان احمد عرفی : سکونت / اسلام آباد - (پاک)

راوی کی موت

کہانی

خالد سہیل ملک

اس قصبے کے لوگ بہت اداس تھے۔ سنا ہے اس قصبے کا راوی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اب یہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ آیا وہ خود اپنی مرضی سے اپنا بوریا بستر اٹھا کر کہیں چلا گیا تھا یا اس کا باعث کچھ اور تھا۔ بہر حال قطعی صورتحال کسی کو نہیں معلوم تھی کہ اس قصبے کا ہر دلعزیز راوی کہاں اور کیوں چلا گیا۔ جبکہ یہ بات بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ راوی پہلے کہاں سے اس قصبے میں وارد ہوا تھا۔

کہنے والے کہتے تھے کہ اس راوی کی اپنی بھی ایک کہانی تھی جو اس نے کبھی کسی کو نہیں سنائی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی کہاناں سنایا کرتا تھا۔ اس کی کہانیوں میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی کہانیوں کے کردار بھی مخصوص ہوا کرتے تھے جو ہر کہانی میں گردش کرتے تھے، مگر پھر بھی اس کی ہر کہانی دوسری کہانی سے مختلف ہوتی تھی۔ یہی وہ کمال تھا جس نے اس راوی کو قصبے میں ہر دلعزیزی بخش دی تھی۔

اس قصبے کے لوگوں کی دوسری پریشانی یہ تھی کہ وہ راوی اگرچہ انہیں بہت سی کہانیاں سنا چکا تھا لیکن قصبے کے مکینوں کو راوی کی سنائی ہوئی کوئی بھی کہانی یاد نہیں رہی بس کردار، آغاز اور انجام یاد رہ گئے تھے۔ ورنہ اس راوی کی سنائی ہوئی کہانیوں کو دہرا دہرا کر کہانی سننے کا اپنا شوق پورا کرتے رہتے۔ قصبے ہی کے کچھ لوگوں نے اس راوی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی بھی تھی اور لوگوں کو نت نئی کہانیاں سنائی بھی تھیں، مگر راوی جیسی ہر دلعزیزی حاصل نہ کر سکے تھے۔ جسکی وجہ یہ تھی کہ ان نئے راویوں کی ہر کہانی کے کردار، آغاز اور انجام دوسری کہانیوں سے مختلف ہوتے تھے۔ یوں ہر نیا راوی بہت جلد اپنی موت مرنے لگا تھا پھر اس قصبے میں کبھی کوئی نیا راوی پیدا نہ ہو سکا تھا۔ اسکی وجہ موت کا خوف تھا یا پھر اس قصبے میں کہانیوں کا فقدان تھا۔ بہر حال اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس قصبے کے لوگوں کو کہانی سننے کا ایسا چسکا لگ چکا تھا انہیں کہانی سنے بنا اپنی زندگیاں ادھوری سی لگنے لگی تھیں۔ قصبے کی پنچائیت کے بڑے بوڑھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد قصبے کے نوجوانوں کی مختلف ٹیمیں تشکیل دیں تھیں جنکا کام راوی کا تلاش تھا۔ بہت دنوں کی تلاش بسیار کے بعد آخر کار قصبے کے نوجوانوں کی ایک ٹیم نے قصبے سے ملحقہ جنگل میں گھاس پھونس سے بنائے کچے جھونپڑے میں سے اپنے ہر دلعزیز راوی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس دن قصبے کے مرکزی چورستے کے وسط میں لگے پیپل کے بڑے درخت کے نیچے جہاں قصبے کی پنچائیت لگتی تھی۔ ایک جشن کا سا سماں تھا۔ قصبے کے بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں سبھی اپنے ہر دلعزیز راوی کو دیکھنے اور سننے کیلئے پیپل کے بڑے درخت کے نیچے جمع تھے۔ سب بہت خوش تھے۔ پیپل کے بڑے درخت کے عین نیچے موٹے موٹے منقش پایوں والی بڑی چارپائی کے وسط میں، سر پر سرپنچ کی پگڑی جتنی بڑی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ذہانت اور متانت کے وہی آثار تھے جو غائب ہونے سے پہلے ہوا کرتے تھے۔

قصبے کے لوگوں کی بے چینی اس وقت دیدنی تھی۔ ان کی پیاسی سماعتیں بے تاب تھیں کہ کب راوی کے منہ سے نکلنے والے سحر انگیز الفاظ ان میں رس گھولیں گے۔ پنچائیت کے بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ راوی حسب معمول خود بخود بول پڑیگا بلکہ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ جیسے راوی انہیں مسحور کرنے کیلئے دلنشین الفاظ تلاش کر کے اپنے ذہن میں جمع کر رہا ہے۔ مگر جب بہت سا وقت بیت گیا اور راوی گویا نہ ہوا قصبے کے لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ جبکہ پنچائیت کے بڑے بوڑھوں کو یہ خدشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ کہیں راوی کو چپ ہی نہ لگ گئی ہو یا کہیں یہ راوی بھی قصبے کے دوسرے کی طرح اپنی موت ہی نہ مر چکا ہو۔ اب تو قصبے کے لوگوں نے بھی سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔ ان سرگوشیوں نے پیپل کے بڑے درخت کے نیچے کی فضا کو انتہائی ڈراؤنا بنا دیا تھا۔

قصبے کے بڑے بوڑھوں میں سب سے بڑی پگڑی والا سرپنچ جو قصبے میں سب سے زیادہ ذہین اور تجربہ کار گردانہ جاتا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے، زمین کو گھور رہا تھا۔ قصبے کے سب لوگوں کی نظریں سرپنچ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے بھی قصبے کی بہت سی مشکلیں اپنے تجربے اور ذہانت سے آسان کر چکا تھا۔ اسی لئے قصبے کے لوگ کسی حد تک مطمئن تھے کہ سرپنچ ضرور اس نئی اور انوکھی صورتحال سے نبٹ لیگا۔ سرپنچ نے اپنے جھکے ہوئے سر کو سیدھا کیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنی پگڑی کو درست کیا۔ سرپنچ کی حرکت سے سارا ہجوم خاموش ہو گیا۔ پنچائیت کے باقی بڑے بوڑھوں نے بھی اپنی اپنی پگڑیوں کو درست کیا۔ مگر راوی نے کوئی حرکت بھی نہیں کی۔ سرپنچ کہنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

"بھائیو۔ بزرگو! یہ خوشی کا دن ہے۔ ہمیں جو آج واپس مل چکی ہے۔ مگر خاموشی کی وجہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ کیا معمہ ہے یہ خود ہی بتلا دیں۔" سرپنچ کی لمبی چوڑی تقریر کے رد عمل میں بھی راوی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ بس وہ خاموش تھا۔ قصبے کے باسیوں کے چہروں پر طمانیت اور خوشی کے جو تاثرات کچھ دیر پہلے تک موجود تھے اب انکی جگہ مایوسی نے لے لی تھی۔ پنڈال میں سے سب سے پہلے سرپنچ اٹھے۔ اپنی پگڑی کو اپنے ہاتھوں سے سنبھالا اور نیچے تلے قدم اٹھاتا ہوا پنڈال سے باہر نکل آیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ باقی لوگ بھی منتشر ہونے لگے تھے۔ پنڈال اب بالکل خالی ہو چکا تھا۔ صرف راوی قصبے کے مرکزی چورستے میں لگے پیپل کے بڑے درخت کے نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے چہرے کے تاثرات میں ان بدلتے ہوئے حالات سے بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ رات بہت خوفناک تھی۔ قصبے کے کسی باسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر جا کر راوی کی خیر خبر معلوم کریں مگر اس رات ہر کسی پر عجیب و غریب وحشت طاری تھی کہ کوئی بھی اپنی خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ پھر رات کے پچھلے پہر قصبے کے باسیوں کو نیند نے آگھیرا تھا۔ دوسری صبح جب نمازی فجر کی نماز ادا کر لینے کے بعد مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو قصبے کے مرکزی چورستے کی جانب سے خوفناک چیخوں کی آوازیں

آنے لگی تھیں۔ نمازیوں سمیت قصبے کے سبز مکین ان چیخوں کے تعاقب میں قصبے کے مرکزی چوراہے کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ ہجوم میں سب سے آگے قصبے کا سرپنچ تیز تیز قدم اٹھاتا اور بار بار اپنی پگڑی کو درست کرتا جارہا تھا۔ صبح صادق ہواہیں ہلکی ہلکی خنکی تھی، جس نے کم روشنی کے ساتھ مل کر ماحول کو سحر زدہ کر دیا تھا۔ ہجوم مکمل خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہجوم کے جوتوں کی آواز قصبے کے مرکزی چوراہے میں لگے پیپل کے بڑے درخت سے چند قدم پیچھے ہی رک گئی تھی، البتہ دھول ابھی تک زمین سے فضا میں اڑرہی تھی۔ پیپل کے بڑے درخت کے نیچے بچھی موٹے منقش پایوں والی چارپائی پر راوی موجود نہ تھا۔ مگر وہ بے ہنگم اور منتشر آوازیں اب بھی سماعتوں کو چھید رہی تھیں۔ یہ آوازیں ہو بہو راوی کی ہی آواز کی طرح تھیں۔ لگتا تھا جیسے راوی اپنی کہانیاں ایک ساتھ سنا رہا ہو۔ مگر راوی تو منقش پایوں والی چارپائی پر موجود نہیں تھا۔ سارا ہجوم ساکت و پریشان کھڑا تھا۔ کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ پھر سرپنچ نے آگے کی جانب قدم بڑھائے۔ جب وہ بڑے پیپل کے نیچے بچھی چارپائی کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گوشت کا ایک لوتھڑا مٹی اور خون میں لتھڑا ہوا چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح زمین پر پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ وہ بے ہنگم اور منتشر آوازیں اسی گوشت کے لوتھڑے میں سے آرہی تھیں۔ سرپنچ ایک ہیبت کے عالم میں پیچھے ہٹا، جس سے اسکی پگڑی زمین پر آگری۔

قصبے کے لوگوں نے پنچائیت کے متفقہ فیصلے کے مطابق گوشت کے مٹی اور خون سے لتھڑے ہوئے لوتھڑے کو جو کہ راوی کی گدی تک لمبی زبان تھی کو قصبے سے باہر ویرانے میں دفنا دیا تھا۔ مگر قصبے سے باہر ویرانے میں سے اب کوئی نہیں گزرتا کیونکہ اس لوتھڑے کی بے ہنگم اور منتشر چیخیں اب تک نہیں تھمیں۔

(ڈاڈا سہیل ملک : سکونت : پشاور (پاک)

موری کا کیڑا

حامد سراج

کہانی

شمو نے پہلو بدلا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا رات کا کون سا پہر ہے۔ وہ بان کی ننگی چارپائی پر ہی سو گئی تھی۔ صبح اٹھی تو اس کے بدن میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ دوپہر میں کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اس نے آبادی کی ہٹی سے اسپرو کی دو گولیاں خریدیں اسے بخار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ خواہ مخواہ سارا پنڈا جلتا تھا۔ اس نے سوچا شام کو روٹی کھا کے گولیاں لے لوں گی۔ شام کے وقت بھی اتنا بہت سا کام تھا کہ اسے گولیاں لینی یاد نہ رہیں۔ اس نے تندور پر گھر بھر کی روٹی لگائی۔ ننھے کو نل کے نیچے نہلایا۔ بابا کا حقہ تازہ کرنے کے لئے باہر کھیتوں سے خشک گوبر چن لائی۔ سب کو کھانا کھلا کر کتنی دیر ماں کا سر دباتی رہی۔ رات جب سونے لگی تو اس نے ماں سے کہا......

”ماں میرے پنڈے میں پیڑ ہے......

اسپرو لے لے......اور ہاں...... بھائی کو دودھ پلا دینا بوتل اندر طاقچے میں رکھی ہے۔

لیکن ماں تو تو اسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔

بس بہت پی چکا......اب بوتل میں دودھ پیا کرے گا۔

لیکن ماں کیوں......؟

اری چڑیل......ہر بات کو یوں نہ کریدا کر۔ مغز چاٹتی رہتی ہے ہر وقت۔ وہ چپ کر گئی۔ ماں بات بات پر بچوں کو گالیاں دینے کی عادی تھی۔ غربت کے ساتھ ساتھ شمو گالیاں سہنا بھی سیکھ گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کیا دنیا کے ہر گھر میں ہماری طرح جھگڑے ہوتے ہوں گے؟ گالیاں چلتی ہوں گی یا پھر یہ ہمارا ہی مقدر ہے۔ اس نے دودھ بوتل میں ڈال کر جونہی ننھے بھائی کے منہ میں دیا۔ وہ کسمسا کر رونے لگا......اس کا باپ کھانس رہا تھا۔ شمو نے ننھے کو اٹھا کے پہلو میں لٹا دیا لیکن اس کی ریں ریں بند نہ ہوئی تب اس نے بھائی کو سینے سے لگا کر تھپتھپایا۔ پیار کیا تو بڑی دیر بعد مشکل سے اس نے بوتل سے دودھ پیا اور سو گیا۔ وہ خود اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اندر سے تکیہ اور کھیس بھی نہ نکال سکی اور ننگی چارپائی پر

ہڈیاں جوڑنے والا ہسپتال نہر کے پار گھنے درختوں کے درمیان تھا۔ ہڈی جوڑ کمرے میں عجیب وغریب اوزار دیوار پر آویزاں تھے۔ لکڑی کے پنجے، چوڑی تختیاں، ایک لکڑی سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے اوزار، کمرے میں ایک طرف بھاپ کا سسٹم تھا۔ پانی کہیں اندر گھر میں ہی ابلتا تھا۔ مطب میں صرف پائپ سے بھاپ نکلتی جس سے وہ جوڑ نرم کرتا اور جوڑتا۔ اس کے پاس دور دروازے سے لوگ آتے۔ آغاز میں ایک کمرہ تھا، رفتہ رفتہ کمرہ در کمرہ........ پورا ہسپتال بن گیا۔ لوگ مہینوں پلستر میں جکڑے رہنے کی بجائے اس کے علاج کو ترجیح دیتے کیونکہ ہر دوسرے دن پٹی بدلنے سے متاثر حصہ سن نہیں ہوتا تھا۔

بابا کے ساتھ شمو درختوں تلے بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ جب ان کی باری آئی۔ وہ بھائی کے ساتھ مطب کے اندر نہیں گئی۔ اندر سے بھائی کی چیخیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔ اس نے دوپٹہ تلے داب لیا جیسے اس کا بازو جوڑا جا رہا ہو۔ اکو اس کا پیچھا کرتے ہوئے آنکلا تھا........

"کمینہ!"......... جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ تیس مار خان....... الو کا پٹھا"

گالیاں شمو کے بدن میں ہی گھومتیں رہ گئیں۔

وہ گھر پہنچے۔ ماں نے گرم گرم دودھ میں گھی اور انڈہ ڈال کر پلایا۔ ماں کا کہنا تھا اس سے درد کم ہوتا ہے اور ہڈی جلد جڑ جاتی ہے........"

شام ڈھلے گھروں سے تندوروں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا باپ حصہ گڑگڑا رہا تھا وہ کچے چولہے میں بیٹھی توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔ اس کی ماں بابا کے پاس پائینتی آ کر بیٹھ گئی اس کے بال میلے اور کھچڑی تھے۔ چہرے پر چھائیوں کا جال بچھا تھا۔ جوانی تو شاید دوسرے تیسرے بچے کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ شمو کی ماں کے ذہن میں ماضی رینگ رہا تھا........ جب وہ پہلی بار یہاں آئے تھے۔ حویلی کے میاں جی نے انہیں اپنی اولاد کی طرح گھر ٹھہرا لیا تھا۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے انہیں عزت دی چند ایکڑ زمین کے ساتھ انہیں ایک بھینس بھی دے دی۔ شروع میں ان کی آرام سے گزرتی رہی۔ رفتہ رفتہ بچے زیادہ ہونے سے مسائل بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ وہ سوچتے گاؤں کے مولوی کے گیارہ بچے ہیں۔ وہ کتنا خوش ہے۔ "جانے کیسے خوش رہتے ہیں یہ لوگ؟" اور تو اور گاؤں کی مغربی سمت ایک

کسان جس کی بیوی گوری چٹی اور چوڑی چکلی تھی۔ ان کے اٹھارہ بچے تھے .... گیارہ بیٹے اور سات بیٹیاں .... "اور سنا تھا تین بچے تو پیدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی مر گئے تھے۔ وہ بھر پور اور صحت مند تھی۔ مکھن کی طرح چکنی اور سفید، اس کے گالوں سے خون لاٹیں مارتا تھا۔ کنویں سے تین گھڑے سر اور دو ڈھاک پر اٹھا کے لاتی تو کمر لچکاتی جوان لڑکیاں بھی حیران رہ جاتیں۔

ایک مشورہ کرنا ہے کہ تم سے .... اس نے ماتھے پر دوپٹہ کستے ہوئے کہا۔

کیا. .... ؟ "شمو کے بابا نے حقے کی نے منہ سے الگ کرتے ہوئے پوچھا مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ کبھی گنا ہے تم نے کتنے بچے ہو گئے .... ؟" اسے زور کی کھانسی چھوٹی۔ آنکھیں کے کونوں سے پانی صاف کرتے ہوئے اس نے بات بڑھائی۔ "مسائل کا بچوں سے کوئی تعلق نہیں کم ہوں یا زیادہ۔ رزق اللہ سوہنے کے ذمہ ہے۔ وہ دے رہا ہے۔ دیکھو بابو کامران کے دو بچے ہیں۔ وہ بھی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ بھید کسی نے نہ پایۓ۔

میری بات کو مذاق میں نہ ٹال۔ کل وہ آئی تھی .... کیا نام ہے اس کا ....

"لیڈی .... ! "پھر .... ؟"

میں تو اب اور نہیں جن سکتی۔ بند کرا رہی ہوں۔ پرسوں لیڈی آئے گی تو اس کے ساتھ شہر بڑے اسپتال چلی جاؤں گی ....

مت ماری گئی ہے تیری۔ درجن بھر بچوں کے بعد تجھے خیال آیا ہے۔

اچھا .... آہستہ بول۔ شمو آ رہی ہے ...."

شمو نے ان کے آگے چنگیر میں روٹی رکھی۔ ہونٹوں تلے دبی نسوار تھوکتے ہوئے شمو کی ماں نے کہا ....

"کل سے شمو حویلی میں کام پر جائے گی۔"

ٹھیک ہے .... ! حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اگلی صبح ماں کے ساتھ وہ حویلی پہنچی۔ حویلی وہ پہلے بھی کئی بار آچکی تھی لیکن تسلی سے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کمرے، راہداریاں، برآمدے، بیلیں، بیلیں، کمروں کی آرائش نے اسے حیران کر دیا،

قد آدم تصاویر، صوفے، نرم نرم گدے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ صفائی کرتے کرتے سنگھار میز کے سامنے جھجکی۔ مالکن بستر پر دراز کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سنگھار میز کا خیال رکھنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹوٹ نہ جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رسالے سے نظریں ہٹائے بغیر مالکن نے کہا سنگھار میز پر رنگ رنگ کی شیشیاں، پاؤڈر برش، پرفیوم جانے کیا کیا رکھا تھا۔ ایسی چیزیں تو اس نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ سنگھار میز کی درازیں بند تھیں۔ وہ سوچ کی گلیوں میں بھٹکنے لگی۔ جانے ان بند دروازوں میں کیا ہے؟ تجسس بھی کیسا انوکھا پرندہ ہے معلوم سے نامعلوم جہانوں کو پرواز کرتا ہے۔ دوسری ملازمہ کے ساتھ جب وہ بستر کی چادر بدلنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو نرم بستر کے لمس نے اسے چونکا دیا۔

سہ پہر جب وہ گھر لوٹ رہی تھی۔ دوپہر کا بچا سالن، روٹیاں اور تھوڑا سا میٹھا بھی ساتھ تھا۔

رات شمو جب موٹے بان کی چارپائی پر لیٹی تو نرم گدا اسی گدگدانے لگا۔ اس کا جی چاہنے لگا۔ میری چارپائی نرم بستر میں بدل جائے اور میں اس میں دھنستی چلی جاؤں۔ کتنی دیر وہ آئینے کے سامنے کھڑی بنتی سنورتی رہی، نرم بستر میں دھنستی رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کار تھکن نے اسے سلا دیا۔

اس کے بعد وہ چوری چھپے آئینے میں اپنے گمشدہ عکس تلاش کرنے لگی۔ اس کے بدن کے زاویے بولنے لگے۔ مالکن کے دیئے ہوئے کپڑوں میں وہ خود کو نکھرا نکھرا محسوس کرتی۔ اسے اپلوں کی آگ پر کھانا پکانے سے وحشت ہونے لگی۔ نل کے تین اطراف چارپائیاں کھڑا کر کے اسے نہانا عجیب لگنے لگا۔ اسے مالکن کا چمکتا غسل خانہ یاد آنے لگتا۔ اسے خوشبوئیں اپنے بدن کے گرد لپٹی محسوس ہوتیں۔ وہ بے تعبیر خواب بننے لگی۔ مالکن کے سرہانے رکھے ملائم کاغذ والے رسالوں کی تصویریں اس سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

اس کا بابا تھریشر میں گندم ڈالنے میں مصروف تھا اور وہ اکیلی درختوں کے جھنڈ میں سیانے کے ہسپتال، بھائی کو لے جا کر اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اکوا اپنے تیل سے چپڑے بالوں اور تعویذ سمیت موجود تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھائی کے لئے گھڑونچی سے پانی ڈال رہی تھی۔ میاں جی آگئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میاں جی آگئے۔ لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔

کار آ کر رکی تو میاں جی کے ساتھ ایک نوجوان بھی اترا۔ وہ کٹورا گھڑونچی پر رکھنا بھول گئی۔ مالکن کے سرہانے رکھے رنگین رسالوں کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے۔ شمو کار سے اترنے والے کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

میاں جی کا بھتیجا ہے بھئی .... نگوڑی کرکٹ کھیلتے ہوئے گوڈے پر بال لگی۔ میاں جی علاج کے لئے سیانے کے پاس لے آئے ہیں...... گاؤں کے ایک کسان نے درختوں تلے بچھی چارپائیوں پر بیٹھے گونگے لوگوں کو بتایا۔

"سلامی" لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مضبوط ہاتھوں والی ایسی جی دار جوانی کی سرحد پر کھڑی تھی جہاں انگڑائی لینے سے بدن ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس کا رنگ تانبے کی طرح چمکتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی حویلی کا حصہ تھی۔ سب کو جھک جھک کر سلام کرتی۔ سلام بڑے میاں، سلام بی بی جی.......... گھر آئے مہمانوں کو باقاعدگی سے سلام کرتی۔ ایک روز میاں جی نے ہنس کر کہا.........

تو تو سلامی ہے....... "سلامی"۔ اسی دن سے اس کا نام سلامی پڑ گیا۔ حویلی میں شہباز کے آنے سے شمو اور اس کے درمیان میٹھی میٹھی کسر پھر ہونے لگی۔ شمو کے گال سلامی کے بدن کی طرح چمکنے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے کام کرتے وہ برتن توڑنے لگی۔ بی بی جی کہنے پر جب وہ ناشتہ لے کر گئی تو کن انکھیوں سے شہباز کو دیکھتی رہی۔ التفات کی متلاشی شمو کی آنکھوں میں رنگین خواب تیرنے لگے۔

سلامی نے اسے کریدا تو وہ ٹال گئی...... "نہیں نہیں میرے دل میں کوئی چور نہیں تم ایویں مغز چاٹتی رہتی ہو۔ وہ میرا کیا لگے ہے؟"

شہباز کی نظریں اتنی بہت سی نوکرانیوں کو کھوجتی رہتیں۔ وہ رسالے کی اوٹ سے اس کے بدن کی سیر میں کھویا رہتا۔ وہ شکار کی تاک میں تھا۔ تائی کی موجودگی اسے بری طرح کھلتی۔

ایک روز میاں جی شہر گئے تو شہباز کی تائی بھی ساتھ چلی گئیں۔ سلامی جب ناشتہ لے کر کمرے میں گئی تو وہ اس کے چوڑے بدن کی طرف دیکھ کر بولا۔ "شمو کہاں ہے.......؟"

جی.......جی.........وہ باورچی خانے میں برتن مانجھ رہی ہے.......

اسے کہنا میرا کمرہ صاف کر کے جائے........"

"جی!"

ارے پچھے کٹئی، تو کہتی تھی کوئی بات نہیں اور باؤ شہباز نے کہا ہے شمو میرا کمرہ صاف کر کے جائے..... سلامی نے اس کی ران پر چٹکی لی۔ کمرے کا کیا ہے۔ سلامی، تو کر لے، میں کروں، کوئی کرے، کرنا تو ہے نا۔ بہت سے کام نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پڑتے ہیں........ شمو کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ شہباز بر آمدے میں ٹہل رہا تھا۔

"شمو بستر کی چادر درست کر رہی تھی کہ کندھے پر ہاتھ کا لمس پا کر چونکی......."

ڈرو نہیں۔ میں ہوں.........!

اس نے شمو کو کاندھوں پکڑ کر قریب کیا تو اس کا بدن بھاڑ کی تپتی دوپہر ہو گیا وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

باؤ جی...... کوئی آجائے گا.......

"کوئی نہیں آئے گا......"

باہر مالی پودوں میں گوڈی کر رہا ہے..... شمو کی سانس تیز تھی۔

رات کو حویلی کے پچھواڑے آجانا۔ تم سے ایک بات کہنی ہے..... شہباز نے اس کے کان میں جھولتے بندے سے کھیلتے ہوئے کہا......

باؤ جی.... ڈر لگتا ہے۔ آپ ابھی کہہ دیں.........!

"مالی کے کھانسنے کی آواز سن کر اس نے شمو کو چھوڑ دیا۔"

رات جب اونگھنے لگی۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں پر آوارہ کتے سو گئے۔ شمو تسلی کر کے گھر سے نکلی۔ حویلی کے پچھواڑے چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ وہ جیسے اندر داخل ہوئی شہباز نے اسے بازوؤں میں بھر لا اور اندر کمرے میں لے آیا۔

"میرا یقین تھا تم آؤ گی......"

باؤ شہباز مجھے ڈر لگ رہا تھا.... جو بات کہنی ہے جلدی کہو مجھے واپس جانا ہے۔ شمو ساری رات اپنی ہے.........

نہیں باؤ........ !

شمو میں تم سے شادی کروں گا..........

وہ یوں اچھلی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہے.......... شادی اور مجھ سے .... ؟"

نہیں باؤ........ ہو جھوٹ ہے.......... !"

لذت کی جگہ خوف نے لے لی۔ کمرے میں لگی پینٹنگز گھومنے لگیں۔ نرم بستر اسے چبھنے لگا میز پر رکھی ساری چیزیں کانپنے لگیں۔ سگریٹ کی ڈبی، پانی کا گلاس، رسالے کے اوراق اور ٹائپ پیس کی ٹک ٹک......... شہباز نے اسے سگریٹ سمجھ کر سلگایا چاہا۔ وہ بجھ گئی۔ شہباز نے ماچس کی ساری تیلیاں پھونک دیں۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی۔ خوف اس کے دماغ کے خلیوں میں زہریلے کیڑے کی طرح رینگنے لگا۔ وہ کیا کرے ؟" چیخے، روئے یا بھاگ جائے...... وہ رسوائی کے خوف سے چیخ سکی نہ رو سکی۔ باؤ..... نہیں..... اللہ رسول کا واسطہ۔ مجھے جانے دو..........

اس کا باؤ شہباز تو جانے کب کا جا چکا تھا وہاں تو شیطان کھڑا تھا۔ عریاں!، وہ تو شہباز کے لئے آئی تھی اور وہ موجود نہیں تھا........"

باؤ....... خدارا مجھے جانے دو........ دیکھو شادی کے بعد پوری کی پوری تمہاری ہو جاؤں گی.........." شمو کو جب فرار کی کوئی راہ نہ سوجھی تو اس نے شہباز کے منہ پر تھوک دیا اور دروازے کی طرف بھاگی...........

"موری کا کیڑا"....... شہباز نے تھوک منہ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

شکار اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ زخمی بھیڑیئے کی طرح بل کھانے لگا۔

شہباز کو گئے کئی دن گزر گئے۔ وہ اسے قریباً بھول گئی۔ مردوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔ اس کے خواب ٹوٹ گئے۔ وہ بہت روئی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ آنسوؤں سے خواب نہیں جڑتے۔

ایک دن برتن دھوتے ہوئے سلامی نے اسے کہا۔

"شمو......." مجھے تم سے ایک کام ہے۔

"کہو........."

"پھر سہی۔"

صبح تڑکے تڑکے وہ کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے اکٹھی نکلیں۔ آسمان پر گھرے بادل اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں گاؤں کے قریب ایک چھپر تلے رک گئیں۔ بارش تیز ہو گئی......

شمو.........!

"ہوں......."

"یاد ہے ایک دن میں نے کہا تھا مجھے تم سے ایک کام ہے۔" سلامی ایک تنکا توڑتے ہوئے بولی........

"یاد ہے۔"

"شمو، وعدہ کر جو بات تم سے کہہ رہی ہوں اسے دل کے بجے میں بند رکھے گی۔ کبھی بجے کا تالا نہیں کھولے گی۔"

کیوں پہلیاں بجھوا رہی ہے..... اب منہ سے پھٹ بھی........ کسی سے آنکھ......!"

نہیں...... شمو نہیں .... سلامی کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا..... اس نے شمو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور سسک پڑی۔ شمو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں......

شمو....... شم..... مو....... شادی کا جھانسہ دے کر شہباز کمینے نے مجھے..... مجھے ....!

"کیا.........؟" شمو کی چیخ اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔

مجھے...... دو مہینے کا پیٹ ہے ....

نہیں........ سلامی.......... نہیں......... شمو نے سر پیٹ لیا............ وہ موری کا کیڑا شمو دانت کچکچاتے ہوئے بولی.........

میں زہر کھالوں گی...... سلامی کے آنسو مٹی میں رل رہے تھے۔

سلامی تو اکو سے شادی کر لے...... پرسوں ہی اکو کی ماں ہمارے گھر بیٹھی میری اماں سے کہہ رہی تھی۔ سلامی کی ماں مان جائے تو میں اپنے پت کے سر سہرا سجا دیکھ لوں۔"

لیکن.............وہ تو تجھے پسند کرتا ہے..........

تو چھوڑ اس بات کو میں اسے منالوں گی۔ ان مردوں کا کیا ہے۔

شمو جب اکو سے ملی۔ وہ حیران تھا کہ مجھے نفرت سے دیکھ کر تھوک دینے والی آج اتنی بچھی
ں جا رہی ہے۔ تعویذ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔

میں سلامی سے کیوں شادی کروں.....؟ تم اتنا اسرار کیوں کر رہی ہو۔ شادی تم سے کیوں
ں......؟ اکو نے مفلر سر پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

سلامی تجھ سے پیار کرتی ہے......اور ٹوٹ کر.........مجھے تو اس نے یہ کل ہی بتایا ہے۔
تم مجھے پیار کرتے ہو۔ اسے پیار کا واسطہ دیتی ہوں میری سہیلی کی زندگی سنوار دے۔ آج رات
یں پر مجھے ملنا.........مجھے کچھ سوچنے کی مہلت تو دو.........اکو نے چلتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے
.... ! شمو نے کہا۔

چاندنی رات میں بھادوں کی خنکی تھی۔ جھینگروں کی آواز میں سرگوشی کرتی شمو نے پوچھا...

اکو.........کیا سوچا ہے.........؟

تو ناراض ہو جائے گی.....اکو نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

نہیں.....اکو ..... تو میری سلامی سے شادی کر لے.....میں تیری ہر بات ہر شرط
نے کو تیار ہوں۔ شمو..... شمو .... آج رات میرے ساتھ گزار لے.....

سور ساری رات گنے کے کھیت اجاڑتا رہا.........چاندنی میلی ہو گئی۔

رات کے آخری پہر وہ اکو کے پہلو سے اٹھی.........وہ سرشار تھا۔

شمو نے اکو کے منہ پر تھوکا اور کہا۔

"موری کا کیڑا" اور کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

دادو سراج : سکونت ، جانذالی دیہات

زندگی کی قیمت

کہانی

ڈاکٹر شہناز شاہین

ریڈیو سے خبر نشر ہو رہی تھی ......

سرکار نے فساد میں مارے جانے والے افراد کے پسماندگان کو بیس بیس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے اور جو لوگ شدید طور پر زخمی ہوئے ہیں انہیں ......

"کلو بھیا ہماری سرکار بیس ہجار روپیہ دے رہی ہے ......" رحمو نے پاس بیٹھے کلو سے حسرت آمیز لہجے میں اس طرح کہا جیسے اس نے یہ خبر سنی ہی نہ ہو۔

"ہوں ...... بھیا سرکار پہلے پھساد کراتی ہے اور پھساد کے بعد روپیہ بانٹتی ہے ......" کلو نے ایک ہنکار بھری۔

"اچھا کلو بھیا اب چلت ہوں ...... نماج کا وکھت ہو گیا ......" رحمو اٹھتے ہوئے بولا۔

وہ راہ ورای سے لاٹھی ٹیکتا نکل گیا۔

اپنی لاٹھی سے ابھرتی ٹک ٹک کی آوازوں میں وہ بہت کچھ سن رہا تھا ...... زندگی کی ایک ایسی کہانی جو غربت میں پروان چڑھی تھی۔ افلاس کی آگ نے اس کے پورے وجود کو جھلس دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی شکنوں میں زندگی کے ایک ایک لمحے کا کرب پوشیدہ تھا۔ پھر کچھ دیر کے لئے وہ یہ سب کچھ بھول گیا ...... اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چلا جا رہا ہے سر سبز وادیوں کے سفر پر ......

وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں کو پھلانگتا بہت دور نکل گیا۔

اسے دور بہت دور سرسوں کی پگڈنڈیوں پر بل کھاتی زینو دکھائی دینے لگی۔ اس کا رنگین دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا ...... اور وہ کسی نازک ڈالی کی طرح لچکتی ہواؤں میں ڈول رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے حسن و جوانی کے اس شہکار مجسمے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ فصل کاٹتے کاٹتے رک گئے تھے اور پھر اس کی متوالی چال، بھرے بھرے جسم، لمبے لمبے گھنے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں نے اس کے دل میں ایک ہلچل مچا دی تھی ...... وہ اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا ...... زینو کاکی کے دروازے پر جا کر او جھل ہو گئی ...... وہ دیکھتا رہا ...... اس نے پتا لگایا وہ کون ہے؟ وہ صغیرن کاکی کی بھتیجی تھی، نزدیک کے گاؤں سے آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زینو کے قریب ہو گیا۔ پھر سرسوں کے کھیت کی مڈیر پر، دھان کی لمبی بالیوں کے پیچھے وہ دونوں محبت کا راگ الاپتے رہے ...... زندگی میں ایک رنگ بکھر گیا ...... اور ایک دن زینو اس کی دلہن بن کر اس کے آنگن میں چلی آئی ...... اس کی پازیب سے نکلتی جھنکاروں میں وہ خوش آئند زندگی کا راگ سنتا رہا۔ زینو کے بکھرتے قہقہوں میں اسے ساری دنیا کی مسرت نظر آئی تھی۔ خوابوں میں وہ زینو کی ہری، گلابی شلوار قمیض میں ملبوس ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں کھنکاتی پگڈنڈیوں پر گزرتے دیکھتا رہا ...... اس کی زندگی میں نت نئی خوشیاں لانے کے بارے میں سوچتا

لیکن اس کی غربت نے دونوں ہاتھوں سے آگے بڑھ کر اس کے قدم تھام لئے تھے۔ پھر اس کے گھر میں ایک ننھا مہمان آگیا..... دوسرا..... تیسرا..... چوتھا..... گھر کی ضرورتیں ہمیشہ منہ کھولے اس کا منہ چڑاتی رہیں اور وہ سب کچھ بھول کر پیٹ بھرنے کا سامان کرتا رہا.....

وقت گزرتا چلا گیا.....

اس نے پچھلے ہفتے جب کھانسی اور بخار میں جلتی زینو کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے آگے بڑھایا تھا..... تو وہ دیکھتا رہ گیا تھا..... سوکھے مریل ہاتھوں میں کمزوری کے باعث ساری رگیں ابھر آئی تھیں..... اس نے جب اس کے چہرے پر نظر دوڑائی تو سرخ و سپید گالوں کی جگہ دھنسا چہرہ تھا۔ روٹی کی تلاش میں بھٹکتی آنکھیں ایک ایک کانچ گہری ہو گئی تھیں..... اس کی چھاتیاں سوکھ چکی تھیں۔ بھول سے بلکتے بچوں نے چوس چوس کر اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا..... جب کبھی وہ اسے پیار سے بانہوں میں لیتا تھا تو اسے اس کے گداز جسم سے نرمی کا احساس ہوتا تھا لیکن آج..... وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھی..... بانسوں سے بنا ایک ٹھٹھر..... سوکھی ٹہنیوں سے بھرا درخت..... اس نے سوچا وہ قاتل ہے..... کتنے وجود ہیں جن کی مسرتوں کا اس نے خون کر دیا ہے..... اور..... وہ خود کتنا بدل گیا ہے!

وہ آئینہ دیکھ کر چیخ اٹھا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو.....

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آئینہ ہنس رہا ہے.....

"نہیں بھیا! میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں..... میں حقیقت پسند ہوں..... ہمیشہ حقیقی چیزوں کو ہی پیش کرتا ہوں....."

تو کیا میں وہی بانکا رحمو ہوں جس کی صحت پر گاؤں والے رشک کرتے تھے لیکن آج اس کا سارا وجود غربت و افلاس کی دھوپ میں جھلس گیا ہے..... اور یہ سفید بال.....

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے جھونپڑے کے سارے تنکے نکال کر ہوا میں بکھیر دے جس میں غربت پیوستہ ہو چکی ہے۔ وہ قدرت کے سائے میں نیلے گگن کے نیچے خود کو کھڑا کر دے تاکہ اوپر سے خدا بھی اس کے ننگے پن اور مجبوری کو دیکھ سکے.....

وہ دور بہت دور..... افق کے پار دیکھنے لگا۔

آسمان پر ستارے ٹمٹمانے لگے تھے..... ان ستاروں جیسی چمک تو کبھی اس نے اپنی بچوں کی آنکھوں میں نہیں دیکھی..... وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بد نصیب باپ ہے جس نے بچوں کی آنکھوں کو یہ چمک نہ دی..... ان کی زبانوں کو ان کے من پسند کھانوں کا ذائقہ نہیں دیا اور نہ ان کے جسم کو نئے کپڑوں سے ڈھک سکا..... میں وہ شوہر ہوں جس نے اپنی بیوی..... اپنی محبوبہ کو کوئی خوشی نہ دی..... اس کے ہاتھوں میں کانچ کی رنگین چوڑیاں نہیں پہنا سکا..... اس نے اس کے ہاتھوں میں ہمیشہ نیلی پلاسٹک کی چوڑیاں دیکھی ہیں.....

کھانسی کے زوردار جھٹکے نے سن کچھ بکھیر دیا۔ وہ جانے کب سے یہاں بیٹھا بھٹک رہا تھا۔ رات کی سیاہی نے دن کے اجالوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا...... اس کے کانوں میں ریڈیو کی آواز...... بیس ہزار روپیہ "کسی رقاصہ کے گھنگھرو کی طرح بج رہی تھی۔ پھر وہ چودھری کے گھر کی طرف ٹی۔ وی دیکھنے چل پڑا......

ٹی۔ وی پر خبریں آ رہی تھیں۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ بھی پسماندگان کو روپیہ تقسیم کر رہے تھے...... ایک جوان عورت منہ پر گھونگھٹ نکالے اپنا حق لے رہی تھی اور اس کا دس بارہ سال کا لڑکا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ روپے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشیوں کا ہالا بکھر گیا تھا، آنکھوں میں ستارے ٹمٹمانے لگے تھے ...... شاید اتنا روپیہ اس نے اپنے باپ کی زندگی میں نہیں دیکھا ہوگا...... لرزتے ہوئے ماں کے ہاتھ اور بچے کی آنکھوں کی چمک کہہ رہی تھی ان روپیوں سے ہزار خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں...... ایسی خوشیاں جن سے وہ اب تک محروم تھا......

اور پھر رحمو کی آنکھوں میں بھی ٹمٹماتے ستارے آسمان سے اتر آئے وہ سوچنے لگا...... کاش! ہمارے گاؤں میں بھی فساد ہو جائے......

رحمو نے ایک فیصلہ کر لیا تھا اور بس اس وقت کا انتظار تھا۔ لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا...... ایک دن صبح ہی صبح خبر ملی کہ گاؤں میں ایک جلوس آ رہا ہے۔ گلی کے سارے بچے تماشا دیکھنے دوڑ پڑے۔ لیکن اس نے اپنے بچوں کو پکڑ کر گھر میں بند کیا اور خود نکل پڑا۔

"بابا...... کہاں جا رہے ہیں...... اس کا چھوٹا بچہ مچل اٹھا۔

وہ زیر لب کہہ اٹھا...... بیٹا میں جا رہا ہوں تمہاری زندگی کی روٹھی خوشیاں لانے......

اور پھر ایک طوفان آیا اور کتنے آشیانے بکھر گئے

ایک گولی اسکے سینے کو چیر کر آر پار ہو چکی تھی...... اسکے چہرے پر ایک فتح یاب مسکراہٹ رقصاں تھی...... ابھی تک وہ اندھیرے میں کیوں تھا...... اسکی زندگی اسکے گھر والوں کیلئے ضروری نہیں تھی بلکہ اسکی موت ضروری تھی......

اسکے لب پھڑپھڑا رہے تھے...... زینو اب تو پھٹی ساڑی مت پہننا...... اپنا علاج اچھی طرح کرا لینا...... آج سے تم اور میرے بچے بے بسی کی زندگی نہیں گزاریں گے...... اور وہاں سنو حامد بیٹا کیلئے دس ہزار روپیہ دفتر کے بابو کو دے کر چپراسی کرا دینا ...... اور ہاں...... ان ہاتھوں سے یہ بدرنگ چوڑیاں اتار کر سرخ سرخ کانچ کی چوڑیاں ضرور پہن لینا......

ریلیف کمیٹی قائم کی گئی۔ اسکے ممبران زینو کا بھی نام لکھ کر نکلے گئے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سرکار نے فساد سے متاثر ہونے والے خاندان کو امداد دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک دن کچھ دفتر بابو رحمو کے گھر آئے اور زینو کے ہاتھوں میں نوٹوں کا بنڈل پکڑا دیا۔

بابو لوگ ہکا بکا تماشا دیکھتے رہے۔

بابو...... جا کر اپنی سرکار سے کہہ دینا...... کیا میرے مرد کی زندگی ان نوٹوں کے برابر تھی...... کیا یہ روپیہ مرا مرد دے سکتے ہیں...... میرا سہاگ...... میرے بچوں کا باپ لوٹا سکتے ہیں......

یہ کہتے زینو دروازے کے اوٹ میں کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو چکا تھا۔ ہوا میں اڑتی راکھ زندگی کی قسمت تلاش کر رہی تھی۔

آبائی وطن سہرام، بہار نئی دہلی ۔ ہندوستان)

کہانی کار

کہانی

لبنیٰ عروج

میں ایک کہانی کار ہوں- ہر روز میری تلاش اور جستجو کا سفر شروع ہوتا ہے- ایڈیٹر کا تقاضا تھا جلد ہی کوئی انوکھی 'نرالی' حقیقتوں پر مبنی کہانی ارسال کرو' جسے وہ کسی خاص نمبر میں لگانا چاہتا تھا- میں گھر جاتا تو میرے آنگن میں کھلے دو پھول ایق اور ذرناب میرے خالی ہاتھوں کی جانب دیکھتے اور پھر سے سر جھکا کر اپنے کسی کھیل میں مصروف ہو جاتے- میری بیوی میری طرف عجیب غصیلی طنزیہ نظروں سے دیکھتی کبھی کرم کے موڈ میں ہوتی تو فقط دیکھنے تک اکتفا کرتی-

فردوس جسے میں کبھی اچھے زمانوں میں پیار سے فردوسی کہا کرتا تھا- جب بولنے پر آتی تو آگا پیچھا کبھی نہیں سوچتی تھی- ایسے میں میری واحد پناہ گاہ میرا کمرہ ہوتی تھی' جہاں میں سگریٹ سلگا کر بند رہا کرتا- یہاں تک کہ وہ عورت ہونے کے ناطے 'بیوی کے درجے پر فائز ہونے کے ناطے خود ہی اندر آجاتی- بگھاری دال اور سوکھی چپاتیوں کی ٹرے 'وہ جیسے میرے بوسیدہ ٹیبل پر دے مارتی- "آپ کھانا تو کھالو" ایسے میں مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا- "وہ مجھے بڑی خوبصورت دکھنے لگتی- "ادیب فقط قلم کے سہارے زندہ نہیں رہتا نہ رہ سکتا ہے تمہاری طرح" - اس کے لہجے میں تھوڑی ہمدردی اور نرمی در آئی- "آج کا ادیب بڑی بڑی کلیدی آسامیوں پر فائز ہوتا ہے- بیرون ملک یوں آتا ہے جاتا جیسے دوسرے محلے میں آنا جانا ہو- سفر نامے لکھتا ہے اپنی کتابوں کی رونمائی کی تقریب فائیو اسٹار ہوٹلوں میں امیر ان وقت کو بلا کر کرتا ہے تم یہ لکھنا لکھانا چھوڑ کر کوئی دکان کیوں نہیں کھول لیتے"؟ آخر میں وہ جیسے بڑے دور کی کوڑی لائی- میرے سینے کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا- ایک طرف "عظمتِ قلم" اور دوسری طرف نون مرچ دال چاول اور پھر دکان کھولنے کے لئے سرمائے کی بھی ضرورت ہو گی- میں دکھے دل سے سر جھکائے اپنے قلم سے میز کی کھردری سطح پر آڑی ترچھی لائینیں کھینچتا رہا- یہاں تک کہ وہ خود ہی اٹھ کر چلی گئی-

گلی کے نکڑ کے پان والے سے میں نے پان اور سگریٹ اپنے ادھار کے کھاتے سے خریدا- یہ پان والا بھائی بھی عجیب آدمی ہے- میری بے انتہا عزت کرتا ہے- عرصہ ایک سال سے میں اس سے ادھار پان سگریٹ لے رہا ہوں نہ اس نے کبھی ادھار چکانے کا مطالبہ کیا نہ کبھی بے عزت کیا- بلکہ وہ ہر بار یوں شوق اور اہتمام سے اپنے رجسٹر میں سے میرا صفحہ نکال کر نیا ادھار لکھتا جیسے میں نے پہلی بار اس سے ادھار لیا ہو- "لکھا کرو-" وہ ہمیشہ ہی کہتا ہے- ایک ان پڑھ آدمی اور قلم کی ایسی توقیر-

مجھے آج ایک بڑے سرمایہ دار سے ملنا تھا۔ جو ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت کرتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا کار ثواب سمجھتا ہے۔ ادبی محفلیں مہینے میں ایک دوبار سجا لینا اور لذت و کام دہن کا اہتمام کر لینا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ بڑے لوگوں سے ملنے کی خاطر بڑی بڑی سڑکیں ناپنا بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ میں پریشان حال بکھرے بال پسینے میں شرابور چلا جارہا تھا۔ دل' فردوسی ذرناب اور انیق میں الجھا ہوا' قدم تپتے ہوئے فٹ پاتھ سے جھلسے جارہے تھے۔ سر پر ننگا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بلبلہ جاڑ رہا تھا۔ دھوپ کی حدت اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے سے اگ رہے تھے۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ بلاوجہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے تبھی ایک چمکتا دمکتا نیا نکور شائیں شائیں کرتا موٹر سائیکل کے میرے قریب ہی رک گیا۔ اس پر بیٹھا ہوا ایک تازہ دم' خوش شکل' نوجوان خوشبوؤں میں بسا۔ نفیس لباس' چمکتے جوتے' میں اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا وہ وہ چہرہ میرا اشنا سا نہ تھا۔ پر حلیہ جانا پہچانا تھا۔ وہ، کسی عزت دار" امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ دل کشی سے مسکرا دیا۔ "آپ کو کہاں جانا ہے؟ اس تپتی دوپہر میں آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں" لہجہ بھی بے حد شائستہ تھا۔ پہلے میں جی میں ڈرا۔ یہ کوئی بگڑا ہوا امیر زادہ ہی نہ ہو۔ جو مجھے "ایڈونچر" کے شوق میں کسی ویرانے میں آبادی سے دور لے جاکر چھوڑ دے اور میرے تڑپنے کا مزہ اپنے بائیک کے سائیلنسر کھول کے تیز رفتار سے وہاں سے نو دو گیارہ ہونا لے۔ "جانا تو مجھے ڈیفنس کے فیز فائیو میں ہے اب تو نزدیک ہی ہے میں چلا جاؤں گا۔" میں نے اس نوجوان کو ٹالا "بیٹھ جایئے محترم' آپ کوئی شریف عزت دار آدمی دکھتے ہیں اسی لئے میں از خود آپ کو پہنچانے کی پیش کش کر رہا ہوں۔" اب وہ مجھے ایک سنجیدہ مزاج اور ہمدرد نوجوان لگ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ صرف چند ہی منٹ کے بعد اس نے بائیک ایک بڑے سے ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔ "آیئے پہلے کچھ ٹھنڈا پی لیا جائے۔" "ارے نہیں بھئی آپ تکلیف مت کریں۔" "آیئے نا" وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس ایئر کنڈیشنڈ ریستوران کے ٹھنڈے یخ بستہ اور نیم تاریک ہال کے ایک کونے والی میز پر لے گیا۔

"میرا نام اظہر ندیم ہے۔" جواباً میں نے بھی ایسے اپنا نام بتایا۔ یوں ہمارے درمیان رسم تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ باپ نے اسے مقدور بھر تعلیم دلوائی تو وہ ایک بیروزگار گریجویٹ بن گیا۔ "اب کیا کر رہے ہو میاں؟" میں نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔ "میں ایک پیشہ ور ہوں۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ نظریں جھکا کے بولا۔ "پیشہ ور ہوں۔" "پیشہ ور وکیل یا ڈاکٹر؟" میں آہستہ سے ہنسا۔ "میں ایک طوائف ہوں۔" "کیا کہہ رہے ہو یار؟" اتنی دیر کی گفتگو کے بعد ہم تم پر آگئے تھے اور اس کا یہ جملہ مجھے ہلا کر رکھ گیا۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں طوائف صرف عورت ہی بنتی ہے؟ وہ نوجوان بڑی عجیب باتیں اور سوال کر رہا تھا۔ میں گڑبڑا سا گیا۔ "بتائیں نا کیا صرف عورت ہی کوٹھا اور جسم سجا کے بیٹھتی ہے؟" "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے جلدی جلدی نیا سگریٹ

کہانی کار

کہانی

لبنیٰ عروج

میں ایک کہانی کار ہوں۔ ہر روز میری تلاش اور جستجو کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ایڈیٹر کا تقاضا تھا جلد ہی کوئی انوکھی، نرالی، حقیقتوں پر مبنی کہانی ارسال کرو، جسے وہ کسی خاص نمبر میں لگانا چاہتا تھا۔ میں گھر جاتا تو میرے آنگن میں کھلے دو پھول انیق اور ذرناب میرے خالی ہاتھوں کی جانب دیکھتے اور پھر سے سر جھکا کر اپنے کسی کھیل میں مصروف ہو جاتے۔ میری بیوی میری طرف عجیب غصیلی طنزیہ نظروں سے دیکھتی کبھی کرم کے موڈ میں ہوتی تو فقط دیکھنے تک اکتفا کرتی۔

فردوس جسے میں کبھی اچھے زمانوں میں پیار سے فردوسی کہا کرتا تھا۔ جب بولنے پر آتی تو آگا پیچھا کبھی نہیں سوچتی تھی۔ ایسے میں میری واحد پناہ گاہ میرا کمرہ ہوتی تھی، جہاں میں سگریٹ سلگا کر بند رہا کرتا۔ یہاں تک کہ وہ عورت ہونے کے ناطے، بیوی کے درجے پر فائز ہونے کے ناطے خود ہی اندر آجاتی۔ بگھاری دال اور سوکھی چپاتیوں کی ٹرے، وہ جیسے میرے بوسیدہ ٹیبل پر دے مارتی۔ ”آپ کھانا تو کھا لو“ ایسے میں مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا۔ ”وہ مجھے بڑی خوبصورت دکھنے لگتی۔“ ”ادیب فقط قلم کے سہارے زندہ نہیں رہتا نہ رہ سکتا ہے تمہاری طرح“۔ اس کے لہجے میں تھوڑی ہمدردی اور نرمی در آئی۔ ”آج کا ادیب بڑی بڑی کلیدی آسامیوں پر فائز ہوتا ہے۔ بیرون ملک یوں آتا ہے جاتا جیسے دوسرے محلے میں آنا جانا ہو۔ سفرنامے لکھتا ہے اپنی کتابوں کی رونمائی کی تقریب فائیو اسٹار ہوٹلوں میں امیران وقت کو بلا کر کرتا ہے تم یہ لکھنا لکھانا چھوڑ کر کوئی دکان کیوں نہیں کھول لیتے“؟ آخر میں وہ جیسے بڑے دور کی کوڑی لائی۔ میرے سینے کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ ایک طرف ”عظمتِ قلم“ اور دوسری طرف نون مرچ دال چاول اور پھر دکان کھولنے کے لئے سرمائے کی بھی ضرورت ہوگی۔ میں دکھے دل سے سر جھکائے اپنے قلم سے میز کی کھردری سطح پر آڑی ترچھی لائنیں کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی اٹھ کر چلی گئی۔

گلی کے نکڑ کے پان والے سے میں نے پان اور سگریٹ اپنے ادھار کے کھاتے سے خریدا۔ یہ پان والا نے بھائی بھی عجیب آدمی ہے۔ میری بے انتہا عزت کرتا ہے۔ عرصہ ایک سال سے میں اس سے ادھار پان سگریٹ لے رہا ہوں نہ اس نے کبھی ادھار چکانے کا مطالبہ کیا نہ کبھی بے عزت کیا۔ بلکہ وہ ہر بار یوں شوق اور اہتمام سے اپنے رجسٹر میں سے میرا صفحہ نکال کر نیا ادھار لکھتا جیسے میں نے پہلی بار اس سے ادھار لیا ہو۔ ”لکھا کرو۔“ وہ ہمیشہ ہی کہتا ہے۔ ایک ان پڑھ آدمی اور قلم کی ایسی توقیر۔

مجھے آج ایک بڑے سرمایہ دار سے ملنا تھا۔ جو ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت کرتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا کارِ ثواب سمجھتا ہے۔ ادبی محفلیں مہینے میں ایک دو بار سجا لینا اور لذت و کام و دہن کا اہتمام کر لینا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ بڑے لوگوں سے ملنے کی خاطر بڑی بڑی سڑکیں ناپنا بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ میں پریشان حال بکھرے بال پسینے میں شرابور چلا جا رہا تھا۔ دل فرودسی اور ناب اور انیق میں الجھا ہوا' قدم تپتے ہوئے فٹ پاتھ سے جھلسے جا رہے تھے۔ سر پر ننگا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بلکہ جلا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے سے اگ رہے تھے۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ بلا وجہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے تبھی ایک چمکتا دمکتا نیا نکور شائیں شائیں کرتا موٹر سائیکل کے میرے قریب ہی رک گیا۔ اس پر بیٹھا ہوا ایک تازہ دم' خوش شکل' نوجوان خوشبوؤں میں بسا۔ نفیس لباس' چمکتے جوتے' میں اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا وہ وہ چہرہ میرا شناسا نہ تھا۔ پر حلیہ جانا پہچانا تھا۔ وہ ,, کسی عزت دار " امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ دل کشی سے مسکرا دیا۔ ,, آپ کو کہاں جانا ہے؟ اس تپتی دوپہر میں آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں " لہجہ بھی بے حد شائستہ تھا۔ پہلے میں جی میں ڈرا۔ یہ کوئی بگڑا ہوا امیر زادہ ہی نہ ہو۔ جو مجھے ,, ایڈونچر " کے شوق میں کسی ویرانے میں آبادی سے دور لے جا کر چھوڑ دے اور میرے تڑپنے کا مزہ اپنے بائیک کے سائیلنسر کھول کے تیز رفتار سے وہاں سے نو دو گیارہ ہو نہ لے۔ ,, جانا تو مجھے ڈیفنس کے فیز فائیو میں ہے اب تو نزدیک ہی ہے میں چلا جاؤں گا۔" میں نے اس نوجوان کو ٹالا "بیٹھ جایئے محترم' آپ کوئی شریف عزت دار آدمی دکھتے ہیں اسی لئے میں از خود آپ کو پہنچانے کی پیش کش کر رہا ہوں۔" اب وہ مجھے ایک سنجیدہ مزاج اور ہمدرد نوجوان لگ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ صرف چند ہی منٹ کے بعد اس نے بائیک ایک بڑے سے ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔ ,, آیئے پہلے کچھ ٹھنڈا پی لیا جائے۔" ,, ارے نہیں بھئی آپ تکلیف مت کریں۔" "آیئے نا ,, وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس ایئر کنڈیشنڈ ریستوران کے ٹھنڈے یخ بستہ اور نیم تاریک ہال کے ایک کونے والی میز پر لے گیا۔

,, میرا نام اظہر ندیم ہے۔" جواباً میں نے بھی ایس اپنا نام بتایا۔ یوں ہمارے درمیان رسم تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی' بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ باپ نے اسے مقدور بھر تعلیم دلوائی تو وہ ایک بیروزگار گریجویٹ بن گیا۔ ,, اب کیا کر رہے ہو میاں؟" میں نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔ ,, میں ایک پیشہ ور ہوں۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ نظریں جھکا کے بولا ' ,, پیشہ ور ہوں۔" ,, پیشہ ور وکیل یا ڈاکٹر؟" میں آہستہ سے ہنسا۔ "میں ایک طوائف ہوں۔" "کیا کہہ رہے ہو یار؟" اتنی دیر کی گفتگو کے بعد ہم تم پر آ گئے تھے اور اس کا یہ جملہ مجھے ہلا کر رکھ گیا۔ ,, آپ کیا سمجھتے ہیں طوائف صرف عورت ہی بنتی ہے؟ وہ نوجوان بڑی عجیب باتیں اور سوال کر رہا تھا۔ میں گڑبڑا سا گیا۔ ,, بتائیں نا کیا صرف عورت ہی کوٹھا اور جسم سجا کے بیٹھتی ہے؟" "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ,, میں نے جلدی جلدی نیا سگریٹ

سلگایا۔ تب جانے کیا ہوا اس نوجوان کی آنکھیں ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح برس پڑیں۔ وہ روتا رہا۔ خاموش آنسو بہاتا رہا۔ میں بھی چپ چاپ سگریٹ کے مرغولے اڑاتا رہا۔ بہت رو چکنے کے بعد وہ بولا۔ ,,میں شریف اور عزت دار گھرانے کا ' ایک بہت ہی معصوم اور شریف نوجوان تھا۔ بیروزگاری کے ہاتھوں سخت پریشان تھا۔ تب مجھے ایک ایک پرانا دوست ملا ' میری بیروزگاری کا حال سن اور دیکھ کر اس نے مجھے ایک ,,کاروبار'' میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں بہت دن لگے۔ جس دن میں راضی ہوا ' وہ میرے لئے قیمتی کپڑوں اور جوتوں کا جوڑا لایا۔ مجھے ہیئر ڈریسر کے پاس لے جا کر اس نے میرے بال جدید تراش خراش سے کٹوائے۔ مجھے قیمتی خوشبوؤں میں بسا کے وہ امیر لوگوں کے ایک چوک میں لے گیا۔ بہت دیر تک ہم وہاں کھڑے رہے۔ پولیس والے بھی اس دوست کے واقف تھے ' وہ ہم سے مسلسل مسخریاں کرتے رہے ہمیں چھیڑتے اور ہنستے رہے۔ جب رات بھیگ گئی تب وہاں بڑی بڑی چمکتی گاڑیاں آنے لگیں ' کچھ کو شوفر چلا رہے تھے کچھ کو عورتیں بنی سنوری سجی ہوئی عورتیں۔ وہ ہمارے گرد چکر لگا کر یوں جیسے ہمیں جانچنے لگیں۔ پھر ایک گاڑی کا شوفر اتر کر مجھے بلانے آیا۔ ,,لے بھئی تیرا کام بن گیا۔'' میرا دوست خوش ہو کر بولا۔ مگر میری ٹانگیں لرزنے لگیں وہ مجھے باقاعدہ دھکیل کر اس جہازی سائز گاڑی میں پھینک آیا۔ وہ ایک بہت بڑے آدمی کی نا آسودہ۔ تڑپتی ہوئی ترسی ہوئی بیوی تھی جس کا میاں چھ ماہ سے بیرون ملک مقیم تھا اپنی سیکریٹری کے ساتھ۔ وہ گاڑی میں تو اپنا آپ ایک بڑی سی چادر میں چھپائے رہی۔ مگر گھر جاتے ہی وہ شعلہ جوالہ بن گئی۔ یوں میری زندگی میں ایک نہیں بے شمار راتیں آئیں اور ابھی نہ جانے کتنی اور راتیں آئیں گی۔ وہ پھر رونے لگا۔ میں چپ رہا۔ وہ خود ہی گویا ہوا۔ ,,میری ذمہ داریاں میری مجبوریاں بن گئیں۔'' ,,دو بہنیں بیاہی گئیں'' میرے باپ کو حج ادا کرنے کی بے حد خواہش تھی۔ جو پوری ہوئی۔'' میں تب بھی چپ رہا کہ وہ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ ,,کبھی کسی زمانے میں مجھے موٹر سائیکل کی بے حد خواہش تھی۔ اب میرے پاس ایک گاڑی ہے اس کے باوجود میں نے موٹر سائیکل خرید رکھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا میرے گھر والے میری اس بے تحاشہ آمدنی کو جائز اور حلال سمجھتے ہونگے۔'' ,,پتہ نہیں''۔

,,اظہر تمہاری کہانی بہت پر اثر اور پر درد ہے۔ ,, میری آواز بھر آگئی۔ اس نے ویٹر کو بلا کے بل ادا کیا۔ ,,کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم نے مجھ جیسے راہ چلتے اجنبی انجان شخص کو اپنی ساری کہانی حرف بہ حرف کیوں کہہ سنائی؟''

,,میں آپ کو جانتا ہوں سر ' آپ ایک کہانی کار ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ آپ میری کہانی لکھیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ صرف عورتیں ہی نہیں مرد بھی بے بس ہوتے ہیں۔'

لبنیٰ عروج :۔ سکونت کراچی (پاک)

یادگارِ عاد و ثمود

انجلا ہمیش

کہانی

اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ (ھود-۱۰۱)

بی بی حوا کے بعد وہ روئے زمین کی دوسری عورت تھی مگر نہ تو اس کے ماں باپ تھے اور نہ ہی وہ کسی کی پسلی سے پیدا ہوئی۔ اسے تو گویا پروردگار نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر ساتویں آسمان سے زمین پر ڈال دیا تھا۔ اتنے بڑے معجزے کے باوجود تاریخ کے کسی کونے میں اس کا نام نہیں تھا کیونکہ انسانوں نے تاریخ نہیں بنائی' تاریخ نے انسانوں کو بنایا۔ تاریخ نے بڑی سے بڑی ہستی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ جب وہ منوں مٹی کے نیچے دب جائیں تب تاریخ انہیں اپنے اندر جگہ دے گی۔ مگر وہ تو زندہ تھی اور اسے زندہ ہی رہنا تھا' پروردگار نے اس کے حصے کی موت کو ہسپتالوں کے مردہ خانوں' دنیا کے تمام قبرستانوں اور ان گھروں میں جہاں چند لمحے پہلے ہی کوئی زندہ جسم مردہ ہو گیا ہو' ڈال دیا تھا۔ بی بی حوا کے بعد نہ جانے کتنی عورتیں آئیں اور چلی گئیں مگر وہ رہی ہر جگہ اس نے صدیوں سے جاری دنیا میں عروج و زوال دیکھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا خاصی بوڑھی ہو چکی تھی مگر کسی مردار چہرہ گانے والی کی طرح بناؤ سنگھار کے ذریعے اپنے آپ کو قائم رکھے ہوئی تھی۔ زمین اپنے اوپر انگنت ستم سہہ چکی تھی اور ابھی نہ جانے مزید کتنے ستم اسے سہنے تھے' انگنت بستیوں کا بوجھ وہ اپنے جسم پر اٹھائے ہوئی تھی اور کئی بستیاں اس کے جسم پر ڈھیر ہو گئیں تھیں۔

انہیں تباہ شدہ بستیوں میں ایک وہ بستی بھی تھی تب دوسری عورت بھی وہاں آ کر رہنے لگی تھی تاہم بستی کے باشندوں کو کبھی بھی اس کے رہنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس نے بستی کے مرکزی علاقے کے فٹ پاتھ پر اپنی قیام گاہ بنائی تھی۔ فٹ پاتھ شہنشاہ جہانگیر کے نام پر ایک اجڑے ہوئے پارک سے جڑا ہوا تھا' جہاں وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی۔ بستی کا وہ ایسا علاقہ تھا جہاں ہر طرح کے مزاج کے لوگ نظر آتے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے پل کی سیڑھیوں اور زمین پر لولے لنگڑے بھکاری جن کے تن پر میلے کچیلے کپڑے ان جگہوں سے پھٹے ہوتے تھے جہاں جسم کے مقامات ہوتے ہیں اور وہ حساس مقامات ایسی مخدوش حالت میں ہوتے کہ راہ چلتے راہگیروں کو کچھ نہ کچھ ان کی جھولی میں ڈالنا ہی پڑتا' دنیا و مافیہا سے بے خبر اور نجاست و غلاظت میں ڈوبے ہیروئنچی جن کے پیشاب سے پل کی زمین گیلی رہتی تھی اور طوطے کے ذریعے فال نکالنے والے بیٹھتے تھے۔ قسمت نے بھی اپنے لئے طوطے کا انتخاب کیا۔ دونوں کے مزاج جو ملتے ہیں' قسمت بھی طوطے کی طرح دھوکہ دیتی ہے۔ بستی کے لوگ اتنے مصروف مزاج تھے کہ اکثر و بیشتر خاص کر صبح کے وقت انہیں اپنے جسم کے نچلے حصے کی فراغت کا خیال ہی نہیں رہتا ہو' اپنے فضلات کو اپنے پیٹ میں

سنبھالے وہ گھر سے باہر نکل جاتے اور بالآخر مرکزی علاقے میں جاکر پیٹ کا بوجھ ہلکا کرتے۔ اس ضروری کام کے لئے وہاں کوئی مخصوص جگہ نہیں تھی کہ لوگوں کو انتظار کی اذیت سہنی پڑتی بلکہ پورا علاقہ انسان کی اس بنیادی بو جھل ضرورت کے لئے وقف تھا۔ وقت اتنا کم ہوتا تھا کہ کسی کے پاس فرصت نہیں تھی کہ کسی اور کو اس صورت حال میں دیکھے یا دیکھتے بھی تھے تو محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایسے جیسے گاؤں میں پانچ چھ لائن سے بنی کھڈیوں پر پانچ چھ لوگ بیک وقت بلا جھجک بیٹھ جاتے تھے اور سب اپنے پیٹ کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مصروف ہوتے۔ شاید اس بات کے پیچھے یہ نفسیات بھی ہے کہ عورت کو عورت کے اور مرد کو مرد کے مخصوص مقامات دیکھ کر کسی طرح کی حرارت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر وہ تو عورت تھی' اس کو تو یہ سب کچھ دیکھ کر کچھ نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی مخالف صنف کو اس کے سامنے یہ حرکت کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ انہیں اس کی وہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ مزے سے سر جھکائے غلاظتوں کے قریب بیٹھی ہنستی رہتی تھی۔ اس کو شاید کسی بُو کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا یا پھر صدیوں سے جاری زمانے کی کروٹوں نے اسے ہر طرح کی کیفیت کا عادی بنا دیا تھا وہ خود بھی بہت کریہہ ہو گئی تھی' جیسے غلاظت نے انسان کا روپ دھار لیا ہو۔ زندہ انسان مُردہ انسان سے ڈرتا ہے مگر اپنی مُردہ غلاظت سے نہیں ڈرتا لیکن جب یہی اگر حرکت کرنے لگے تو پھر انسان اس سے خوف زدہ ہو جاتا ہے' ڈرنے لگتا ہے کہ اس نے ہمیشہ اس کو فاضل جان کر گٹر میں پھینک دیا مگر اب صورت حال اس کے برعکس تھی اب غلاظت کی باری تھی کہ وہ انسانوں پر حکومت کرے تاہم ابھی بستی کے لوگوں کو اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا کسی کے پاس فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ کچھ محسوس کرے یا کسی بات کی گہرائی تک پہنچے۔ پالیسی سازوں نے یہ پالیسی وضع کی تھی کہ ہر کام اور ہر مسئلے کو بس ایک بار دیکھو۔ نظر ثانی کرنے کی کسی کے پاس فرصت نہ تھی' یہاں تک کہ اپنی ذات کے معاملے میں بھی نظر ثانی کرنے کی فرصت نہ تھی' دودھ پلانے والی عوت اب اس تکلیف سے آزاد تھی کہ وہ تنہائی میں اپنے بچے کو دودھ پلائے۔ اب وہ بلا جھجک سب کے سامنے اپنی قمیض کو سینے تک اٹھا لیتی تھی پوری بستی میں کوئی اس کے سینے کی برہنگی کو محسوس کرنے والا نہ تھا لوگوں میں محسوس کرنے کی حس ختم ہو گئی تھی۔ اب انہیں کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی کسی چیز کا تجسس نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خوشی یا غم انہیں متاثر نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں البتہ کھانے پینے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا لوگ اتنے بھوکے ہوتے کہ کھانے کی خاطر غمگین رسموں میں شریک ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بلی کے مرے ہوئے بچے کی طرح جو مرنے کے بعد اپنے مردہ بچے کا گوشت نوچ نوچ کے کھا لیتی ہے' اسی طرح مرے ہوئے آدمی کے گوشت اور ہڈیوں کی بریانی تیار ہوتی اور لوگ اسے برسوں کی بھوکوں کی طرح مزے سے کھا رہے ہوتے اگر کہیں کوئی اس رویے کے خلاف بات کرتا تو اسے شرعی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کافر قرار دے دیا جاتا۔ ایک مذہب کے نام پر ہر طبقے کے الگ الگ تصورات و خیالات تھے' اسی

بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ مردہ انسانوں کا گوشت اور ہڈیاں کھاتے کھاتے بستی کے لوگ سڑنے لگتے تھے۔ ان کے چہرے مردار ہو گئے تھے اور سڑے ہوئے گوشت اور ہڈیوں کی وجہ سے ان کے پیٹ پھولے ہوئے اور بھدے ہو گئے تھے۔ گویا پوری بستی میں مرے ہوئے چوہے سے اٹھنے والی بو کی مانند تعفن پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ قرب و جوار کی بستیاں اس ناقابل برداشت تعفن کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھیں۔ کسی مریض کو لوگ اس وقت تک برداشت کرتے ہیں کہ اگر اس کا مرض وبائی نہ ہو مگر ایسا مریض جس کے مرض سے دیگر افراد بھی متاثر ہو سکتے ہوں' تب اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوتا ہے جیسے اس طالبہ کے ساتھ ہوا تھا کہ جس کے پورے جسم پر پھیلے چھوٹے دانے دیگر طلبہ کو متاثر کر سکتے تھے لہذا درس گاہ کی انتظامیہ نے وبائی مرض میں مبتلا طالبہ کو دوران تعلیم ہی درس گاہ سے فارغ کر دیا تھا۔ اسی طرح قدرت نے دیگر بستیوں کی بقا کے لئے اس وبائی بستی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا مگر بستی کے لوگ اس آنے والی تباہی سے بے خبر تھے اور ان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دنوں بعد ہوا یہ کہ بستی کی زمین پہ دراڑیں پڑنے لگیں مگر چونکہ اس واقعے سے فوری طور پر کوئی خاص بات نہیں ہوئی لہذا بستی والوں کو پتا نہ چل سکا کہ ان کی زمین پر دراڑیں پڑنے لگی ہیں لیکن دو ہی دن بعد رات کے وقت کسی گھر سے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ آواز اتنی دہشت ناک و زوردار تھی کہ پوری بستی گونج اٹھی۔ ایسا واقعہ اس سے پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ بستی کے تمام لوگ حیرانی و پریشانی کے عالم میں اس گھر کی جانب دوڑے جہاں سے چیخنے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ بستی کے تمام لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گھر میں بظاہر ایسا کوئی وجود یا چیز نہیں تھی' جس کو دیکھ کر کوئی چیخے چلائے اور نہ ہی کوئی اس شخص پر بظاہر تشدد کر رہا تھا یقیناً اس شخص نے کوئی ہولناک خواب دیکھا ہو گا مگر خواب کا اثر اتنی دیر اور اس طرح رہے۔ یہ بھی لوگوں کے لئے عجیب سی بات تھی مگر ابھی تک لوگوں کی نظر چادر سے ڈھکی ٹانگوں پر نہیں پڑی تھی۔ شدید تکلیف کے باعث' ہلنے جلنے سے جب وہ چادر ذرا سی سرکی تب لوگوں کو ایک جگہ سے تازہ تازہ خون رستا ہوا نظر آیا۔ خیال آیا کہ شاید کوئی بھاری چیز کسی وقت اس کی ٹانگوں پر گر گئی ہے۔ بہر حال اس کی ٹانگوں پر سے چادر ہٹائی گئی مگر نہیں یہ کیا؟ چادر ہٹانے کے بعد جو کچھ نظر آیا اس کو دیکھتے ہی سب کو تے ہونے لگی اور سب کے چہروں پر ہیبت چھا گئی۔ وہ شخص برابر چیخ رہا تھا مگر بے بس تھا نہ وہ کچھ کر سکنے کے قابل تھا اور نہ ہی کسی اور کو ہمت تھی کہ اس کو آگے بڑھ کر بچا سکے۔ اس کی ٹانگوں پر جہاں جہاں بھرپور گوشت تھا وہاں اب صرف ہڈیاں رہ گئیں تھیں۔ ٹانگوں کے بعد جسم کے بقیہ بھرپور گوشت والے حصوں کی باری تھی' ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی انتہائی شدت سے گوشت کو نوچ رہا ہے مگر کون؟ وہاں تو کوئی بلا نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تڑپتا ہوا بے بس شخص جو اندر ہی اندر موت کی آرزو کر رہا تھا کہ کاش اسے اپنے ساتھ ہونے والے اس اذیت ناک منظر سے نجات ملے مگر کیا جو بدقسمتی تھی کہ قدرت اسے زندہ رکھے ہوئی تھی کہ وہ آخر تک اپنے اس انجام

کو دیکھ کے روئے' تڑپے اور چلائے کتنا ہولناک کھیل رہی تھی - قدرت اس کے ساتھ - صبح ہوتے ہوتے اس کا پورا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور ساتھ ہی فضا میں رونے' تڑپنے اور چلانے کی آواز ختم ہو گئی مگر وہ پوری رات ایک قیامت تھی جو اس شخص پر گزری اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا- بستی میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور انوکھا واقعہ تھا مگر حیران کن بات تو یہ تھی کہ آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے ؟لوگ خوفزدہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کوئی ان دیکھی بلا صرف اس ایک آدمی کے لئے آئی تھی یا پھر پوری بستی پر وہ ان دیکھی بلا مسلط ہو گئی ہے -اپنی نفسیاتی تسکین کی خاطر وہ لوگ ان دیکھی بلا کی زد میں آئے ہوئے اس شخص کے عیوب کریدتے اور اپنے آپ کو مطمئن کرتے کہ ہمارے اندر اس شخص میں پائے جانے والی برائیوں میں سے کوئی ایک برائی بھی نہیں ہے -مگر اکارت گئی یہ نفسیاتی- تسکین روزانہ رات کو ایک ایک کر کے ہر شخص اس ان دیکھی بلا کی زد میں آتا گیا اور یوں کچھ ہی دنوں بعد پوری بستی گوشت بھرے جسموں سے خالی ہو گئی اصرف ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے -" تو ان کو بھونچال نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے -" (سورہ الاعراف -۷۸) جس رات بستی کے آخری آدمی کا گوشت بھرا جسم ہڈی ہڈی ہوا تھا اس کے دوسرے دن انگنت چھوٹے چھوٹے کیڑے کچھ عرصے پہلے بستی کی زمین پر پڑنے والی دراڑوں سے زمین کے اندر جانے لگے -پروردگار نے نہ جانے کہاں کہاں اپنی مخلوقات کو پناہ دے رکھی ہے کہ کسی کو کیا معلوم -مگر وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے کب آئے' کہاں کہاں رہے اور پھر اس وقت واپس چلے گئے جب بستی کے سارے جسم گوشت سے خالی ہو گئے تھے -تاریخ اس راز کو جاننے سے قاصر رہی اور نہ ہی یہ بات پتہ چل سکی کہ ایک بستی اس طرح تباہ ہو گئی -ہزاروں سال بعد آثار قدیمہ کے ماہرین جب یہاں آئے تو وہ یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ یہ کون سی بستی تھی اور یہاں کون لوگ بستے تھے 'ایسی کوئی نشانی وہاں نہیں تھی جو بستی کی شناخت کرا سکتی- تھک ہار کر بالآخر تاریخ نے اسے "پراسرار بستی" کے خانے میں رکھ دیا حالانکہ بستی کی تباہی کی سب سے بڑی گواہ وہ دوسری عورت تھی جس کا جنم بی بی حوا کے بعد ہوا تھا -سب کچھ تباہ ہو گیا تھا مگر وہ اسی طرح بیٹھی سر جھکائے ہنس رہی تھی لیکن اپنے جنم کے بعد وہ کسی کو دکھائی نہ دی-

---

انجلا ہمیش- آبائی وطن 'ضلع بھدیا (بھارت) سکونت 'کراچی (پاک)

مگر چاندنی - ۲

احمد ہمیش
سوانح

حافظہ لوحِ محفوظ ہے کہ اُس پر دوعالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں
(حضرت بیدل کی مثنوی طلسمِ حیرت سے)

ایک پَل کو ایسا لگا کہ ٹوکری سے باہر بھری ہوئی ناشپاتیاں اور لیچیاں اُن بجنت ہلاک کئے گئے انسانی سروں میں تبدیل ہو گئی ہیں- بعد اس کے مجھے یاد نہیں کہ میرا سر چکرا رہا تھا یا میں آس پاس کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا یا کچھ دکھائی دے رہا تھا تو وہ کیا تھا! اتنا ضرور گمان میں آیا کہ حسنات چچا نے مجھے کندھے پر لادا- شاید میں پوری طرح بے سُدھ نہیں ہوا تھا یا مجھ میں کسی ناقابلِ برداشت منظر کو برداشت کرنے کی سکت بھی تھی- سوائے اس کے کہ جب حسنات چچا نے اپنے غصیلے مزاج کے خلاف مجھے میری امّاں کے سپرد کیا اور اماں نے بڑے لاڈ پیار سے گود میں سمیٹ لیا- بلمہ چچی نے جلدی جلدی گلاس بھرا ونٹایا ہوا ٹھنڈا دودھ لا کے میرے منہ سے لگا دیا- شکر ملا ہوا ٹھنڈا دودھ مجھے مزے دار بھی لگا تو یہ سب کچھ مجھے محض غیر ضروری سنبھالا دینے کے لئے کیا گیا ہوگا- ورنہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی- جب کہ ٹھنڈا میٹھا دودھ پیتے ہوئے ساتھ ہی مجھے یوں لگا' جیسے دم توڑتے ہوئے بوڑھے کنُجڑے کا خون دودھ کے اک اک گھُونٹ میں شامل ہو رہا ہے- مجھے ابکائی سی آئی مگر شاید دودھ کے سواد کا زیادہ اثر ہوگا' سو' ایک قطرہ بھی منہ سے باہر نہیں آیا- ہر چند ابھی مجھے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ آدمی کی ماں' جو اپنے بچّے کو اپنا دُودھ پلاتی ہے' وہ اس کے خون سے بنتا ہے- یا گائے' بھینس' جو اپنے تھنوں سے دودھ دیتی ہے' وہ اس کے خون سے بنتا ہے- مگر مجھے یہ جاننا شاید اس لئے ضروری نہیں تھا کہ ابھی آدمی یا جانور کے خون کے بارے میں کچھ جاننے سے زیاد محض نظری سطح کے کچھ وقوعے میرے مشاہدے میں آنے لگے تھے- مثلاً بوڑھے کنُجڑے کی ہلاکت کے کچھ دن بعد بھی کانپور کے کسی محلّہ میں جہاں ہندو اکثریت تھی' اس کی زد میں آئے ایک زخمی مسلمان لڑکے کو اُس کے ماں باپ اکھٹے سنبھالے ہوئے سائیکل رکشہ پر اسپتال لے جا رہے تھے' رکشہ حکیم تو کلی دواخانہ والی مین روڈ سے گزر رہا تھا- جب کہ اس گھڑی میں دواخانہ میں ہی حکیم صاحب کے پاس بیٹھا تھا- میں نے اتنا ہی

کو دیکھ کے روئے، تڑپے اور چلائے کتنا ہولناک کھیل رہی تھی۔قدرت اس کے ساتھ۔ صبح ہوتے ہوتے اس کا پورا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور ساتھ ہی فضا میں رونے، تڑپنے اور چلانے کی آواز ختم ہو گئی مگر وہ پوری رات ایک قیامت تھی جو اس شخص پر گزری اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بستی میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور انوکھا واقعہ تھا مگر حیران کن بات تو یہ تھی کہ آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ لوگ خوفزدہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کوئی ان دیکھی بلا صرف اس ایک آدمی کے لئے آئی تھی یا پھر پوری بستی پر وہ ان دیکھی بلا مسلط ہو گئی ہے۔اپنی نفسیاتی تسکین کی خاطر وہ لوگ ان دیکھی بلا کی زد میں آئے ہوئے اس شخص کے عیوب کریدتے اور اپنے آپ کو مطمئن کرتے کہ ہمارے اندر اس شخص میں پائے جانے والی برائیوں میں سے کوئی ایک برائی بھی نہیں ہے۔مگر اکارت گئی یہ نفسیاتی۔ تسکین روزانہ رات کو ایک ایک کر کے ہر شخص اس ان دیکھی بلا کی زد میں آتا گیا اور یوں کچھ ہی دنوں بعد پوری بستی گوشت بھرے جسموں سے خالی ہو گئی صرف ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے۔ "تو ان کو بھونچال نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔" (سورہ الاعراف۔۷۸) جس رات بستی کے آخری آدمی کا گوشت بھرا جسم ہڈی ہڈی ہوا تھا اس کے دوسرے دن انگنت چھوٹے چھوٹے کیڑے کچھ عرصے پہلے بستی کی زمین پر پڑنے والی دراڑوں سے زمین کے اندر جانے لگے۔پروردگار نے نہ جانے کہاں کہاں اپنی مخلوقات کو پناہ دے رکھی ہے کہ کسی کو کیا معلوم۔مگر وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے کب آئے، کہاں کہاں رہے اور پھر اس وقت واپس چلے گئے جب بستی کے سارے جسم گوشت سے خالی ہو گئے تھے۔تاریخ اس راز کو جاننے سے قاصر رہی اور نہ ہی یہ بات پتہ چل سکی کہ ایک بستی اس طرح تباہ ہو گئی۔ہزاروں سال بعد آثار قدیمہ کے ماہرین جب یہاں آئے تو وہ یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ یہ کون سی بستی تھی اور یہاں کون لوگ بستے تھے، ایسی کوئی نشانی وہاں نہیں تھی جو بستی کی شناخت کرا سکتی۔ تھک ہار کر بالآخر تاریخ نے اسے "پراسرار بستی" کے خانے میں رکھ دیا حالانکہ بستی کی تباہی کی سب سے بڑی گواہ وہ دوسری عورت تھی جس کا جنم بی بی حوا کے بعد ہوا تھا۔سب کچھ تباہ ہو گیا تھا مگر وہ اسی طرح بیٹھی سر جھکائے ہنس رہی تھی لیکن اپنے جنم کے بعد وہ کسی کو دکھائی نہ دی۔

اقبال ہمیش۔ آبائی وطن، ضلع بھدیا (بھارت) سکونت، کراچی (پاک)

مگر چاندنی - ۶

احمد ہمیش　　　　سوانح

حافظہ لوحِ محفوظ ہے کہ اُس پر دو عالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں
(حضرت بیدل کی مثنوی طلسمِ حیرت سے)

ایک پَل کو ایسا لگا کہ ٹوکری سے باہر بکھری ہوئی ناشپاتیاں اور لیچیاں اَن گنت ہلاک کیے گئے انسانی سروں میں تبدیل ہو گئی ہیں- بعد اس کے مجھے یاد نہیں کہ میرا سر چکرا رہا تھا یا میں آس پاس کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا یا کچھ دکھائی دے رہا تھا تو وہ کیا تھا! اتنا ضرور گمان میں آیا کہ حسنات چچا نے مجھے کندھے پر لادا- شاید میں پوری طرح بے سُدھ نہیں ہوا تھا یا مجھ میں کسی ناقابلِ برداشت منظر کو برداشت کرنے کی سکت بھی تھی- سوائے اس کے کہ جب حسنات چچا نے اپنے غصیلے مزاج کے خلاف مجھے میری اماں کے سپرد کیا اور اماں نے بڑے لاڈ پیار سے گود میں سمیٹ لیا- بلکہ چچی نے جلدی جلدی گلاس بھرا ونایا ہوا ٹھنڈا دودھ لا کے میرے منہ سے لگا دیا- شکر ملا ہوا ٹھنڈا دودھ مجھے مزے دار بھی لگا تو یہ سب کچھ مجھے محض غیر ضروری سنبھالا دینے کے لئے کیا گیا ہوگا- ورنہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی- جب کہ ٹھنڈا میٹھا دودھ پیتے ہوئے ساتھ ہی مجھے یوں لگا' جیسے دم توڑتے ہوئے بوڑھے کُنجڑے کا خون دودھ کے اک اک گھُونٹ میں شامل ہو رہا ہے- مجھے ابکائی سی آئی مگر شاید دودھ کے سواد کا زیادہ اثر ہوگا' سو' ایک قطرہ بھی منہ سے باہر نہیں آیا- ہر چند ابھی مجھے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ آدمی کی ماں' جو اپنے بچّے کو اپنا دُودھ پلاتی ہے' وہ اس کے خون سے بنتا ہے- یا گائے' بھینس' جو اپنے تھنوں سے دودھ دیتی ہے' وہ اس کے خون سے بنتا ہے- مگر مجھے یہ جاننا شاید اس لئے ضروری نہیں تھا کہ ابھی آدمی یا جانور کے خون کے بارے میں کچھ جاننے سے زیادہ محض نظری سطح کے کچھ وقوعے میرے مشاہدے میں آنے لگے تھے- مثلاً بوڑھے کُنجڑے کی ہلاکت کے کچھ دن بعد بھی کانپور کے کسی محلّہ میں جہاں ہندو اکثریت تھی' اس کی زد میں آئے ایک زخمی مسلمان لڑکے کو اُس کے ماں باپ اکٹھے سنبھالے ہوئے سائیکل رکشہ پر اسپتال لے جا رہے تھے' رکشہ حکیم توکلی دواخانہ والی مین روڈ سے گزر رہا تھا- جب کہ اس گھڑی میں دواخانہ میں ہی حکیم صاحب کے پاس بیٹھا تھا- میں نے انتہائی

دیکھا تھا کہ زخمی لڑکے کے پیٹ سے خون نکل رہا تھا۔ ایسے میں حکیم صاحب کی زبانی ہی وقوعہ کی تفصیل معلوم ہوئی تو نظر میں مسلمان لڑکے کے خون کی سُرخی اس کے چہرے کی بناوٹ سے ترکیب ہوتی ہوئی پہچان میں آئی تھی۔ تب مجھے ایک منظر وہ بھی یاد آرہا تھا۔

چار سال کی عمر کے دوران اپنے نانی انولیاں میں مَیں نے کچھ یوں دیکھا تھا کہ جب ظہیر نانا کے مکان کے بیچ کچھ ہم عمر بچے ایک عجب کھیل کھیل رہے تھے۔ اس طرح کہ ایک تگڑے بچے نے اپنے سے نسبتاً کم عمر بچے کے پیٹ میں چھری شاید کھال کی ابتدائی پرت میں گھُسو دی (اگر وہ اس کی کھال کے بھیتر بھونک دیتا تو گہرے گھاؤ سے وہ ہلاک بھی ہو سکتا تھا) تبھی خون ٹپکنے لگا تھا' اتنے میں ایک اور بچہ بھاگ کے گھر کے اندر گیا اور جلد ہی رُوکھے بھات (چاول) سے بھری تھالی لئے آیا اور اُسے جھٹ اُدھر کر دیا' جدھر بچے کے پیٹ کی کھال سے ٹپکنے والا خون تھالی کے بھات پر ٹپکنے لگا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ بچے ایک ساتھ کھیل کے جوش میں چلّا چلّا کے بولنے لگے۔ "اے تو ہُے گوس کا سوروا" (گوشت کا شوربہ)"۔ البتہ گھائل بچہ اپنے پیٹ پر زخم کی جگہ کو ہاتھ سے دبائے اذیت سے کراہ رہا تھا۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک لگا کہ مَیں پلٹ کے اپنے نانی ہالی گھر کی طرف بھاگ آیا۔ پھر بھی یہ پتہ نہیں چلا کہ ظہیر نانا کے گھر کے بڑوں نے بچوں کے ایسے خونی کھیل کی کیسے روک تھام کی۔ صرف اتنا ہی علم میں آیا کہ گھائل بچے کو ضلع بورڈ کے اسپتال لے جایا گیا اور جہاں اُس کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ مگر کئی دن جانور کے شوربہ دار گوشت کے پیالہ پر نظر پڑتے ہی مجھے اتنی وحشت ہوتی کہ مَیں آنکھوں کو ہاتھ سے مُوند لیتا۔ ایسے میں امّاں پیار دلار سے کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرتی تو صرف دال بھات کھا لیتا شاید میرے اندر اپنے دیہاتی مسلمانوں کے رہن سہن اور کھانے پینے میں خونی مار کاٹ جیسا کوئی تاثر جڑ پکڑ گیا تھا۔

وہی تاثر اب سات برس کی عمر کو پہنچ کے کانپور میں ہندو مسلم بلوے کے دوران ہندوؤں کے ہاتھوں گھائل ہونے والے مسلمان لڑکے کو دیکھتے ہوئے اس الجھن میں بدل گیا کہ جب ہندو بھی خونی مار کاٹ کر رہے ہیں تو آخر ان دنوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اجتماعی سرشت میں کیا فرق رہا ہوگا! یا اگر اسے میں اجتماعی نفسیاتی سطح پر سمجھنے کا اہل نہیں تھا تو مجھ سے کسی بڑے کا یہ رتبہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ مجھ جیسے بچوں کو سمجھا سکتا۔ مگر لگتا تھا ان دنوں بچے تو کیا ہندو مسلم بڑوں کی اجتماعی سطح پر اچھال کھاتے جوش کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ہندو جو عام طور پر گوشت خور نہ تھا بھلا وہ خونی بلوے کے دوران مسلمانوں کے گوشت میں چھری کیوں بھونکنے لگتے۔ پھر شاید اس کے جواب میں جہاں کہیں کسی گوشت خور مسلمان کو موقع ملتا' وہ کسی ہندو کے گوشت میں چاقو گھونپ دیتا کہ ایک ایسے ہی مسلمان پر میری نظر

اس حالت میں پڑی' جب وہ چمن گنج کی مین روڈ اور ذیلی روڈ کے کونے والی جامع مسجد میں عصر کی نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کر رہا تھا' آستین کسی ہندو کے خون سے بھیگی ہوئی تھی اور چاقو پاجامے کے نیفے میں اُڑسا ہوا نصف جھلک دے رہا تھا۔ اسی شام مغرب کی نماز کے ذرا بعد حکیم توکلی کی دو منزلہ رہائش کی ذیلی روڈ پر کھلنے والے دروازے پر میں کھڑا تھا' جب ایک حلوہ فروش اپنے ٹھیلے پر پٹرومیکس کی روشنی میں کسی خاص قسم کے حلوہ کی تھال رکھے کچھ یوں صدا لگا رہا تھا : حلوہ ہمارا جو کھائے گا وہ جنّت میں جائے گا یعنی حلوہ فروش اپنی دانست میں جنّت کی لالچ دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ بھلا اس حلوہ میں کیا خاص بات تھی کہ اسے کھانے والا جنّت میں چلا جاتا۔ جب کہ اب تک میں نے اتنا ہی سن رکھا تھا کہ آدمی مرنے کے بعد جنّت میں جاتا ہے۔ وہ بھی نیک اعمال کے صلہ میں ہی جنّت ملتی ہے۔ مگر اس سنی سنائی جنّت کا ابتدائی تصور ذہن میں کچھ ایسا سمویا ہوا لگتا کہ گویا جنّت صرف مسلمانوں کی ہی ہوگی' جس میں شہد اور دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ طرح طرح کے پھل دار میوے بہ کثرت ہوں گے۔ نیک مسلمان مردوں کے لئے حوریں ہوں گی۔ یہاں یہ بھی ذکر ناگزیر ہے کہ میری نانی کے بطن سے آخری اولاد ان کی جو بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام جنت رکھا گیا۔ جنت خالہ میری اماں کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ تاہم مسلمانوں کی جنت کے نقشہ سے میں اس حد تک سوچ پایا تھا کہ ان دنوں پاکستان بننے کے ساتھ ہی اسے جنت ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس طرح کہ ہماری بچکانہ سوچ میں پہلے ہی سے جنت کسی نامعلوم آسمانی فاصلہ پر باور کرائی جاتی۔ سو میں اکثر یہ دیکھ کے حیران ہوتا رہتا کہ کسی مسلمان کا مردہ جسم زمین کی مٹی میں کھودے گئے گڑھے (قبر) میں دفن ہونے اور منکر نکیر کے حساب کتاب کے بعد آخر کیسے ایک نامعلوم اوپر والی جنت میں چلا جاتا! اس طرح ہماری بچکانہ سوچ میں یہ بات بھی در آئی کہ پاکستان والی جنّت بھی کسی نامعلوم فاصلہ پر ہوگی اور ہندو مسلم بلوے میں جو کوئی مسلمان ہلاک کیا جاتا' تو آخر وہ قبر سے اٹھ کے پاکستان کی جنّت کیسے پہنچ جاتا! اس طرح میں یہ بالکل نہیں سمجھ پاتا کہ آخر کوئی ہندو مرنے کے بعد جنت میں کیوں نہیں جاتا! اب تک میں نہ ہندوؤں کے سورگ اور نرک کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔

مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ اگست ۴۷ کے دوران ہندو مسلم بلوے کی انفرادی و اجتماعی سرشت سے بنتی ہوئی ہنگامی شکلیں کیسی رہی ہوں گی! ان دنوں کے کسی ہندو گھر کے بچے کی شکل کیسی رہی ہوگی! پھر ہنگامی نفسیات کے ملے جلے اثرات روزمرہ کے عام رہن سہن پر کیا پڑ رہے ہوں گے! یہاں سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے یہ تو یاد رہ گیا کہ شاید میری آنکھوں سے میرے ماتھے تک کوئی افق کھنچ آیا تھا۔ دن کے دوران اس کے ان دیکھے سروں کے باوجود مثل ایک اودے نیلے پردے کے...... کہ جس پر نمودار

ہونے سے پہلے ہی ستاروں کی دمک ہو رہی تھی- جب کہ انجانے میں باور کرایا جارہا تھا کہ اس پردے کے پیچھے ہی تو پاکستان ہے اور شاید وہی جنت ہے!

ایک خیالی پردے پر خیال ہی خیال میں پاکستان کی جنّت کا نظارہ کرنے کی میری بچگانہ مسلمانیت کو کسی بڑے کی رہنمائی میسر نہیں تھی- پھر یہ کہ اگست کا مہینہ ختم ہوتے ہوئے یا تو بلوائی اثرات مندمل ہو چلے تھے یا آئندہ کسی متوقع بلوے سے پہلے کا عارضی سکون دینے والا وقفہ تھا- تبھی ایک روز شام ڈھلے حسنات چچا، چچی، پھوپھی، میری اماں اور مجھے کانپور کے ایک سینما گھر (نام یاد نہیں) شائد فلم "پکار" دکھانے کے لئے بڑے اہتمام سے لے گئے- سینما ہال میں سب سے پچھلی سیٹوں پر ہم بیٹھے تھے- اک دم اندھیرا ہوتے ہی میری نظروں میں جو روشن پردہ آیا، وہ خیال میں دیکھے ہوئے پاکستان کی جنّت والے پردے سے کچھ مشابہ تھا- مگر جب اس پردے پر بولتی اور حرکت کرتی ہوئی تصویریں دکھائی دینے لگیں تو پہلے وہ تصویروں کی بجائے سچ مچ کے مرد اور عورت کے جسم لگے (ایک بے پناہ حسین عورت، جس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ پری چہرہ نسیم تھی) مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پردے سے باہر کیوں نہیں نکل پارہے تھے! گویا میرا تجسس میری عمر کے مطابق اپنی جگہ تھا- مجھے یاد نہیں کہ ان دنوں گرامو فون اور ریڈیو کے بعد بولتی فلم میرے علم میں کیسے آئی! البتہ مجھے یاد آیا کہ پچھلے سال ہی میرے گاؤں بالسپار میں ایک روز بائسکوپ والا آیا تھا اور گونگی تصویروں والے ہینڈل کو گھماتے ہوئے مجھ سمیت کچھ بچوں کو جب وہ ایک تصویر یہ بولتے ہوئے دکھا رہا تھا- "یہ بارہ ۱۲ من کی دھوبن دیکھو" - تو اچانک عقب سے ابوّل دادا آدھمکے اور لگے زور زور سے ہمیں گرجنے! مارے ڈر کے بائسکوپ والا تو بھاگ گیا اور بچے بھی- جب کہ میں بھاگ نہ سکا- انہوں نے میری پیٹھ پر تابڑ توڑ دو تین دھپے لگائے اور کڑے لہجہ میں سرزنش کرتے ہوئے تصویر دیکھنے کو گناہ اور تصویر بنانے والے کا جہنمی انجام کچھ یوں بتایا کہ قیامت کے روز اللہ میاں اس میں جان ڈالنے کا حکم دیں گے اور جب وہ جان نہیں ڈال سکے گا تو اسے جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا- گزشتہ سال کے اس واقعہ کی یاد دھیان میں کیا آئی کہ کانپور کے سینما ہال میں فلم دیکھتے ہوئے میں دل ہی دل میں لرزنے لگا...... کہ مبادا ایسے میں ابوّل دادا یہاں بھی آن پہنچے تو پردے پر بولتی اور حرکت کرتی تصویریں دیکھنے پہ تو وہ بہ یک وقت حسنات چچا، چچی، پھوپھی، اماں اور مجھے غرض کہ اکٹھے سب کو دھنک دیں گے تاہم یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر حسنات چچا کیوں نہیں ڈر رہے تھے! ان کے چہرہ پر تو فلم سے لطف اندوز ہونے کا تاثر جھلک رہا تھا- ذرا سوچنے پر میں یہی اندازہ کر سکا کہ حسنات چچا اور ابو دادا کے درمیان بڑا فاصلہ تھا- ابوّل دادا بالسپار نے تن تنہا کانپور تک سفر نہیں کر سکتے تھے- پھر یہ کہ ان دنوں سینما دیکھنے کی تفریح کا فیشن نیا نیا شروع ہوا

تھا-ایسے میں حسنات چچا جیسے بینک کے نوجوان کلرک کی نئی نئی شادی شدہ زندگی میں سینما واحد تفریح تھی- ہر چند ان کے مزاج پر اول داد اکی سخت گیری کی بڑی چھاپ تھی- پھر بھی سینما دیکھنے بلکہ گھر بھر کو دکھانے کی حد تک ان کا نرم پڑ جانا ایک طرح سے خوش گوار اتفاق تھا- جب کہ رات کے بارہ بجے آخری شو ختم ہوا تھا اور سینما ہال سے نکلتے ہوئے دوسرے تماشائیوں کی طرح حسنات چچا ہم سب کو ہمراہ لئے یکے پر سوار واپس گھر کو چلے تو لگا جیسے سینما دیکھنا گناہ تھا- اس رات نچلی منزل پر شاید بستر بچھونے کی سہولت نہ ہونے کے سبب مجھے اوپری منزل حکیم صاحب کے سامان والے کمرے میں سلا دیا گیا- چارپائی ایک ہی تھی- اندھیرے میں میں نے ٹٹولا کہ بھلا پہلے سے کون چادر اوڑھے ہوئے لیٹا ہوا ہے-اک دم اندازہ ہو گیا کہ وہ تو شفیع نوکر تھا- معلوم نہیں کیوں یکایک اس کی سانس تیز تیز چلتی ہوئی میری گردن پر محسوس ہوئی! مگر مجھے شدید گھٹن نے کچھ ایسا حصار کیا کہ میں کچھ دیر اس کے ہاتھوں کی کاروائی کو روک نہ سکا- پھر بھی شاید مجھ میں عود کے آنے والی فطری مدافعت نے سنبھالا دیا اور میں اس سے خود کو چھڑا کے اندھیرے میں ہی کمرے کے دروازہ سے نکل بھاگا تو زینہ اور حکیم صاحب کی خواب گاہ والے کمرے سے ملے ہوئے فرش پر منہ کے بل گر پڑا- اس طرح گرنے کی آواز سے شاید حکیم صاحب اور اُن کی اہلیہ بیک وقت جاگ گئے- تبھی میں نے خود کو اس حالت میں پایا کہ حکیم صاحب کی اہلیہ نے باہری دیوار والے بجلی کے بلب کو روشن کیا اور جھٹ مجھے سمیٹ کے اٹھایا- شفیع نوکر بھی بستر سے اٹھ کے آکھڑا ہوا- تو میں اس کی طرف غصہ سے تکنے لگا- حکیم صاحب کی اہلیہ نے شاید کچھ سمجھنے کے انداز میں اس سے باز پرس کی تو وہ کچھ بولا نہیں' سر جھکائے کھڑا رہا- بس کیا تھا' انہوں نے اُسے زور سے تھپڑ مارا بلکہ پرے دھکیل دیا اور مجھے تھامے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئیں- پہلے انہوں نے میری ناک اور ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کو ململ کے کپڑے سے صاف کیا' حکیم صاحب سے اسپرٹ کی بوتل طلب کی اور ذرا سی اسپرٹ روئی کے پھاہے کو تر کر کے میری ناک اور ہونٹوں کے گھاؤ پر لگائی- چُھر چُھراہٹ ہونے لگی پھر جلد ہی آرام آگیا- حکیم صاحب نے اپنی اہلیہ کو اشارے سے مجھے دوسرے پلنگ پر سلانے کی ہدایت کی اور کمرے میں ذرا دیر کے لئے روشن کئے گئے بلب کو آف کر دیا- میں نے انتاہی محسوس کیا کہ نسوانی ہاتھ کے ملائم دبیز حصار میں مجھے بڑی راحت بخش نیند آئی-

(مسلسل)

سویرا ہوا اور گرد و پیش میں پھیلتے ہوئے اجالے نے مجھے جگایا تو یہ جاگنا اوپری منزل سے نچلی
منزل تک آکے اماں کے ہاتھوں منہ دھلوانے اور آلو کی بھجیا روٹی والا ناشتہ کرنے سے زیادہ اثر نہ رکھ سکا
گذشتہ رات کے ابتدائی نصف حصہ میں کانپور کے سینما ہال کے پردے پر دیکھی ہوئی فلم سے زیادہ ہال میں
کیے گئے اندھیرے نے پھر میرے دھیان کو اسیر کر لیا۔ لگتا تھا میری سوچ کی بچکانہ رسائی فلم شروع سے پہلے
پورے ہال میں اچانک اندھیرا کر دینے کی ان دیکھی کاروائی تک ہوئی ہوگی اور اس سے اندھیرا میرے ابتدائی
احساسِ گناہ میں سما گیا ہوگا۔ اب کیا تھا، کانپور شہر میں وقت بے وقت بلکہ بیشتر دن کے اجالے میں بانسپار گاؤں
اور اس کے آس پاس کے گاؤں کے ایک ڈیڑھ سال پہلے کے دیکھے ان دیکھے، سنے ان سنے وقوعے یاد آنے
لگتے اور اکثر ان سے اندھیرا ہی منسلک ہوتا۔ اس میں گاؤں کی کسی گھر کی چوکھٹ، کوٹھے، دالان، باغ،
بنسواڑی اور برساتی گڑھے کے کنارے سانپ بچھو ڈستے ڈنک مارتے پھرتے ــــ اندھیرے میں ہی
کوٹھریوں کے بھیتر ایک دوسرے کے مختلف رشتوں میں دراڑ ڈالتی زنانہ و مردانہ آواز، کانا پھوسی، کھسر
پھسر، سرسراہٹ، پچر پچر اور کھچ پچ کھچ پچ سنائی دیتی۔ یعنی رات کے اور دن میں کسی آڑے ترکیب کیے
گئے اندھیرے میں ہونے والے، یہ مختلف گناہ رہے ہوں گے، جو میری یادداشت میں باقی رہ گئے۔ مگر میری
سمجھ میں نہ آتا کہ اب تک مجھ سے تو کوئی گناہ اندھیرے میں دراڑ ڈالنے والا نہیں ہوا تھا۔

ظاہر ہے، ابھی میری عمر ہی کیا تھی! پھر بھی میں ایسا کوئی گناہ کرنا چاہ رہا تھا اور نہیں بھی! ......
نہیں، اس لئے کہ بہ یک وقت اول دادا، ابا اور حسنات چچا کا ڈر تھا۔ اور اس ڈر کے اوپر انتہائی اوپر ایک بہت بڑا
ڈر اللہ میاں کا تھا اور اللہ میاں کا ڈر تو کبھی کبھی اتنا طاری ہو جاتا کہ ایک دن مجھے معلوم نہیں کیا سوجھی، جو میں
نے حسنات چچا کی دواؤں والی الماری سے ٹنکچر آئیوڈین کی بوتل اور مٹھی بھر روئی نکالی اور نیچے فرش پر رکھ کر
لگا روئی کو ٹنکچر سے بھگونے۔ پھر اسے اپنے سینے پر عین دل کی جگہ چھوپ چھوپ کے خود کو یہ باور کرانے لگا
کہ گویا ٹنکچر میں بھیگی ہوئی روئی اللہ میاں سے ڈرے ہوئے دل میں اتر جائے گی۔ تبھی بے خیالی میں کہنی لگنے
سے ٹنکچر آئیوڈین کی بوتل لڑھک گئی، بوتل ٹوٹی تو نہیں ــــ مگر ٹنکچر کی کثیر تعداد فرش پر پھیل گئی۔ یہ
دیکھ کے مجھے بڑی گھبراہٹ ہوئی، بے اختیار میں رو پڑا۔ اتنے میں چچی، اماں اور پھوپھی کو پتہ بھی چل گیا۔
پھوپھی نے جلدی جلدی پانی سے فرش کی دھلائی کر دی۔ مگر تازہ تازہ دھلائی کے ساتھ ٹنکچر کی بو محسوس
ہو رہی تھی اور تبھی حسنات چچا دفتر سے آگئے۔ انہوں نے ناک سکیڑی اور بہ ظاہر سب کے چہروں کے تاثر کو
نوٹ کیا اور کچھ پوچھے بنا صرف مجھے گھور کے کپڑے بدلنے ساتھ کے کمرے میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد نکلے
اور مجھے قریب بلا کے ۱۱ سے ۲۰ تک کا ٹیبل سنانے کا ایک طرح سے حکم دیا۔ گو مجھے ۱۷ اور ۱۹ کو چھوڑ کے ۱۱

کے بعد باقی سب ٹیبل اچھی طرح یاد تھا۔ مگر معلوم نہیں کیوں اکا ٹیبل سناتے ہوئے نمبر ۲ پر ہی اٹک گیا! بس کیا تھا! اس پر لات گھونسوں سے میری پٹائی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ حسنات چچا نے شدید غصہ میں مجھے فرش پر پٹک دیا۔ اس طرح فرش پر پٹکے جانے اور میرے چیخنے چلانے کی آواز سن کے اماں آگئی اور اب کی بار اس نے کڑے لہجہ میں احتجاج کیا اور شائد رشتہ میں بڑے ہونے کے ناتے اس نے حسنات چچا کو مزید کچھ کرنے سے روک دیا یا خود حسنات چچا بھابھی کے رشتہ کا لحاظ کر گیے۔ پھر بھی کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مجھے اور منے ننھے کو ساتھ لئے حکیم توکلی کی نچلی منزل کے دروازہ سے باہر روڈ پر نکل آئی۔ اس حالت میں کہ دائیں بازو سے ننھے کو بغل میں اٹھالیا اور بائیں ہاتھ میں استعمال میں لانے والے کپڑوں کا جھولا لٹکالیا، ضرورت کی چیزوں کی ایک بندھی پوٹلی میری ہاتھ میں تھما دی۔ جب کہ منے میرا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ کچھ دور آگے بڑھ کے کسی بزرگ سے بیگم گنج کا راستہ پوچھا۔ پھر ہمیں ہمراہ لئے چلتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اماں جو بانسپار اور انولیاں، دونوں جگہ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی عورت تھی، اس میں معلوم نہیں کیسے کانپور جیسے شہر کی راہ پر پیدل چلنے کی ہمت آگئی تھی! بیگم گنج پہنچ کے کسی راہگیر سے مطلوبہ مکان نمبر اور گلی کا پتہ پوچھا تو اس نے ہمدردی میں خود ساتھ چلتے ہوئے رہنمائی کی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے نیر کے رہنے والے علی امام ماموں کے گھر پہنچی۔ انہوں نے اماں کو (ساماں آپا) سے مخاطب کرتے ہوئے بڑی عزت سے استقبال کیا، ہم تینوں بھائیوں کو باری باری سے سنبھالے ہوئے کاٹھ کی چند سیڑھیاں طے کر کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر جا بٹھایا۔ اماں نے اُن سے ساری بپتا کہہ سنائی۔ انہوں نے بڑی ڈھارس بندھائی، ان کی بیوی نے جلدی جلدی چارپائی پر ہی دستر خوان بچھا کے کھانا لگایا۔ ان کے بچے بھی پانی پلانے میں جٹ گیے۔ ابھی ہم کھانا کھا کے بیٹھے تھے کہ حسنات چچا ہمیں واپس لینے آئے۔ مگر اماں نے یہ کہہ کے صاف انکار کر دیا کہ وہ حکیم توکلی کے یہاں نہیں جائے گی بلکہ چند دن کانپور ٹھہر کے سیدھے موضع بانسپار کی ہی راہ لے گی۔ حسنات چچا جھلا کے واپس چلے گیے۔ کچھ دن بعد پھر آئے تو انہوں نے علی امام ماموں کو کانپور سے ہمارے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن بلتھر روڈ تک کے کرایہ کی رقم دینے لگے۔ مگر علی امام ماموں نے رقم لینے سے صاف انکار کر دیا اور حسنات چچا کو یہ کہہ کے واپس کر دیا کہ ساماں آپا اور بچے ان کے عزیز مہمان ہیں۔ وہ انہیں خود ہمراہ لے کے بلتھر روڈ اور بانسپار جائیں گے۔ میں نے اتنا محسوس کیا کہ وہ اماں کو اپنے موضع انولیاں کی عزت سمجھتے ہوئے ہر طرح سے تحفظ دے رہے تھے۔ ہم ان کے گھر میں چند دن اور مہمان ٹھہرے۔ انہوں نے ہمیں کانپور کی سیر بھی کرائی۔ تاہم مجھے کئی جگہوں کے نام یاد نہیں رہے سوائے لال املی کے!

ستمبر ۷۲ء کے کسی دن کی شام ہوگی، جب علی امام ماموں کے ہمراہ اماں اور ہم تینوں بھائی ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس بار ہمیں کانپور سے گورکھپور اور بھٹنی ہوتے ہوئے بلتھر اروڈ تک تین ٹرینیں بدلنی پڑیں۔ آخر میں دوسرے دن دوپہر بارہ بجے ہم بلتھر اروڈ پہنچے۔ اب توقع تو یہ تھی کہ گاؤں واپسی پر ابا جب اماں اور ہم تینوں بھائیوں کو دیکھیں گے تو سرپرستانہ اطمینان کا اظہار کریں گے۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہوا۔ مسجد سے ظہر کی نماز ادا کر کے وہ باہر نکلے تو میں نے انہیں سلام کیا۔ پھر بھی سلام کا جواب بڑی بددلی سے دیتے ہوئے بولے "حسنات بابو! تیرے چچا ہیں۔ وہ تجھے مارتے پیٹتے۔۔۔ کاٹ ڈالتے۔۔۔ تجھے اف نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تیری ماں نے کانپور میں علی امام کے گھر جا کے اچھا نہیں کیا"۔۔۔ یہ سن کے مجھے ابا کے سامنے کھڑے ہونے کی تاب نہیں رہی۔ وہ نماز پڑھ کے گھر میں داخل ہوئے تو سراپا غصہ میں تھے۔ ان کے ہاتھ میں حسنات چچا کا کچھ دن پہلے کا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ تھا۔ انہوں نے پوسٹ کارڈ میں لکھی ہوئی شکایتی تحریر اماں کو سناتے ہوئے ایک طرح سے جواب طلب کیا۔ مگر اماں کچھ بولی نہیں۔ چپ چاپ روتی رہی۔ بلکہ اسی حالت میں سفر کی تھکان اتارنے کی بجائے اس نے دوپہر کا کھانا پکایا۔ ویسے کھانا معمول کے خلاف دیر سے پکا۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ ابول دادا اور ابا نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ جب کہ ابول دادا کے تمتمائے ہوئے چہرہ کے تاثر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کا علم انہیں بھی ہو چکا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ انہوں نے معلوم نہیں اپنے غیض و غضب کا اظہار پاؤں پٹک پٹک کے کیوں نہیں کیا!

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک بہت ہی ہولناک واقعہ سننے میں آیا۔ موضع ابھاؤں کی ملکیت میں شیشم کے پیڑوں والا ایک باغ ریلوے لائن کے ذیلی پل اور تال سے ملی ہوئی پٹی پر تھا اور وہ ابھاؤں والوں کا قبرستان بھی تھا۔ قبروں پہ شیشم کے پیڑوں کا سایہ بھی پڑتا تھا۔ جب کہ پیڑوں پر کبھی لال منہ والے بندر اور کبھی کالے منہ والے لنگور ڈالی ڈالی اچھلتے کودتے رہتے تھے۔ ایک دن لگ بھگ دوپہر سے ہونے کو کچھ یوں ہوا کہ کوئری ذات کی ایک ہندو بیاہتا جوان عورت ذیلی پل والی کچی سڑک سے مرکھا پور جا رہی تھی۔ ابھی وہ سڑک سے اتر کے شیشم کے پیڑوں والے باغ اور قبرستان کے نیرے کھیتوں کی پگڈنڈی سے گزرنے کو تھی کہ اسے کالے منہ والے لنگوروں نے آلیا اور اسے گھسیٹ کے شیشم کے پیڑوں اور قبروں کے بیچ لے گئے اور اس کی ساڑی کو نوچ پھینکا۔ یہاں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بہ یک وقت کتنے لنگوروں نے قبضہ میں آئی ہوئی آدم زاد مادہ سے زبردستی سنگمی کی۔ جب کہ وہ مظلوم زور زور سے چلا رہی تھی مگر شائد اس کی آواز نہیں سنی گئی۔ بہت بعد میں پتہ چلا تو کوئری مرد وہاں پہنچے اور ایک قبر کے پاس پڑی ہوئی زخمی ننگی بے ہوش عورت کو کھاٹ پر لاد کے جلدی جلدی ضلع بورڈ کے اسپتال لے گئے۔ اس دوران یہ بھی سننے میں آیا کہ پہلے

تو کوئری ذات کے ہندوؤں کو اہاؤں کے مسلمانوں کی ملکیت کے حوالے سے شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو کہ باغ اور قبرستان کی آڑ میں کچھ مسلمانوں نے ہی ۶ عورت مذکور سے زور زبردستی کی ہو۔ اس پر ممکن تھا کہ اصل واقعہ جانے بغیر ہندو مسلم بلوا ہو سکتا تھا۔ مگر وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ بے ہوش عورت کو مرنے سے پہلے بس اتنا ہی ہوش آیا تھا کہ ضلع بورڈ کے ڈاکٹر اور اہاؤں تھانے کے تھانیدار کی موجودگی میں اس نے اپنے اوپر کیے ہوئے ظلم کا الزام کالے منہ والے لنگوروں پر ہی لگایا۔ البتہ اس کا جسم مرتے ہی ناف تلے سڑ گیا تھا۔ تاہم بنا کسی شور شرابے کے اس کی ارتھی اٹھائی گئی۔ اور گھاگھرا ندی کے کنارے شمشان گھاٹ پر چتا کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ لنگوروں کو آسانی سے پکڑا جا سکتا۔ سوائے اس کے عام اندھ وشواسی ہندو ہنومان جی کی پوترتا کے حوالے سے ہاتھ جوڑ جوڑ کے مذکور لنگوروں سے بھی شردھا جتانے لگے۔ انہیں کسی نے یہ باور کرایا کہ وہ ہندو کوئری عورت دراصل راون کی بہن سُپنکھا کا جنم روپ تھی۔ اسی لئے اسے ہنومان جی کی طرف سے سزا دی گئی جب کہ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ سپنکھا، رام کے بھائی لچھمن سے کام وَاسنا وِش وِواہ کرنا چاہتی تھی۔ اس پر لچھمن نے اس کی ناک کاٹ دی تھی۔

ایسے ہی کئی دیکھے اور کئی سنے ہوئے واقعوں کا علم مجھے شروع ہی میں ہو گیا کہ ہندوستانی سماج میں ہندو اور مسلمان مرد بہ یک وقت عورت کو حقیر جانور سمجھتے، انہیں طرح طرح سے استعمال کرتے اور ذلیل کرتے اور پھر کسی حیلے بہانے سے اسے مار ڈالتے یا اس حالت کو پہنچا دیتے کہ وہ خود ہی مر جاتی۔ اس طرح اماں کو جس حال میں دیکھ رہا تھا، کبھی کبھی مجھے اندیشہ ہوتا کہ مبادا وہ بھی رفتہ رفتہ موت کی کگار سے جا لگے۔ میرے آبائی خاندان میں دینداری کی سختیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جب کہ روزمرہ کے بیشتر معمولات میں عورت سے بدسلوکی کو کسی حدیث کے ذکر سے کسی طرح پردہ پوش کر دیا جاتا۔ مگر افسوس میں اسے شعور کی سطح پر لانے سے قاصر تھا۔ مگر جب میں یہ دیکھتا اور محسوس کرتا کہ اماں، شوہر سے وفاداری اور بچوں سے پیار کے علاوہ دوسروں سے بھی ہمدردی اور محبت کا سلوک کرتی تو میں یہ سوچ کے حیران ہوتا کہ کیا میرے باپ دادا کو دینداری نے وفاداری، ہمدردی اور اور محبت کا سلوک کرنا نہیں بتایا!

جاڑا شروع ہوا تو گھر میں صغرا پھوپھی کی شادی کی تیاری ہونے لگی۔ یعنی ۱۹۴۷ء کے آخری عرصہ کے دوران سلطان پور کے ضلعدار سید عبدالرؤف کے صاحبزادے سید عبدالقدوس، جو چچی کے بھائی ہونے کے ناتے حسنات چچا کے برادر نسبتی تھے، انہیں سے صغرا پھوپھی کی شادی ہوئی۔ یہ شادی، نکاح کی رسم سے دولہن کی سلطان پور مع جو تھیا رخصتی بلکہ بلتھرا روڈ سے شاہ گنج ریل کے سفر اور لاری پہ سلطان پور تک سفر اور وہاں مزید چوبیس گھنٹے کی رسوم کے دوران بڑی خوشگوار رہی۔ البتہ تمام چہل پہل اور رونق

میں جو تاثر زیادہ نمایاں نظر آیا، وہ تھا نوشہ سید عبدالقدوس پھوپھا کا زندہ دلی سے قہقہے لگانا، بے تکلف، پُر مزاح لہجہ میں بات کرنا، جو تھیار میں شامل میں واحد چیز تھا، جو قدوس پھوپھا کو بہت پیارا دلارا لگا۔ انھوں نے مجھے سلطان پور میں بڑی تفریح کرائی اور بہت ہنسایا۔

۲۴ گھنٹے گزار کے سلطان پور سے بڑی لائن والی ٹرین پر سویرے سویرے روانگی ہوئی تو لگ بھگ سبھی خوش خوش تھے۔ زنانہ ڈبے میں چند روز کی نئی نویلی دولہن صغرا پھوپھی کے ساتھ مجھے بٹھایا گیا ڈبہ بالکل خالی تھا۔ جب کہ اگلے مردانہ ڈبے میں لباسوار ہوئے۔ چند اسٹیشنوں تک سفر کے دوران سب کچھ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ میری نظر کھڑکی کے باہر ہریالی کے منظروں پر تھی کہ اچانک ٹرین کسی ایسے اسٹیشن پر رکی، جہاں معلوم ہوا کہ وہ عام حالات میں رکتی نہیں تھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گالی گلوچ اور ہلے اور شور کی آواز کے ساتھ زنانے ڈبہ میں مختلف عمروں کے کھلے لمبے بالوں مگر خوبصورت ناک نقشہ والی شلوار قمیض میں ملبوس عورتیں سوار ہونے لگیں۔ لگ بھگ سبھی بڑی تندرست تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ڈبے کی تمام سیٹیں بھر گئیں۔ بہ ظاہر ایک بہت خوش تراش بیضوی شکل کی لمبی تڑنگی سرخ سپید رنگت والی عورت صغرا پھوپھی کے مقابل کی سیٹ کے پاس کھڑی مسلمانوں کو کڑی آواز میں گالیاں دے رہی تھی۔ شائد وہ اس طرح باقی اپنی جیسی عورتوں کی سرداری کر رہی تھی۔ اس نے صغرا پھوپھی اور میرے مسلمان ہونے کی پہچان کے ساتھ ہی ڈانٹ کے سیٹ چھوڑنے اور ڈبے سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ پھوپھی پہلے تو ڈر گئیں اور میں بھی رونے لگا۔ بلکہ میری نظر کھڑکی کے پاس ہی باہر کھڑے کئی لمبے تڑنگے، سر اور داڑھی کے کالے اور گھنے بالوں والے بھالو نما مُردوں پر پڑی۔ وہ زور زور سے کچھ یوں بول رہا تھے۔ "مار مسلوں کو۔۔۔ مار مسلوں کو" تبھی ڈبے کے اندر صغرا پھوپھی نے نرم لہجہ میں معلوم نہیں کیا کہا کہ مقابل والی عورت کے غیض و غضب میں کچھ کمی آئی اور وہ یوں نرم پڑتے پڑتے ایک دم مہربان لگنے لگی۔ ٹرین روانہ ہوئی تو ذرا ہی دیر میں شائد جمنا ندی کے پل سے گزری اور پھر جلدی ہی الہ آباد کے ریلوے پلیٹ فارم پر جا ٹھہری۔ اک دم لبا پر نظر پڑی، جو مردانہ ڈبے سے اتر کے زنانہ ڈبے کی طرف آرہے تھے۔ مگر بہت ڈرے سہمے ہوئے لگتے تھے جوں ہی ان کی نظر صغرا پھوپھی اور مجھ پر پڑی تو لپک کے آئے اور جلدی جلدی ہمیں ڈبے کے گیٹ سے نیچے اتارا۔ ہمیں زندہ اور سلامت پا کے انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اتنے میں عظمت بڑے لبا کی بہن جنی پھوپھو کے میاں عظیم پھوپھا نظر آئے، جو ریلوے پولیس میں تھے، شائد ہمیں الہ آباد میں اپنے ریلوے کوارٹر میں دن بھر ٹھہرانے کے لئے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ لبا اور ان کے درمیان سفر کے دوران پیش آئے ہوئے واقعہ کے بارے میں بات ہو رہی تھے۔ جسے سن کے مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ٹرین کے زنانہ ڈبے میں

اچانک سوار ہونے والی عورتیں سکھ عورتیں تھیں اور ڈبے سے باہر (مار مُسلوں کو) کے دہشت ناک الفاظ بولنے والے مرد سکھ مرد تھے۔ ابّا عظیم پھوپھا کو بتا رہے تھے کہ الہ آباد سے پہلے پل پر جب گاڑی گزر رہی تھی تو انہیں دو سکھوں نے ڈبے کے کھلے دروازہ سے باہر ندی میں پھینکنا چاہا۔ تبھی ساتھ ہی کھڑے ایک ہندو مسافر نے ہمت کر کے سکھوں کو ایسا کرنے سے روک دیا۔

شام تک عظیم پھوپھا کے ریلوے کوارٹر میں ابا، صغرا پھوپھی اور مَیں نے پُرسکون وقت گزارا۔ شائد یہ سکون، سکھوں کے متوقع حملے سے بچ جانے اور زندگی کی سلامتی کا سکون تھی۔ شام ڈھلے بلتھرا روڈ جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے بالکل خالی ڈبے میں ہم سوار ہوئے۔ اتنے میں قدوس پھوپھا بھی اسی ڈبے میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ شائد وہ ہمارے پیچھے کسی اور ٹرین سے الہ آباد پہنچے تھے۔

(جاری ہے)

شاعری

احمد ہمیش — مرقعِ ذات

پڑھی اور سنی جانے والی شاعری کے فرق کی تفصیل میں جانا محال ہے۔ تاہم وہ جو شاعری میں شاعری کی موجودگی لازم ہے، وہ صرف خلق کی جاتی ہے، ساختیات اور مابعد جدیدیت کے حربوں سے بنائی نہیں جاتی۔ اس ضمن میں سہ ماہی تشکیل کے گذشتہ شماروں میں خلق کی جانے اور پڑھی جانے والی شاعری کے کئی ناموں کے حوالے سے لکھا جاچکا ہے۔ اس بار نظم کی شاعری کے کچھ ایسے منتخب نام شامل ہیں، جو پڑھی جانے والی شاعری سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سلیم شہزاد، کے بی فراق، احتشام الحق شامی اور ناہید نظم۔ جب کہ شاہینہ فلک کی نظمیں پڑھی اور سنی جانے والی شاعری سے بہ یک وقت علاقہ رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی نظم "مشورہ" قابلِ ذکر ہے۔ یہی وصف نجمہ محمود، شہناز کنول اور سلمان صدیقی کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ البتہ گذشتہ شمارے میں نگار سجاد ظہیر کی نظم "سر برانیکا کی تنہا عورت" ...... ادھوری شائع ہوئی تھی تاہم اب کی بار ان کی نظم گھر کی طلب شائع کی جارہی ہے ۔ہاں! اس بار باسط عظیم، اطہر نادر، شاہد رضوی، شمیم روش، برجیس صدیقی، ہلال جعفری، تاج الدین تاجور اور سیماسراج کی غزلیں شعری معیار کے اعتبار سے شامل کی گئی ہیں۔ ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ نجم فضلی جو کہانی کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں؛ ان کے شاعر ہونے کی گم شدہ اہمیت کو ایک طرح سے دریافت کیا گیا ہے۔

ارشاد گرامی کے نام

مولانا حسن مثنیٰ ندوی

غزل

ایک مئے وہ ہے کہ جس کا دور میخانے میں ہے
ایک مئے اس نرگسِ شہلا کے پیمانے میں ہے

وحشت بیگانہ واری جس حقیقت کا ہے نام
آہوئے صحرا میں ہے یا تیرے دیوانے میں ہے

جام سر مینائے گردن اور شراب خون دل
کس قدر رنگین ساماں اپنے میخانے میں ہے

غیر کی چوکھٹ پہ جس کو ڈھونڈتے ہیں شیخ جی
ہائے وہ دولت تو خود اپنے ہی ویرانے میں ہے

لو مثنیٰ اور الجھتی جا رہی ہیں گتھیاں
ناخن تدبیر کیا مشغول سلجھانے میں ہے

مرسلہ: محمد سلمان چشتی (ابو الانشاء)

عرصۂ حیات: کراچی (پاک)

غزل

حنیف اسعدی

عمر بڑھتی ہے بڑھتی جاتی ہے
روکنے پر بھی رک نہ پاتی ہے

لمحہ لمحہ حیات کی منزل
منزلوں دور ہوتی جاتی ہے

میں مقیّد ہوں اور میرے گرد
ایک ماحولِ بے ثباتی ہے

میرے اندر ہے اک ہوائے انا
جو خودی کو خدا بناتی ہے

میں دعا کو دوا نہیں کہتا
یہ مرا اعتبارِ ذاتی ہے

ایک مانوس سی صدائے دوست
دل تلک ماورا سے آتی ہے

رات بے خواب رہ کے ساری رات
مجھ میں جلتے دیئے بجھاتی ہے

جاگتا ہوں تو میری نس نس میں
صبح کھلتی ہے مسکراتی ہے

حادثوں کا شکار ہو کے حنیفؔ
زندگی خود کو آزماتی ہے

حنیف اسعدی : سکونت : کراچی (پاک)

غزل

آنکھوں سے نمایاں ہے پیرایۂ فن اس کا ۔ ملبوسِ حریری سے چھلکے ہے بدن اس کا

مل جانے سے دونوں کے آسان ہوئی منزل ۔ تاریکیٔ شب میری ، تاروں کا چمن اس کا

احساس کے رنگوں سے گلنار ہیں سب چہرے ۔ خوشبو کی طرح برسا اعجازِ سخن اس کا

یہ دولتِ مجبوری کس در پہ عیاں ہوگی ۔ کس راہ پہ ٹھہرے گا سونے کا بدن اس کا

نغمہ تھا کہ جادو تھا ، خوش وقت کیا جس نے ۔ اب کون بتائے گا کس جا ہے وطن اس کا

شہروں سے اگر انساں نکلے تو کہاں جائے ۔ اس دورِ ترقی میں جنگل ہے نہ بن اس کا

یہ اپنی زباں نامی کیا نام و نسب کھولے

مشرق میں جڑیں اس کی ، مغرب میں چلن اس کا

نامی انصاری

۳۰ ر اپریل ۹۰ء

نامی انصاری : سکونت ، کانپور ۔ (بھارت)

ساجدہ زیدی — ایک نظم

وہ دردِ آرزو
جو لرزہ بر اندام کو پنہائے عالم میں
وہ حرفِ تشنگی جو نغمہ بہ لب تھا
دبستانِ شبِ غم میں۔
وہ اک دنیائے ناپید اکراں تھی
آسماں کی وسعتیں جس میں سمائی تھیں

بڑے گہرے سمندر موجزن تھے کرۂ دل میں
جنھیں خاموش کر ڈالا۔
بہت منھ زور موجیں تھیں۔
جنھیں خود ہم نے پابند سلاسل کر دیا اک دن
فراز کوہ سے آتے ہوئے بے تاب دریا تھے
جنھیں اک دائرہ میں رقص کرنا ہم نے سکھلایا۔

تقاضے ہوشمندی کے
ہمارے راہبر نکلے۔
فرازِ آرزو سے ہم
نشیبِ عافیت میں آن نکلے
اور سآلِ روز و شب کے بیش و کم میں گم ہوئے
مدوائے الم کوئی نہیں
نہ بزم نشاط و درد و غم کوئی نہیں۔
اک ہو کا عالم ہے۔

کھڑے ہیں ساحلِ ہستی پر ہم
جینے کے بے پایاں بہانے چھوڑ آئے
اک سکوتِ آہنی ہمراہ لے آئے
ہمارے یاد کے کشکول خالی ہیں۔

ساجدہ زیدی : سکونت : علی گڑھ۔ (بھارت)

ستیہ پال آنند

ختم ہونا شام کا

(۱)

• ختم ہونا شام کا اک مرحلہ ہے۔ رات کی اندھی چڑیلیں چیختی ہیں۔ آسماں کی گیلی رسی سے بندھے بے بس اندھیرے کالی قربانی کے بکروں کی طرح گردن بریدہ، نزع کے عالم میں گرتے، ہانپتے، دم توڑتے ہیں۔

• ختم ہونا آج کی شب کا بھی بھاری مرحلہ ہوگا۔ مجھے معلوم ہے۔ میں بیسویں منزل کے "کانڈو" میں کھلے ٹیرس میں تنہا، دور باہر دیکھتا ہوں۔ اوٹیاوا سی ہوائیں، دھند، دھوئیں تعفن کی بو سے لدی پھندی ہوئی، چہرے سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں، تو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں شیو پارک میں ہوں۔

(۲)

• صبح ہے پنجاب کے اس شہر میں، جس کے کسی شہر خموشاں میں مرا ماضی ابھی تک دفن ہے۔ یادوں کے کتبے لاعالم لوگ پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں، یہیں پر ستیہ پال آنند کا بچپن، لڑکپن اور جوانی اپنی ابدی نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔

• صبح ہے پنجاب کے اس شہر میں اس وقت، جس میں سائیکل، رکشے، سکوٹر دوڑ میں مصروف ہیں۔ لوکل بسوں کا آنا جانا جاری و ساری ہے۔ بچے مدرسوں کی سمت اپنے تیز قدموں سے رواں ہیں۔ زندگی معمول کی مانند چلتی جا رہی ہے۔

• جیسے ہیے پنجاب کے اس شہر میں ، جس کے کسی اک گھر میں تم بھی رہ رہی ہو۔

(۳)

• دیکھ سکتا ہوں کہ تم اپنی تنہائیں، اقتصادی مشکلوں کی داستانیں ، رات کی بے خوابیوں کی ڈائیریاں ، تکیئے کے نیچے ٹھونس کر اب اٹھ گئی ہو۔

• دیکھ سکتا ہوں کہ ٹھنڈا ، نیم جلا سا ٹوسٹ ، اک کپ چائے کا ، یہ ناشتہ اس جسم و جاں کی آبیاری کے لئے کافی نہیں ہے ، جو ضعیف العمر والد ، دائمی بیمار ماں کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پہ رکھ کر چل رہے ہیں۔

• دیکھ سکتا ہوں کہ تم اب آٹھ گھنٹوں تک پڑھاؤ گی کسی اسکول میں ... اور شام کو جب لوٹ کر آؤ گی تو ساری تکانیں ، وسوسے دن بھر کے ، اپنی سائیکل کے کیریر کے بنگیے میں پوشیدہ رکھ کر ، ہنستے چہرے سے کہو گی "ماں ، تمہارے واسطے ، انگور لائی ہوں - ذرا چکھ کر تو دیکھو ، ذائقہ کیسا ہے ان کا !"

• دیکھ سکتا ہوں ، تمہارے پھول سے چہرے پہ شکنیں پڑ رہی ہیں - دھوپ نے رنگت کو کچھ سنولا دیا ہے - اکا دکا بال ، چاندی کے کشیدہ تار سے ، دکھنے لگے ہیں - ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں - تم زیادہ عمر کی لگنے لگی ہو -

(۴)

• اوفیلیا نوسی پوراٹین مجھ کو پھر اک بار اپنے بیسویں منزل کے
کانڈو میں اکیلا لا بٹھتی ہیں، جہاں میں کالی قربانی کے بکرے
کی طرح باندھا گیا ہوں۔

• ختم ہونا شام کا اک مرحلہ ہے، جانتا ہوں

• ختم ہونا آج کی شب کا بھی بھاری مرحلہ ہوگا، مجھے معلوم
ہے یہ!

• ختم ہونا زندگی کا کس قدر آسان ہے۔ میں بیسویں منزل
کی اونچائی پہ ہوں، یہ جانتا ہوں!!

ستیہ پال آنند : سکونت، امریکہ

اطہر نادر

غزل

خود اپنے آپ سے میں نے یہی کہا کہ میں ہوں
مگر زمانے پہ کیسے یہ کھل گیا کہ میں ہوں

عجیب ہوتی ہے کیفیت جنوں کہ مجھے
ہر ایک سمت سے آتی ہے یہ صدا کہ میں ہوں

کبھی ملی ہیں زمانے سے راحتیں اتنی
کہ بارہا مجھے خود پر گماں ہوا کہ میں ہوں

تمام شہر ہی وحشت زدہ ہوا ایسا
کہ اب خیال میں یہ بھی نہیں رہا کہ میں ہوں

غم حیات نے حلیہ بدل دیا اتنا
کہ مجھ کو آتی ہے کہتے ہوئے حیا کہ میں ہوں

سمجھ رہا تھا کہ اب خود پہ اختیار نہیں
مری انا نے مگر حوصلہ دیا کہ میں ہوں

میں اپنے آپ سے خود کو چھپا سکا نہ کہیں
جہاں جہاں بھی گیا بس یہی سنا کہ میں ہوں

کسی کو دیکھ کے دل میرا اس طرح دھڑکا
کہ اپنے ہونے کا نادر یقین ہوا کہ میں ہوں

اطہر نادر : سکونت، کراچی (پاک)

ایک نظم - تمہارے نام

مصحف اقبال توصیفی

خزاں کی آہٹیں سن رہی ہو
میرا جسم بجھ رہا ہے
میری سانسوں کے پھول پتے
مرجھا رہے ہیں

میں وقت کی شاخ سے
نہ جانے کب ٹوٹوں
اور بکھر جاؤں
میری کتابیں 'باتیں 'تصویریں
کسی مائکرو فلم 'آڈیو ویڈیو کیسٹ پر
محفوظ کرلو
دیکھو - اب بھی وقت ہے

مگر وقت بہت کم ہے
مجھے آخری بار چھولو

میرے خیال کے سینے پر سر رکھ کر -
کمپیوٹر سے میری فلاپی نکال کر
اپنے بلاؤز کے گریبان میں ڈال لو
نہ جانے کب -
یہ پہاڑ 'جنگل 'شہر 'سمندر 'پاتال 'خلاء
(جنہیں میں نے جی بھر کے دیکھا تک نہیں)
لکیروں میں ڈھل کر
گھٹتے ہوئے دائروں
ایک ایسے نقطے میں سمٹ جائیں
جو اپنے ہی مرکز کی گہرائی میں ڈوب جائے !!!

مصحف اقبال توصیفی - سکونت ' حیدرآباد آندھراپردیش بھارت

غزلیں

پرکاش فکری

گرتے ہوئے پتوں کی بارش میں نہائیں چل
دکھ درد کے موسم میں اک جشن منائیں چل

ہم نے جسے سوچا ہے، جس خواب کو سینچا ہے
دنیا سے چھپانا کیا، دنیا کو بتائیں چل

وہ ناؤ جو کاغذ کی، بچپن میں بناتے تھے
اس ناؤ کی یادوں کو دریا میں بہائیں چل

جس باغ میں مدت سے جانا نہ ہوا اپنا
اس باغ کے پھولوں کی تصویر بنائیں چل

اب دل سے کوئی ایسی ترغیب نہیں ملتی
اوروں کی سنیں فکری اپنی بھی سنائیں چل

کتنے رنگوں میں ڈھلتے رہتے ہیں
کیوں یہ موسم بدلتے رہتے ہیں

جمتی رہتی ہے برف پیڑوں پر
جاں میں شعلے مچلتے رہتے ہیں

دل کی وحشت کا ساتھ دینے کو
ہم ہواؤں پہ چلتے رہتے ہیں

ہو کے شامل جہان والوں میں
ہم سے ناداں، بہلتے رہتے ہیں

خاک ویسے تو سب ہوا لیکن
خواب سینے میں پلتے رہتے ہیں

غم گساروں میں۔ یہ ستارے بھی
سنگ راتوں کے جلتے رہتے ہیں

دھوپ ایسی ہے ان دنوں فکری
جس میں سائے پگھلتے رہتے ہیں

پرکاش فکری — سکونت: رانچی (بہار) بھارت

نظمیں

اختر یوسف

شہر ایک

شہر
شام سے ہی تو ویران ہو جاتا ہے
عجیب...... حال ہو جاتا ہے
لوگ اپنے پڑاؤ کو بھاگتے ہیں
دکانیں بند ہو جاتی ہیں
شور شرابا جیسے اندھے کنوؤں میں ڈوب
جاتا ہے
سن سن کرتی ہیں اندھیری سڑکیں گلیاں
خوف سے جیسے ابھی ابھی کوئی دیو
آنے والا ہے
شہر...... دیکھنا
ایک دن یہ دیو تجھے ہی نگل لے گا

شہر دو

شہر...... تمہاری پیشانی پر گدھوں نے
گودا
تمہاری انکھوں پر کوؤں نے اپنے
نوکیلے پر
سیاہ مکروہ خوفناک لہولہان سینگوں سے
تمہاری اونچی ناک پتھروں سے مار کر نیچے
متورم ہونٹوں کی طرف جھکا دیے ہیں
سبز اور نوکیلی مکڑیوں نے ڈراؤنے جال
پھیلائے ہیں
تم، اب زبان نہیں کھول سکتے
کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے
چپ چاپ پتھر بھوگتے رہو اور
آنکھوں پر کوؤں کے نوکیلے پنجے بے بسی سے سہتے رہو
شہر
تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے

اختر یوسف : سکونت، رانچی (بھارت)

عبید اللہ علیم

عمل: عاطف علیم

عبیداللہ علیم

غزل

ان دنوں روح کا عالم ہے عجب
جیسے جو حسن ہے میرا ہے وہ سب

جیسے اک خواب میں نکلا ہوا دن
جیسے اک وصل میں جاگی ہوئی شب

دل پہ کھلتا ہے اِسی موسم میں
تم کسے کہتے ہو اور کیا ہے طرب

جس سے ہو جائے جہاں ہو جائے
بے محبت ہی محبت کا سبب

جاں فزا ہے جو صدا کرتے ہو
بوسۂ لب کی طرح بوسۂ لب

پہلے اک ناز ہوا ربط و گریز
اُس نے پھر بخشش و ایجاب کا سب

تم سا کیا ہوگا یہاں خواب کوئی
مجھ سا کیا ہوگا کوئی خواب طلب

کاش تعبیر میں تم ہی نکلو
جب کوئی خواب ہو تعبیر طلب

اُس کے مشتاق جہاں بھی دیکھو
ایک ہی نشّے میں ڈوبے ہوئے سب

سلسلے اُس سے جو مل جائیں تو پھر
ماورا ہو جاتے ہیں سب نام و نسب

لوگ موجود ہیں اب بھی جن کے
منہ سے جو بات نکل جائے ادب

سایۂ زلف میں مر جاؤ تو علیمؔ
کھینچ لے گا تجھے سایۂ رب

۳/۱۲/۹۱

تم آؤ گے

(عبید اللہ علیم کی نذر)

عشرت رومانی

کیا بات ہے اب تک روٹھے ہو
یوں نیند کی دیوی روٹھی ہے
"ویران سرائے" میں ساتھی
جب تم ہی نہیں تو پھر کیسے
گُل رنگ، گُل افشاں صبح لئے
گُل بار مہکتی شام لئے
تم خود ہی ذرا انصاف کرو،
جو آتا ہے وہ جاتا ہے
یہ "چاند سا چہرہ" کس کا ہے؟
احساس کے تپتے صحرا میں۔۔
تم آؤ گے اک روز یہاں
شب رنگ فضاؤں میں روشن
تم روٹھ گئے ہو آؤ گے
تم آؤ گے، تم آؤ گے،

یہ آنکھیں کتنی جل تھل ہیں
یہ آنکھیں اب تک بوجھل ہیں
اب کون یہاں پر آئے گا!
اب کوئی ہمیں بہلائے گا!
تم شہرِ غزل میں آئے تھے
تم خوشبو بن کر چھائے تھے
اس طرح بھی کوئی جاتا ہے!!
کیا جانے والا آتا ہے!
کس کی یہ "ستارہ آنکھیں" ہیں؟
یہ کس کی پھیلی بانہیں ہیں!
خوشبو بن کر، کاجل لے کر
جگنو لے کر، بادل لے کر
امید ہے اک دن آؤ گے
تم آؤ گے، تم آؤ گے!!

عشرت رومانی : گورنمنٹ، کراچی (پاک)

نذرِ علیم

صابر ظفر

کس ناز سے وہ آیا تھا کس ناز سے اٹھا
یعنی اٹھا جہاں سے تو اعزاز سے اٹھا

بیساکھیاں اٹھا کے نہ عالی ہوا کبھی
جب بھی اٹھا وہ اپنی ہی پرواز سے اٹھا

حاصل نہیں تھا اس کو خوشامد سے افتخار
وہ شخص تو ضمیر کی آواز سے اٹھا

حلقہ بگوشِ مشفقِ خواجہ سرا نہ تھا
مردانہ وار خود ہی تگ و تاز سے اٹھا

فرعونِ وقت کی نہ سند سے ہوا فراز
اپنی ہی خوش نوائی کے اعجاز سے اٹھا

اعزاز ہے وہی کہ جو مولا عطا کرے
منہ پھیرتا وہ دہر کی اغراض سے اٹھا

یہ خوئے جارحانہ کوئی عارضی نہ تھی
غیرت کا یہ خمیر تو آغاز سے اٹھا

ڈوبا ہوا تھا گرمیٔ انفاس میں کلام
شعلہ سا کوئی آتشِ الفاظ سے اٹھا

داد اس کی شاعری کی اگر چاہیئے مزید
مصرع کلامِ حافظِ شیراز سے اٹھا

جانا تھا اس کو یارِ وفادار کی طرف
دل تھامتا وہ دہرِ دغاباز سے اٹھا

دلبر بھی دل فگار ہے دشمن بھی اشکبار
وہ بزمِ ناز سے عجب انداز سے اٹھا

کیوں زندہ لوگ جیتے نہیں ہیں زیادہ دیر
پروردگار! پردہ تو اس راز سے اٹھا

درپیش تھا اسے سفرِ آخرت ظفر
دم لے چکا تو پہلوئے دمساز سے اٹھا

صابر ظفر : سکونت، کراچی (پاک

دل نواز دلؔ

۲۸۶

غزل

نہ کسی کے گھر کو خراب کر، نہ کسی کے در پہ خراب ہو
تو وہ کام کر کہ یہ زندگی، نہ کسی کی جاں کا عذاب ہو

نہ وہ بزم بھی کوئی بزم ہے، نہ وہ میکدہ بھی ہے میکدہ
کہ جہاں نہ عہدِ شباب ہو، کہ جہاں نہ دورِ شراب ہو

تمہیں اصلِ زر ہو اصالتو، ہمیں تلخ تر ہو حقیقتو
مجھے اب یقین ہے گماں ہو تم، نہ خیال ہو نہ ہی خواب ہو

مری چشمِ تر میں ہے تشنگی، ترے خونِ دل میں ہے بے خودی
مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، کوئی بحر ہو کہ سراب ہو

مری جان کو نہیں عذاب ہے، مرے دل کو ساری مصیبتیں
نہ کرے خدا کہ مری طرح، کوئی اور زیرِ عتاب ہو

کوئی شرم ہے نہ حجاب ہے، جسے دیکھیے کھلا باب ہے
یہی دل جہاں کا گر سعید ہے اب، کسی رخ پہ کوئی نقاب ہو

سبھی خشک و تر سے نہیں ہے خبر، سنو کہہ رہے ہیں یہ کم نظر
نہ تو آنکھ میں کوئی آب ہو، نہ ہی دل میں درد کی تاب ہو

مری ہر خطا پہ کہی گئی، مجھے عقل تر سے ہے بڑا برا
ہو دل شمار کیسے گنہ ترے، بھلا ان کا کیسے حساب ہو

مرے سب خیال ہیں خواب سے، مرے خواب سارے خیال ہیں
تمہیں کس طرح سے بتاؤں دلؔ، کہ تم ایک دن کا گلاب ہو

سبھی زیر و زبر ہو گئے مگر اب سبھی محتسب کبھی مرثیہ گر
نہیں اے حضور جہاں تم سے دلؔ، نہ سوال ہو نہ جواب ہو

دل نواز دلؔ: سکونت: لاہور (پاک)

ہارا ہوا دیوتا

نظم

نجم فضلی

اونچائی کی چھت پر بیٹھے
بخ لمحوں کے کئی برف گزیدہ چٹانوں کا
حصہ بن کر
زنگ آلودہ نین بان سے
کس منظر کو گھائل کرے
کس دل میں ہلچل پیدا کرنے کی
حسرت کی تصویر بنے ہو

دھرتی پر بسنے والوں نے
سازش کر کے
تم کو اوپر بھیج دیا ہے
اور تمہارے نام کے سکے
گھڑ کر جیب میں ڈال لئے ہیں

پیار کرو گے تب جانو گے
چنچل نار کی
چھن چھن بجتی پائل کا سنگیت
ہونٹوں پر مسکان کی خوشبو
آنکھ میں جلتے دیپ
بھیگی چولی میں بل کھاتے
قوسِ قزح کے رنگ
جسم کی سونی راہ گزر پر
انجانے قدموں کی آہٹ

سیرابی کے خواب
تم نے پیار نہیں سیکھا ہے
تم نے جنگ نہیں ہاری ہے
تم کیا جانو

جنگ لڑو گے تب جانو گے
پستانوں سے
گرم خون کے فوارے کیسے بہتے ہیں
ہونٹوں کی مسکان کی خوشبو
کیسے بھوک جھلتی ہے
چولی کے رنگ اتر جاتے ہیں
جسم سڑک بن جاتا ہے
کیسے شاعر اور مصور
فن کو خون پہ پالنے والے
جنگ میں جان گنوا دیتے ہیں

لیکن یہ سب تم کیا جانو
تم جو خدا بھی نہیں انساں بھی نہیں
پربت کی چوٹی پر بیٹھے
تم کتنے چھوٹے لگتے ہو

آبائی تعلق : اعظم گڑھ (بھارت)
سکونت : کراچی۔ (پاک)

غزلیں

باسط عظیم

آلامِ زندگی سے غمِ روزگار سے
انساں دبا ہُوا ہے مصائب کے بار سے

ایسی ملی سزا کہ زمیں بوس ہوگیا
شاید میں بڑھ گیا تھا حدِ اختیار سے

پھر ہر دیار مجھ کو لگا ہے دیارِ غیر
نکلا جو ایک بار مَیں اپنے دیار سے

میری نظر میں وسعتِ کون و مکاں بھی ہے
گزرا ہوں کائنات کی ہر رہگذار سے

طاری ہے کائنات پہ اک کیفِ بیخودی
یہ کون ہمکلام ہے پروردگار سے

وارفتگانِ شوق کی منزل ہی اور ہے
رستے الگ ہیں ان کے ہر اک رہگذار سے

پھر وصل و اتّصال کوئی مسئلہ نہیں
نکلوں جو ایک بار بدن کے حصار سے

اک رحمتِ تمام کا کرنا ہے سامنا
میں مطمئن نہیں ہوں گناہوں کے بار سے

اِس طرح سے اگر زندگی بسر ہوگی
تو اپنے ساتھ میاں صرف چشمِ تر ہوگی

یہ وقت یونہی رہے گا مدام گردش میں
کبھی تو شام یہاں اور کبھی سحر ہوگی

اِک ایک کرکے سبھی ساتھ چھوڑ جائیں گے
ہم ہوں گے اور یہ ویران رہگذر ہوگی

نجانے کب ترے کوچے سے کوچ کر جائیں
نجانے کب تجھے اِس بات کی خبر ہوگی

بہت سے اور جھمیلے ہیں زندگی کے ساتھ
یہ گفتگو تو کسی اور وقت پر ہوگی

جنوں کا موسمِ گل سے بڑا تعلق ہے
جنوں میں اور طبیعت بہار پر ہوگی

عذاب ہے مجھے طولِ کلام لوگوں کا
سُنوں گا بات وہی جو کہ مختصر ہوگی

کشیدہ خونِ جگر سے مری ہر اک تحریر
یہ اپنے رنگ میں خونابۂ جگر ہوگی

نئے زمانوں کا ہم اعتبار ٹھہریں گے
عظیم اپنی ہی آواز معتبر ہوگی

باسط عظیم: حکومت، کراچی (پاک)

سرد سطحِ آب اور آتشیں تہِ آب

نجمہ محمود

سرد، یخ بستہ سا پانی ......

....

سطحِ آب تلے ....
آگ اور شعلے
درد انگیز، سحر خیز تپش
سرد پانی کے تلے
آتشیں وہ تہِ آب!

بادلوں کے جھنڈ
آسمانوں پر بکھر رہے ہیں
افق کے پاس
خاموش اور ساکت درختوں کے ادھر
کے آسمان میں
آگ روشن ہے
اور وجود فضاؤں میں ضم ہو رہا ہے۔

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں
دھیمی دھیمی پھوار پڑتی ہے
مجھ میں دریا ہیں موجزن ہر سُو،
لہریں اٹھتی ہیں ڈوب جاتی ہیں
میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں ......

نجمہ محمود۔ سکونت: علی گڑھ (بھارت)

ال جعفری

غزل

شاید وہ منتظر ہی ہو
گھر سے نکل کے دیکھ لو
شام ہے پھر اُداس اُداس
آؤ ذرا گلے ملو
ٹوٹا نہیں ہے آسماں
عشق میں بے سبب نہ رو
راہ میں جانِ آرزو
صحرائے درد ہو نہ ہو
پھول اگر نہ دے سکے
درد کے بیج تو نہ بو
خیر کی رسم اٹھ چکی
شر کو فروغ کیوں نہ ہو!
مجھ سا غریبِ شہر تھا
دار پہ چڑھ گیا ہے جو
لوگ یہ معتبر نہیں
شاید تجھے خبر نہ ہو
رات بھی ڈھل چکی ہلالؔ
اچھا ہے اب چلے چلو

ل جعفری : سکونت : متحدہ عرب امارات۔

عباس حیدر زیدی

غزل

درد دل کا کر گیا دیوار پر تحریر کون
کس کی یہ تصویر تھی اور بن گیا تصویر کون

کھینچتا ہر دور میں حالات کی تصویر کون
میں بھی چپ رہتا تو کہتا زلف کو زنجیر کون

تم مری تحریر سب کے سامنے آنے تو دو
میں سے بھی دیکھوں چپ رہے بڑھ کر مری تحریر کون

میں نے گھر میں طاق رکھے ہیں ہوا کو دیکھ کر
دیکھیں اپنا گھر کرے میری طرح تعمیر کون

کچھ نہ کچھ تبدیلیٔ حالات ہونی چاہیے
روز دیواروں پہ دیکھے ایک ہی تحریر کون

سخت حیرت ہے مجھے تاریخ کے کردار پر
داستاں کس کی تھی اور کرتا رہا تحریر کون

گوش بر آواز میں بھی ہوں مرا ماحول بھی
وقت ہے تقریر کا دیکھیں کرے تقریر کون

ظلم کا عالم جبھی ہے دیکھنا لیکن یہ ہے
اب کے جھیلوں کی طرف پھینکے گا پہلا تیر کون

عباس حیدر زیدی : سکونت ، کراچی (پاک)

شاہد رضوی

غزل

ممکن نہیں کہ جراتِ اظہار چھین لو
ہم سے ہمارے عشق کا آزار چھین لو
دل سے خیالِ حسنِ طرحدار چھین لو
سانسوں سے خوشبوئے زلف سے مہکار چھین لو
یادوں کے جگمگاتے ستارے مٹھا سکو
ہاتھوں سے لمحے، لمحوں سے رفتار چھین لو
قندیلِ شب ستارۂ صبحِ بشر ہیں ہم
روشن ہے اپنی طبعِ بیدار چھین لو
چلتی ہوئی نسیم میں پھولوں کا پیار ہے
چلتی ہوئی نسیم سے یہ پیار چھین لو
رگ رگ سے اس جمال کا افسوں نکال دو
مئے سے نشاطِ حسنِ غمِ یار چھین لو

ماہنامہ حیات : کراچی (پاک)

سیدہ منیرہ نزہتؔ

غزل

عالمِ رویا میں جو زنجیر ہے
کیا خبر کب سے مری تقدیر ہے

سر اُٹھائے سامنے ایستادہ ہے
اور کھلا مجھ پر وہی شمشیر ہے

ہجر کی لا انتہا ساعت میں جوں
وصل کی اک خوشبو گھڑی زنجیر ہے

کہہ چکے تھے کیسے ہم لکھیں اُسے
اک ذرا لکھا وہی تنویر ہے

خواب میں نزہتؔ لکھا جو بھی لکھا
خواب میں لکھے کی کیا تعبیر ہے

سیدہ منیرہ نزہتؔ : سکونت، کراچی (پاک)

اُروشی نے سچ کہا تھا!

نصیر احمد ناصر

نظم

اروشی نے سچ کہا تھا
عورتوں کا ساتھ دائم رہ نہیں سکتا
برہنہ خواب کی تعبیر
گہری رات کی تلبیس سے مشروط ہے
کیا خبر کب میمنوں کے روپ میں وہ
چھین لیں آکر لباسِ جسم کی نادیدگی
روشنی میں اپسرائیں
اپنی دنیاؤں کی جانب لوٹ جاتی ہیں
اندھیرا مرد کی پوشاک ہے
(جھیل کا) پانی محبت ہے،
ہوا کا لمس سچا ہے
اسے دل میں اترنے دو
نمی محسوس ہونے دو
تلاشِ وصل کے مارو!
کبھی بے موت مرنے کی تمنا بھی نہ کرنا
اس ڈگر میں
روشنی نزیاں ہے
اروشی نے سچ کہا تھا
عورتوں کا ساتھ دائم رہ نہیں سکتا!!

کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے

نظم

نصیر احمد ناصر

محبت جسم کے بستر پہ سوتی ہے
دکھی عورت خدا کا روپ ہوتی ہے
جو راتیں جاگتی ہے، نیند روتی ہے
تکونی خواہشیں
تکمیل کے کن زاویوں کو ڈھونڈتی ہیں؟
روشنی کا لمس
بوسوں کی عبادت ہے
سلگتی ریت کی پابستگی
چھاؤں میں چلنے سے کہیں بہتر ہے
مخروطی اذیت کائناتی دائرے تصلیب کرتی ہے
کبھی لفظوں کے ملبے سے بھی سامانِ سفر ملتا ہے
میری جاں!
کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے
محبت زندگی کا آخری ہتھیار ہے
لڑتے ہوئے مرنا بہت آسان ہوتا ہے!!

نصیر احمد ناصر: سکونت، میر پور آزاد کشمیر (پاک)

رفیق سندیلوی

مجھ سے کچھ مت کہو

مجھ سے کچھ مت کہو
یہ سماعت ابھی اَن سُنی کے شرابور رستے میں ہے
ایسے رستے میں ہے
جو کسی چپ کے گہرے تعاقب میں چلتی ہوئی
رُخ بدلتی ہوئی
بڑھ رہی ہے کہ جیسے کوئی آب جُو
جیسے شریان میں سر پھرے جنگجو کا لہو
جیسے چلّے سے نکلا ہُوا تیر ہو
مجھ سے کچھ مت کہو
یہ سماعت ابھی سننے والے گروہوں میں شامل نہیں
اک عجب ناشنیدہ صداؤں کے رستے میں ہے
اَن سُنی کے شرابور رستے میں ہے!

غزل

گزری ہوئی ساعت تُو کہاں ہو گئی غائب
اے سوزِ رفاقت تُو کہاں ہو گئی غائب

جب حلقۂ یک خواب میں آمیز ہوئے جسم
اے آتشِ قربت تُو کہاں ہو گئی غائب

پہلے تو بس چشمِ فروزاں میں تھی موجود
اے دید کی طاقت تُو کہاں ہو گئی غائب

یکبار چمک کر شبِ مجبوریٔ دل میں
اے برقِ شباہت تُو کہاں ہو گئی غائب

بس اگلا قدم بڑھنے ہی والا تھا تری سمت
اے سرحدِ حیرت تُو کہاں ہو گئی غائب

رفیق سندیلوی: سکونت، اسلام آباد (پاک)

کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے

نظم

نصیر احمد ناصر

محبت جسم کے بستر پہ سوتی ہے
دکھی عورت خدا کا روپ ہوتی ہے
جو راتیں جاگتی ہے، نیند روتی ہے
تکونی خواہشیں
تکمیل کے کن زاویوں کو ڈھونڈتی ہیں؟
روشنی کا لمس
بوسوں کی عبادت ہے
سلگتی ریت کی پابستگی
چھاؤں میں چلنے سے کہیں بہتر ہے
مخروطی اذیت کائناتی دائرے تصلیب کرتی ہے
کبھی لفظوں کے ملبے سے بھی سامانِ سفر ملتا ہے
میری جاں!
کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے
محبت زندگی کا آخری ہتھیار ہے
لڑتے ہوئے مرنا بہت آسان ہوتا ہے!!

نصیر احمد ناصر: سکونت، میرپور آزاد کشمیر (پاک)

رفیق سندیلوی

مجھ سے کچھ مت کہو

مجھ سے کچھ مت کہو
یہ سماعت ابھی ان سُنی کے شرابور رستے میں ہے
ایسے رستے میں ہے
جو کسی چپ کے گہرے تعاقب میں چلتی ہوئی
رُخ بدلتی ہوئی
بڑھ رہی ہے کہ جیسے کوئی آب جُو
جیسے شریان میں سر پھرے جنگجو کا لہو
جیسے چلّے سے نکلا ہُوا تیر ہو
مجھ سے کچھ مت کہو
یہ سماعت ابھی سننے والے گروہوں میں شامل نہیں
اک عجب ناشنیدہ صداؤں کے رستے میں ہے
ان سُنی کے شرابور رستے میں ہے!

غزل

گزری ہوئی ساعت تُو کہاں ہو گئی غائب
اے موجِ رفاقت تُو کہاں ہو گئی غائب

جب حلقۂ یک خواب میں آمیز ہوئے جسم
اے آتشِ قربت تُو کہاں ہو گئی غائب

پہلے تو اسی چشمِ فروزاں میں تھی موجود
اے دید کی طاقت تُو کہاں ہو گئی غائب

یکبار چمک کر شبِ مجبوریٔ دل میں
اے برقِ بشاشت تُو کہاں ہو گئی غائب

بس اگلا قدم پڑنے ہی والا تھا تری سمت
اے سرحدِ حیرت تُو کہاں ہو گئی غائب

رفیق سندیلوی: سکونت، اسلام آباد (پاک)

غزلیں

جو پیالوں میں رہ جاتی ہے
وہ آنکھوں میں رہ جاتی ہے

مٹّی اُڑتی ہے صحرا میں
اور بالوں میں رہ جاتی ہے

اِک خُوشبو سی مرتے دم تک
اِن سانسوں میں رہ جاتی ہے

دن بھر رستہ تکتے تکتے
دھوپ آنکھوں میں رہ جاتی ہے

اِک خواہش بے جاں دے کر جو
دل والوں میں رہ جاتی ہے

آنکھ پتّھر کی پاؤں پتّھر کے
تم تو قائل نہ تھے مقدر کے

جھیل ، جھرنے ، پہاڑ اور دریا
سب قصیدے ہیں اِک ستمگر کے

وقت ڈھلوان پر تو لے آیا
زندگی تاکہ خود بخود سرکے

اے خدا میرے دن بڑے رکھنا
میرے بچّے نہیں برابر کے

شہر سارا ہی ننگے سر ہے روشن
کتنے ٹکڑے کرو گے چادر کے

نسیم روشن : سکونت ، کراچی (پاک)

علی محمد فرشی

ساتواں خواب

تم نہیں سن سکو گے

میری پیاس نہیں بجھی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں سمندر بھی پی لیا
میری بھوک نہیں مٹی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں آسمان بھی کھا لیا
مجھے کوئی پوشاک راس نہ آئی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں رنگ بھی پہن لیا
میرے اندر گھٹن کم نہ ہوئی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں دروازہ بھی کھول لیا
میری حسن بانو نہیں ملی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں سوال بھی پورا کر
دیا
میری قید ختم نہیں ہوئی
حتیٰ کہ میں نے ساتواں جنم بھی پار کر لیا
میری نیند پوری نہیں ہوئی
حتیٰ   کہ

!----------------

علی محمد فرشی: سکونت، راولپنڈی (پاک)

ز حال مسکین مکن تغافل

شہناز کنول

گریز پا ساعتوں کا لوگو
شمار رکھنا
میں آنے والے یگوں میں
ان کا حساب لوں گی
وہ ساعتیں جو ثقیل نہ تھیں
وہ ساعتیں بے عدیل نہ تھیں
وہ ساعتیں زندگی کا درپن
نمو انسانیت کا خرمن
وہ فصل نو کی بہار اول
وقوف منزل
نئی بصیرت
نئی رتوں کی نوید ہوتیں

وہ ساعتیں
جن کو کھو چکے ہو
سمندروں میں ڈبو چکے ہو
فضا میں تحلیل کر چکے ہو
مگر میں تم سے وہی کہوں گی
جو مجھ سے پہلے بھی کہہ گئے ہیں
وہ ساعتیں ظلم کیوں ہنسیں گی
سمندروں میں جمی رہیں گی
فضا میں یونہی تھمی رہیں گی
بروز محشر
خدائے واحد کے سامنے
التجا کریں گی
پھر آخر اپنا حساب لیں گی

شہناز کنول : سکونت ، علی گڑھ (بھارت)

میں زخموں کو پھر سے کریدوں

سلیم انصاری

نظم

بہت دن سے وہ یاد آیا نہیں ہے
بہت دن سے میں نے
اداسی کو اپنے خیالوں کی
ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سجایا نہیں ہے
بہت دن سے کمرے میں،
گہری گھنی تیرگی ہے
مگر اب۔
بدن کو نئے خواب آنے لگے ہیں۔
کتابوں میں سوکھے ہوئے پھول
پھر مسکرانے لگے ہیں
مگر ان میں خوشبو نئی ہے
مجھے یاد ہے
تم نے جو پھول مجھ کو دیے تھے
تمہاری ہی خوشبو تھی ان میں
مجھے خود ہی حیرت ہے۔ کیسے؟
دریچے سے باہر کا منظر بدلنے لگا ہے
پرندے درختوں میں
پھر چہچہانے لگے ہیں

ہوائیں نئے گیت گانے لگی ہیں
پہاڑوں سے گرتے ہوئے
آبشاروں میں پھر سے
دھنک مسکرانے لگی ہے
مجھے ایسے موسم میں
یادوں کے البم کو چھونے سے بھی
خوف آنے لگا ہے
عجب کشمکش ہے
مرے ذہن و دل میں
میں اب پھر سے
محسوس کرنے لگا ہوں
کہ زخموں کو اپنے کریدوں
عجب کیا؟
کوئی روشنی کی کرن،
مجھ کو اندر کی شرمندگی سے بچالے

سلیم انصاری:۔ سکونت جبل پور (مدھیہ پردیش) بھارت

غزلیں

عادل حیات

(۱)

جب ہواؤں کا سلسلہ ہوگا
دیپ آنکھوں میں جل رہا ہوگا

بے سبب روٹھتا نہیں کوئی
درمیان کچھ تو رابطہ ہوگا

اجنبی سا ہے خواب آنکھوں میں
تیری آمد کا سلسلہ ہوگا

زندگی بے سکون پھرتی ہے
بڑھ کے اس سے بھی سانحہ ہوگا

سازشیں کچھ ہوا نے کی ہوں گی
کچھ مرا خون بھی جلا ہوگا

خواہشوں کا ہوں ایک درپن میں
کوئی میرا بھی تو خدا ہوگا

اپنے ہی شہر میں کہیں عادل
امتحانوں پہ آسرا ہوگا

(۲)

نگاہوں میں کھٹکتا خار رہنا
کہ تم بھی جانب اغیار رہنا

عجب ہی رنگ میں ڈوبی زمیں ہے
تم اس کی گود میں ہوشیار رہنا

نئی منزل کی راہیں کھل گئی ہیں
سفر کے واسطے تیار رہنا

بڑا تو ہوگیا ہے قد تمہارا
جنوں سے برسرپیکار رہنا

ہوا بھی ہوگئی ہے اب مخالف
ہمارے ہاتھ میں تلوار رہنا

سخن ور ہوگئے اچھا سنو تو!
دیار شہر میں خود دار رہنا

کہاں کی ہانکتے رہتے ہو عادل
ہے ممکن صاحب کردار رہنا

عادل حیات : سکونت - دہلی (بھارت)

کوثر مظہری

نئے سال کے لیے ایک نظم

یہ کیا نقشہ نظر میں یہ یوں چھایا ہوا ہے
نگاہوں میں یہ نقشہ کیسا سمایا ہوا ہے
شکستہ سی کسی گنبد کی پیشانی پہ سبزی
تماشا ہے، حیرت، جاؤں کہاں میں
کہیں بم پھٹتے ہیں، کہیں ظلم بجا کی کاوش
بہ شکلِ جلوۂ نو آزمائش، نوازش
کہیں کوہ و صحرا سے آواز آتی ہے کیا خوب ہے
بشر بھی رہا ہے مگر زیر تو خود ملکِ تنفس
جوانی ڈھل جاتی، شجر جا پڑا ہے زمیں، یہ جیتا ہی جیتے یہ منظر
قدم بڑھاؤں سنبھل کے تو توبہ توبہ!
ترقی کی راہوں پہ ایسے نہ چلیں تو توبہ توبہ!
جنہیں تو کسی نے بنایا ہے جوہر، یہ آزادی
خلا سے کہ کوہ و ندا ہے۔
ٹھٹھک کر جو دیکھا سنبھل کر جو تاکا
تو ہر سو دھندلکے میں تہذیب دیکھی
بہار رنگ حیات ہے دل میں جو حسن حنا کی ابھری
کسی ماں نے لکھا تھا کھل کر کہ ہر شب
وہ اپنے جواں سال بیٹے کی آغوش میں لیٹتی ہے[۱]

ترقی کی راہیں درخشاں رہے جانتے ہیں
مگر کو کھلی سی یہ تہذیب حاضر کہ ہے جس کا حاصل
تو کیا پھر وہ ذہن پھر قبضہ کرے گا ہمارا ماضی،
کسی کام کا اب نہیں ہے؟
اگر ایسا ہے تو چلو سال نو ہے نگاہیں ہیں جو روش
ہوا جو بھی ماضی میں اس سے کو محو لائیں
نئے سال کا وہ جو خورشید نو آ رہا ہے
چلو سب اُنوار کر لیں
دھندلکے میں [illegible] کام آئیں گے یہ
ممکن نہیں ہے یہ، ذرا سوچیں ہم ذرا غور کر لیں
اگر یوں کریں گے تو زندہ رہیں گے۔

—— × ——

[۱] Debenham میں دستاویز کی ایک لیڈی کا خط چھپا تھا، جس میں خود ماں نے اس پہلو کا انکشاف کیا تھا۔

کوثر مظہری: سکونت، دہلی (بھارت)

ہم تو مرتے رہے

ہم تو مرتے رہے
اور وہ اور جیتے رہے
پھولتے اور پھلتے رہے
سب حساب اور سارے نصاب
الٹے پڑتے رہے
جھوٹے ہوتے رہے
ہر نیا دن ہی ان کے لئے، اک نئے،
اور مضبوط تر اتفاق اور مشیت کی
ان پر سنہری عنایت کی مانند اُبھرتا رہا
جیسے شاہِ مقدر کی جانب سے صدیوں کی
نسلوں کا، لاکھوں کروڑوں جنوں کا،
سب آبِ حیات
ان کے ہی واسطے نوشِ جاں کی ودیعت ہو

ایسا کبھی گر لگا بھی
کہ ان میں بھی ایسے ہیں جو زندگی ہی کے جویا ہیں
اور زندگی میں نمو چاہتے ہیں
تو فوراً انھوں نے وہ کچھ جادوئی جال پھینکے
کہ سب چہرے پھرسے مچھل پائیوں کے ہوئے
اور ہاتھوں سے اوزار ایسے نکلنے لگے
جو کفن پھاڑتے اور سار ابدن چوستے، نوچتے ہیں
تو فوراً
(اسی سحر میں ہم نے دیکھا کہ)
بستی کی مخلوق،
سب عامتہ الناس، مردوں کے قل فارم میں
خود کو ان کے لئے نوش جاں کی طرح پیش کرتے ہیں

اور مردہ خوری کا سارا عمل ہونے لگتا ہے
تو ہم سوچتے ہیں تو کیا تا ابدی یہ مخلوق اپنی
مری آنکھوں میں، سن نسوں میں
یونہی موت جیتی رہے گی تو کیا تا ابدی یہ مخلوق اپنی
کھلی جنگ لڑنے سے منکر رہے گی
سبھی زندگی، اس کی ساری تگ و دو
انہیں ٹوٹے پھوٹے سے سانسوں کے رشتے
کو ہی باقی رکھنے کی خاطر رہے گی
کوئی خواب، کوئی جنوں، کوئی آگ،
آگ اس میں کبھی ہم نے دیکھیں گے
جو کامراں، شعلہ افشاں جہانوں میں دیکھا ہے
اس عالم بے تپش میں کبھی ہم نہ دیکھیں گے؟

کہاں جائیں سر پھوڑتے ہم
کہاں جا کے کس کو پکاریں،
پکاریں کہ آؤ جہاں بھر کی روحو،
آؤ، دیکھو
یہاں ایک مخلوق ہے، بے کسی اور ڈر کی بنائی ہوئی
ڈر ہی کھاتی ہوئی، ڈر ہی پیتی ہوئی
یہاں ایک بستی ہے اپنے ہی جسموں کے پانی میں ڈوبی ہوئی
یہاں جنگ ہے ایک صدیوں سے ٹھہری ہوئی
یہاں موت ہے ایک سو روپ جیتی ہوئی

ہم تو مرتے رہے
اور وہ اور جیتے رہے

کاوش عباسی :- آبائی وطن : پنجاب (پاک)۔ سکونت : ریاض (سعودی عرب)

غزل

محمد فیروز شاہ

لہو میں گونجتا ہے، کم تو ہوتا ہی نہیں ہے
محبت کا یہ سُر مدھم تو ہوتا ہی نہیں ہے

جھپٹنے کا وطیرہ رکھنے والے سوچتے ہیں
پلٹنے کا کوئی موسم تو ہوتا ہی نہیں ہے

مثال اپنی نہیں رکھتا وہ خندہ روئی میں بھی
عدو کے رُوبرُو برہم تو ہوتا ہی نہیں ہے

دمادم زندگی کی دوڑ میں بے دم ہوئے ہیں
فنا کے شہر میں ہمدم تو ہوتا ہی نہیں ہے

ہیں سب، فیروز، اپنی ہی انا کے زخم خوردہ
اور ایسے زخم کا مرہم تو ہوتا ہی نہیں ہے

محمد فیروز شاہ: سکونت، میانوالی (پاک)

غزلیں

آؤ شام کا منظر دیکھیں
جو اندر ہے باہر دیکھیں
سورج بن کر ڈوب گیا جو
چہرہ وہی افق پر دیکھیں
جانے والا چھوڑ گیا ہے
ویراں دیوار و در دیکھیں
اور بھی کتنے غم ہیں لیکن
اس کے غم سے کم تر دیکھیں
پھول کھلا ہے قبر کے اوپر
کیسے اے چشم تر! دیکھیں
پیار کا دعویٰ کرنے والے
جینے سے پہلے مر دیکھیں
بے مہر و بے رنگ رتوں میں
ان کی یاد منور دیکھیں
جن آنکھوں نے دیکھا ان کو
کیا کوئی کج پیکر دیکھیں
آج بھی وہ مل جائیں، تو انکی
خاطر، خود کو کھو کر دیکھیں

ماہ طلعت زاہدی

ہجر میں جل گیا ہے سارا کچھ
اب یہاں پر نہیں ہمارا کچھ
اک فریب خیال ہے دنیا
اور فریب خیال سارا کچھ!
لوگ ہیں کس قدر زمانہ ساز
دل اکیلا نہیں سہارا کچھ
کس نے جیتی ہے موت سے بازی
کون جو زیست میں نہ ہارا کچھ
ساتھ خوف خدا غنیمت جان
اس سے بڑھ کر نہیں سہارا کچھ
پھول آنگن میں تھے چنبیلی کے
چھت پہ تاروں کا تھا اشارہ کچھ
آپ تھے، اطمینان تھا، دل تھا
اب تو ہم خواب سا نظارا کچھ
اتفاقات بن گئے منزل
حادثوں پر نہیں اجارہ کچھ
رات کو چاند ساتھ رہتا تھا
دن کڑی دھوپ میں گزارہ کچھ
ہنس بھی لیتی ہوں میں کبھی، لیکن
آنسوؤں سے نہیں کنارا کچھ

ماہ طلعت زاہدی: سکونت: اسلام آباد
(پاکستان)

افتخار نسیم

سانپ سے مکالمہ

رات، اندھیرے میں میں نے سانپ پر پاؤں رکھ دیا
سانپ مجھ سے ناراض ہو گیا
میں نے بڑی منت سماجت کی
"چھوڑ دو یار! میں انسان ہوں اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا"
سانپ نے بے رخی سے جواب دیا
"تم انسانوں کی آنکھیں غلط جگہ پہ لگی ہوئی ہیں
انہیں تمہارے پاؤں کے انگوٹھوں پر ہونا چاہیے
تاکہ تم رینگتی ہوئی چیزوں کو دیکھ سکو"
"تم سے بہتر تو "اگوانا" ہے جو ہر طرف دیکھ سکتا ہے"
انسان، اشرف المخلوقات، میں اُس کی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا
"تو تم اپنی ٹانگیں جسم کے اندر کیوں لئے ہوئے ہو
انہیں باہر نکالو اور رینگنے کی بجائے چلو"
سانپ نے متانت سے جواب دیا
"جب تم پیدا ہوتے ہو تو ہماری طرح رینگتے ہو
تھوڑے سے بڑے ہوتے ہو تو اگوانا کی طرح اپنے چاروں پاؤں پر چلتے ہو
اور بڑے ہو جاتے ہو تو ریچھ کی طرح اپنے دو پاؤں پر چلنے لگتے ہو
اُس وقت تم یہ بھول جاتے ہو کہ کبھی تم بھی رینگتے تھے"
سانپ اپنے آدھے جسم پر کھڑا ہو گیا
اور پھر بل میں گھس گیا
یہ میری اُس کی آخری ملاقات تھی

افتخار نسیم: سکونت، امریکہ

اب تم کہیں بھی نہیں ہو

شاہین مفتی

اب تم کہیں بھی نہیں ہو

نہ اس دل کے کچے گھروندے کی چھت پر

نہ آنکھوں کے ٹھہرے ہوئے آئینوں میں

نہ صحرا کی تپتی ہوئی رہگذر پر

نہ دریا کے بہتے ہوئے پانیوں میں

نہ کروٹ بدلتے ہوئے موسموں میں

نہ پاگل ہوا کے کسی دائرے میں

مگر اب یہاں ہے

فقط ایک سایہ

جو دیوارِ جاں پر

کٹی انگلیوں سے

کوئی نام لکھ کر اِسے جانتی ہو ؟ ؟ ؟ ؟

مجھے پوچھتا ہے

شاہین مفتی : سکونت ، جلال پور جٹاں (پاک)

نثری نظمیں

شعیب ابراہیم

بدن ہاری ہوئی لڑکی

وطن ہاری، ہوئی لڑکی
کسی جلتے بدن کے مطلبی جزیرے پر
اپنا گم شدہ فلسطین ڈھونڈتے ڈھونڈتے
آخر کار خود گم ہو گئی
وطن ہاری، ہوئی لڑکی
بدن ہارے ہوئے اب ڈھونڈتی پھرتی ہے اپنا آپ!

انی کنت من الظالمین

اے خدا
میں ------ عاجز بندہ پر تقصیر
صبح کے مقدس سناٹے میں
ایک خوشبو نام لکھتا ہوں
"محمدؐ"
اور پھر رو پڑتا ہوں

شعیب ابراہیم: سکونت، ملتان (پاک)

بہارِ رنگ

رابو جینی ایو تو شینکو   ترجمہ ۔ ضمیر احمد

شکستہ حال زندگی میں پہلی بار جب مرا
تمہارا سامنا ہُوا
تو پہلی بار یوں لگا
کہ میرے پاس کچھ نہ تھا ۔
نمودِ صبح کی طرح
تمہاری اپنی روشنی ہر اک طرف بکھر گئی ۔
ندی پر اور جنگلوں میں ۔ بحر میں
اک اور ہی جہانِ رنگ رنگ مجھ کو مل گیا ۔
وہ اک جہاں کہ جس سے میں
ابھی تک آشنا نہ تھا ۔

میں ڈر سے کانپتا چلا اب
میں ڈر سے کانپتا ہوں اب
کہ یہ عجیب صبح نو
یہ انکشافِ نو بہ نو
یہ اضطراب و اشکِ گرم
ہو نہ جائیں سب ہی ختم ۔
پر میں اپنے خوف سے نبرد آزما نہیں
یہ خوف ہی تو عشق ہے ۔
میں چاہتا ہوں اسکی پرورش کروں
اگرچہ مجھ سے کسی کی پرورش ہوئی ؟
میں پاسبانِ عشق ہوں مگر خطا شعار سا ۔
مگر مجھے ہے یہ خبر
ہے وقت کتنا مختصر
کہ شام ہجر آئے گی
تو یہ بہارِ رنگ پھر
کہیں نظر نہ آئے گی ۔

[illegible]

غزلیں

ساجد حمید

بے صدا آواز کے گلشن میں تھا
سایۂ احساس دلِ آنگن میں تھا
سورجوں کی آتشیں پوشاک کا
عکس میرے ذہن کے درپن میں تھا
چبھ رہی تھیں چاند کرنیں جسم بھر
ہجرتوں کا زہر ہر دھڑکن میں تھا
بے نمو تھی کائناتِ جسم و جاں
خواب منظر نیند کے دامن میں تھا
زرد لمحوں نے اچانک آلیا
ورنہ ساجدؔ مسکراتے بن میں تھا

ڈھلتی شام میں کھلتی دیپک راگ مثال
جاگ رہی ہیں سوچیں میری جھاگ مثال
اتنے اندھیرے در آئے ہیں تن من میں
پھول کرن بھی لگتی ہے اب ناگ مثال
میرا فن کل تہہ خانوں سے بولے گا
میں بھی ہوں گمنام یہاں واں کاگ مثال
شہر نے میری جون بدل کر رکھدی ہے
ورنہ گاؤں میں رہتا تھا میں باگ مثال
کعبۂ دل ساجدؔ اک دن جل جائے گا
پھیل رہی ہے نفرت جنگل آگ مثال

ساجد حمید: سکونت: کرناٹک (بھارت)

تاج الدین تاجور

غزل

دیارِ دل میں یہ کیسا عذاب اترا ہے
کہ اپنی سوچ میں بے چہرہ خواب اترا ہے

کسی کے چہرے سے رنگیں نقاب اترا ہے
مری نظر سے میرا انتخاب اترا ہے

مگر یہی ہے کہ بے کل اداس راتوں میں
اجاڑ صحن میں کیوں ماہتاب اترا ہے

کتابِ زیست کا ہر لفظ پابہ جولاں ہے
ہمارے واسطے کیسا نصاب اترا ہے

فریبِ عصر کی شدت ہے تاجورؔ اتنی
سمندروں میں بھی رنگِ سراب اترا ہے

تاج الدین تاجور: سکونت: پشاور (پاک)

نثار احمد نثار

نظم

یہ سواد شام کا بھی

رات کے سفر سے تھک کر چاند سو رہا ہے
معمول کے مطابق
سورج آج بھی طلوع ہوا ہے
الگنی پر لٹکے ادھ سوکھے لبادے شاہد ہیں
کہ اب سے کچھ دیر پہلے
شفق کے بطن سے دھوپ پیدا ہوئی تھی
یہ شہر رات ضرور بادلوں کی ہوگی
سواد شب کا رنگ اتنا گہرا بھی
کہ سحر کے چہرے پہ تادیر قائم رہے

٥

نثار احمد نثار: سکونت، سمستی پور (بھارت)

غزل

خلا میں تھا تو مجھے لامکاں سے ملنا ہے
زمیں پہ حوصلہ اپنی بھی جاں سے ملنا ہے

تمہارا خیال ہوں میرے گماں سے ملنا ہے
چراغ شام کو جیسے دھواں سے ملنا ہے

میرے علاوہ کوئی اور آتا جاتا ہے
کہ یہ سراغ قدم کے نشاں سے ملتا ہے

کئی ستارے مری آنکھ میں ہوئے روشن
یہ شہر خواب سر آسماں سے ملنا ہے

ہوا ہوا بحر کے پار دیپ کو ہلاتی ہے
ہوا کو غنچہ بھی آب رواں سے ملتا ہے

بنتی ہے سر پہ بیاباں دھوپ کے سوا کچھ بھی
مرے وجود کو سایہ کہاں سے ملتا ہے

٥

نظم :-

خواب زادے

سلمان صدیقی

میں ان سب سے مخاطب ہوں
جو پچھلی رات کو دیکھا ہوا ہر خواب
دن میں یاد رکھتے ہیں
خود اپنے آپ پر
تازہ ستم ایجاد رکھتے ہیں
میں ان سے بھی مخاطب ہوں
کہ جنکا خواب انکی آرزو کا استعارا ہے
تمنا کے فلک پر جگمگاتا اک ستارا ہے
جو اپنے خواب کی تصویر میں تحریر رہتے ہیں
سرا زنجیر رہتے ہیں
کہ جیسے میں
میں خود بھی خواب بُنتا ہوں
میں جو بھی چاہتا ہوں
پہلے اسکو خواب میں تحریر کرتا ہوں
پھر اپنے آپ کو اسمیں کہیں تحریر کرتا ہوں
پھر اس تحریر کو تعبیر دینے
دن میں آتا ہوں
اور اپنی عمر کے سب دن
میں ایسے دن میں رہتا ہوں
جو اپنی شام سے محروم رہتا ہے
سبب معلوم رہتا ہے۔

سلمان صدیقی : سکونت ، کراچی (پاک)

غزل

جمال زیدی

زمین بیچ دی ہے آسمان خریدنا ہے
نئے سفر کے لئے کارواں خریدنا ہے

ہمارے دور میں رائج ہوا ہے یہ دستور
کہ بے ہنر کو بھی نام و نشاں خریدنا ہے

ہم اپنے آپ سے کب تک کریں گلہ شکوہ
اب اگلے موڑ پہ اک رازداں خریدنا ہے

کوئی فسانہ تو منسوب ٹھہرے ہم سے بھی
خلش مٹانے کو اک داستاں خریدنا ہے

سفر کے بیچ میں ملاح نے کہا ہم سے
کنارہ لگتے ہی اک بادباں خریدنا ہے

یہ جانتے ہوئے مٹی ہی تو حقیقت ہے
ہر اک شخص کو پکا مکاں خریدنا ہے؟

جھلستی دھوپ کہیں حوصلے نہ جھلسا دے
جمال آؤ ہمیں سائباں خریدنا ہے

جمال زیدی :۔ سکونت اسلام آباد پارک)

سبزہ اندھی باتوں کا

بانجھ ہوا سی راتوں میں
سبزہ اندھی باتوں کا
سوندھا سوندھا لگتا ہے
ریکھا میری مٹھی سے
قطرہ قطرہ بہتی ہے
(میں)
اس گارے کا لیپ لگا کر
آنکھیں گیلی کرتا ہوں

نظم

تمہارے ہرکارے
حسن کی دہلیز پہ
سر پھوڑائے
کھڑے ہیں
اور توسیع شہر میں
ابھی
ٹیوب جلنا باقی ہے۔

مانگ ہری ہے یادوں کی

شب کی چادر اوڑھ کے
جب بھی نکلا ہوں
دن کی بھیگی آنکھ نے
مجھ کو گھورا ہے
سانس ہوا کی تھالی پر
سپنے رکھ کر لاتے ہیں
سگریٹ اس کی آنکھوں میں
ہولے ہولے جلتا ہے
منظر اس کی باتوں سے
لحظ لحظ بجھتا ہے
مانگ ہری ہے یادوں کی۔

برسوں سے

برسوں سے دھوپ نہیں نکلی
مدت سے میگھ نہیں برسا
شک کے چھینٹوں نے
دل میلے کر دیئے ہیں
روگ کے گلیشیر نے
دل بھرے کر دیئے ہیں۔

جتنی دیر میں جسم سے جاں کا ناطہ ٹوٹتا ہے
پھانسی گھر سے کوئی پرندہ اڑتا ہے
وقت کی ٹہنی پر
ایک نظم کھل اٹھتی ہے۔!

فاروق ندیم: سکونت، بہاول نگر (پاک)

نظم

شاہینہ فلک

کہا تھا نا
یوں نہ کھلے سر پھرو
کہ پاگل ہواؤں کے ہاتھوں میں
نہ جانے کس غم کی دھول اور رسوائی کی خاک ہو
کہا تھا نا
کوئی چنر اوڑھ لو
گرچہ زرباف و کمخواب و اطلس نہیں
نہ سہی
کوئی بے رنگ سی
اوڑھنی ہی سہی
کہا مان لیتیں
تو یوں
آج پاگل ہواؤں کی زد میں نہ ہوتیں
کہا تھا نا
یوں نہ کھلے سر پھرو
کہا تھا ناں
کوئی چنر اوڑھ لو

نظمیں

شاہینہ فلک

احتیاط

دیئے جلایئے مگر
ہوا کے رخ بھی دیکھیے
کہ یہ ہوا دیے کی زندگی کے ساتھ کھیل کر
دیے جلانے والے ہاتھ بھی
جلا کے جائے گی
دیے بجھا کے جائے گی

ہنسی

ابھی جو آواز ایک کھنکی
وہ گونج تھی میرے قہقہوں کی
کہ دل کے شیشے کی کرچی کرچی بکھر رہی تھی
میں ہنس رہی تھی
مگر مرا غم مرے رگ و پے میں
درد بن کر اتر رہا تھا

شاہینہ فلک - آبائی تعلق اعظم گڑھ (بھارت) سکونت کراچی (پاک)

خواہش

نظم

نزہت افتخار

گزرتے لمحو نہ ٹھہرو
مجھے گزرنے دو
دھنک رنگ موسم
حسین رہنے دو
ندی کا شور ہواؤں کے
ساتھ بہنے دو
یہ بادلوں کی گرج ہے
انہیں گرجنے دو
اگر برسا یہ چاہیں
انہیں برسنے دو
گزرتے لمحو نہ ٹھہرو
مجھے گزرنے دو
کوئی بھی دکھ کا مداوا
نا کر سکا میرا
گزرتے لمحو سنو
زندگی کا ایک ایک پل
بہت عذاب
بہت کربناک گزرا ہے
اذیتوں کے سفر میں ہوں
اس لمحے سے
وہ ایک لمحہ
جو میری روح
میری دھڑکنوں کا حاصل ہے
اسی تلاش
اسی جستجو میں کھوئی ہوں
میں مدتوں میں
کہیں آج جا کے
سوئی ہوں
گزرتے لمحو سنو
مجھے گزرنے نہ دو
مجھے گزرنے نہ دو

نزہت افتخار: سکونت، کراچی (پاک)

نگار سجاد ظہیر

گھر کی طلب

اک سیدھی طلب تھی جس پہ سارے
شہر تباہ میں، اہلِ پناہ میں
گرجے، برج گئی !

تیر سا ٹوٹا، آگ سی برسی
ریت روایت کے اَن داتا
ٹھیکیدار سماجوں کے

بے حس، بے دل، بودے، بونے
کان کے بہرے، تیز زبانیں
تقریریں، بے کار کے بھاشن

سارے گھر نے
سارے شہر نے
گویا بن کے تیروں کی بارش برسادی

اہلِ نگر کی
اہلِ شہر کی کم ظرفی کو
کون سا پیمانہ ناپے گا ؟
میں اک عورت ہوں
اور میرا حق ہے کہ میں طلب کروں
اک چھوٹا سا گھر
اپنا گھر

جہاں میری رعیت بستی ہو
جہاں میرا سکّہ چلتا ہو

حوّا سے لے کر آج تلک
یہ مانگ ہے ہر اک عورت کی

وہ جب بھی مانگ یہ کرتی ہے
تو سارا گھر اور سارا شہر
گویا بن کے آجاتا ہے

رسم و رواج کے طعنے دینے
تیروں کی بارش برسانے
کبھی عورت، زخمی ہو کر
مانگ سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے

یا پھر وہ بھی گویا بن کے
تیر کمان اٹھا لیتی ہے
میری طرح چلّاتی ہے
میں اک عورت ہوں اور میرا حق ہے
کہ میں طلب کروں
اک چھوٹا سا گھر
اپنا گھر
جہاں میرا سکّہ چلتا ہو
جہاں میری رعیت بستی ہو!

نگار سجاد ظہیر: سکونت، کراچی (پاک)

شکیل جمالی

غزلیں

یہ تری خلق نوازی کا تقاضہ بھی نہیں
کہیں دریا ہے رواں، اور کہیں قطرہ بھی نہیں

اپنے آقاؤں کے عیبوں کو محاسن سمجھے
اتنی پابند عقیدت تو رعایا بھی نہیں

اختیارات سے حق تک ہیں زبانی باتیں
دستخط کیا، کسی کاغذ پہ انگوٹھا بھی نہیں

کوئی امکان نہیں ہے کسی خوش فہمی کا
چارہ گر تم ہو تو پھر زخم کو بھرنا بھی نہیں

اشتہارات لگے ہیں مری خوشحالی کے
اور تھالی میں مری خشک نوالہ بھی نہیں

یہ اجالا کوئی سازش ہے، یہ جگنو ہے فریب
صبح سے پہلے چراغوں کو بجھانا بھی نہیں

دکھوں میں اپنے اضافہ بھی میں ہی کرتا ہوں
اور اس کمی کا ازالہ بھی میں ہی کرتا ہوں

ذرا بہت مری جھنجھلاہٹیں بھی جائز ہیں
کہ حد سے صاحب والا بھی میں ہی کرتا ہوں

خوشی کے خواب سجاتا ضرور ہوں لیکن
صفِ ملال کو سیدھا بھی میں ہی کرتا ہوں

نہ اپنے فعل کا غم ہے نہ اپنے قول کا دکھ
نباہتا ہوں تو وعدہ بھی میں ہی کرتا ہوں

ترے وصال کی خوشبو بھی صرف میری ہے
ترے بغیر گزارا بھی میں ہی کرتا ہوں

شکیل جمالی: سکونت، چاندپور ضلع بجنور (بھارت)

کے بی فراق

روشن دن کے پٹ سے باہر

— ۱ —

کتنی صدیاں
اوڑھ کے ہم نے
اپنے اس تن کے چادر پر
سلوٹ کی یہ گہری شکنیں
نیند کی بوجھ سے ریت پہ آنکھیں
سپنوں کے جگراتے پینے
دور دیس کے پنچھی بن کر
لوٹ چلے آنے کا نوحے
خود کو اپنی مٹی میں اِن
باہم کاٹتی
لکیروں کا یہ
بکھری ہوئی موجوں کی طرح پھر
ساحل کے سینے کو اپنی
چنتاؤں کا
ایک مسکن
بنانے میں کب سے جتے ہوئے ہیں
یہ بھی تو نہ جان سکا تھا کہ
کتنے چہرے گھلے ملے تھے
پہچان کی سرحد سے پھر دیکھو
خود کو کھوتے رہے تھے آخر

اپنی اپنی چنتاؤں میں ۔ کے۔ بی۔ فراق: سکونت گوادر بلوچستان (پاک)

برجیس صدیقی

غزل

صلیبِ جاں بھی وہی، آنکھوں میں غبار وہی
چراغِ اشک وہی اور یادِ یار وہی

ہم ایسے لوگ کریں زندگی کا سودا کیا
کہ جن کا نقدِ دل و جاں وہی ادھار وہی

نصیحتیں جو تیری مان لیں تو جائیں کدھر
کہ اپنا نکتہ وہی، دائرۂ حصار وہی

سنبھالو دستِ زلیخائے وقت سے دامن
کہ تہمتیں بھی وہی، دام اور بزار وہی

تمہیں تو راس نہ آئیں نئی رُتیں برجیسؔ
خمارِ صبح وہی، ٹوٹے من کے تار وہی

برجیس صدیقی : سکونت : کراچی (پاک)

کم نظر

سحر علی

نظم

میلی آنکھوں کا خوف میرے دل سے گیا
تہمتوں کا ملال آپ ہی آپ مٹ گیا
جان کے جنگل میں کچھ سانپ بستے تو ہیں
جو زہر میں ہیں بُجھے
سرسراتے تو ہیں کاٹ سکتے نہیں
میرے لفظوں کے منتر سے ڈرتے ہیں وہ
دکھ مجھے راس ہے

اس کھری آگ میں جب بھی جلتی ہوں میں
تب کہیں جا کے کچھ لفظ لکھتی ہوں میں
اس جہاں سے نہیں خود سے ڈرتی ہوں میں

ضبط کی ڈھال سے
غم کے پاتال سے
میں نے سیکھا تو ہے
سچ کو لکھا تو ہے

کسی کی آواز پہ
مجھ کو تمہید کی
یا تردید کی
یا کسی بھی منافق سے تجدید کی

کچھ ضرورت نہیں
میں ضرورت کے اندھے کنوئیں میں نہیں ہوں
نفرتوں کے سلگتے دھوئیں میں نہیں ہوں
کس نے پوچھا ہے
کیا میلی آنکھیں کریں گی میرا احتساب
میں کسی کم نظر کو نہ دوں گی جواب

تفصیل میں مت جاؤ

نظم

سحر علی

تم میرے دکھوں کی تفصیل میں مت جاؤ
مت پوچھو
کہ میری رات اور نیند کے درمیان آخری ملاقات کب ہوئی
مت پوچھو
کہ میرے اور اس کے بیچ وہ پہلی بات کیا ہوئی
جس نے میری آنکھوں اور اس کے خوابوں کے رستے میں دیوار اٹھائی
جنہیں پتھر نہیں لگتے
انہیں پھولوں سے مت چونکاؤ
اتنے سوال مت اٹھاؤ
روح تک جھلسی ہوئی عورت سے
موت ناراض
اور زندگی حیران ہو کے ملتی ہے۔
بعض آنسوؤں کا سفر بے انت ہوتا ہے۔
کسی ٹوٹے ہوئے پتے کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ
وہ ہوا کے ہاتھ میں ایک کھیل بن جائے۔
مگر کسی خواہش کے تابع کب کوئی حالات ہوتے ہیں۔
میرے آزار کے آگے یہ سب الفاظ گونگے ہیں۔
بے چہرہ درد کی ساری اذیت میرے حصے میں
میں اپنی زندگی اپنے دکھوں کے سارے قصے میں
تمہیں ٹھہرا نہیں سکتی ......

سنو! بہت ہی معذرت کے ساتھ تم محبت، دوستی اور لفظ کے اس کھیل سے مجھ کو الگ کر دو
تم اپنی مہربانی کی ادھوری چھاؤں دے کر بھی مجھے بہلا نہیں سکتے۔
تم میرے دکھوں کی تفصیل میں یوں جا نہیں سکتے ......

سحر علی: سکونت، کراچی (پاک)

تکمیل

نظم

ناجیہ احمد

بس آنکھیں چاہیں
مجھے آنسوؤں کی پرورش کرنی ہے
انتظار کا بیج بونا ہے
آنکھیں چاہیں تاکہ میرے آنسوؤں کو
کوئی راہ مل سکے
آنکھیں چاہیں تاکہ میں خوابوں کی راکھ
جمع کر سکوں
کہیں سے مجھے ڈھونڈ کر آنکھیں لادو

بس۔اک جسم کی ضرورت ہے
دکھوں کو پروان چڑھانا ہے
دل آزردہ کو سہارا چاہیے
دکھ چھپ جائیں
جسم چاہیئے تاکہ دنیا کی نگاہوں سے
دکھوں کو دم ساز چاہیئے
جسم چاہیئے تاکہ دکھ نمو پاسکیں
کہیں سے مجھے ڈھونڈ کر لادو

بس۔ اک روح چاہیئے
آگہی سے لبریز، جنوں سے پر چاہیئے
مسرتیں رکھنے کیلئے روح چاہیئے
فکر فردا جس کی ہمرکاب ہو
محبت کی جسے خواہش ہو
اور اس کی خاطر سرگرداں اک روح چاہیئے
کہیں سے مجھے۔ یہ بھی ڈھونڈ کر لادو

مجھے آنسوؤں کا تقاضا کرنے والی آنکھیں
دکھوں کی پرورش کے لئے
جسم اور آگہی کی روح چاہیئے
مجھے انسان بنانا ہے

ناجیہ احمد :- سکونت کراچی (پاک) موجودہ (کنساس)

نظم | یاد | احتشام الحق شامی

یاد کوئی بھی روپ دھار سکتی ہے
کسی خوشبو کا جو ہمارے نتھنوں اور رونگٹوں
کو ایک ساتھ مانوس لگ سکتی ہے
یا کسی موڑ کا جو شام کے دھندلکے میں
بس سے اترنے کے بعد
دل میں اتر جاتا ہے
یا کسی آواز کا
جو اتنی آہستہ ہو سکتی ہے
کہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو بھولنے کے بعد
سنی جا سکتی ہے'
یا پھر کسی خواب کی صورت
کسی معنی کے بغیر
یا پھر کسی بے وجہ اداسی کی طرح
جس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا
جو مگر پھر بھی ہم کو دیر تک ڈھانپے رہتی ہے
مگر کوئی بھی خوشبو' کوئی بھی موڑ
آواز' خواب یا اداسی
یاد کی دسترس سے باہر بھی
ہو سکتی ہے
اور ہم اسے یاد کرنے کی کوشش میں
اپنا جیون بے چینی میں گزار سکتے ہیں۔

غزل

سیما سراج

تمہاری راہ میں پتھر بہت تھے
مگر ہم لوگ بھی خودسر بہت تھے

میں سچ کو ڈھونڈنے نکلی تو دیکھا
فسانے جھوٹ کے اندر بہت تھے

میں کیا پہچانتی، تھا کون قاتل
نقاب ان سب کے چہروں پر بہت تھے

تجھے کھو کر بھلا کیا چاہ میں
میری آنکھوں ہی میں گوہر بہت تھے

خدا جانے کہاں گم ہوگئے ہیں
اس اک منظر سے جو منظر بہت تھے

نہ راس آئے میری تنہائیوں کو
خیالوں میں تو بام و در بہت تھے

ابھارے ہیں غم فرقت نے سیما
پرانے زخم جو دل پر بہت تھے

سیما سراج: سکونت: کراچی (پاک)

فوزیہ اختر

نظمیں

سپنا

اک بار تم نے کہا تھا
جب تم ہنستی ہو
تمہاری آنکھیں بھی ہنستی ہیں
اک بار تم نے کہا تھا
تم سپنے دیکھنے والی لڑکی ہو
میں جانتی ہوں
یہ سپنے مجھ کو دیکھنے دو
یہ جھوٹے سہی
کچھ دیر یہ مجھ کو
دور بہت لے جاتے ہیں

زرد لکیر

سچ اور جھوٹ کے درمیان
اک ننھی سی زرد لکیر تھی
وعدوں کی زنجیر تھی
پھر زنجیر ٹوٹ گئی
ترے اور میرے درمیاں
اک زرد لکیر رہ گئی

مری سہیلی

مرے من کی اُداسی، جنم جلی
مری سکھی سہیلی
دکھ سکھ میں مرے ساتھ رہی
مرے ساتھ ہی گھر سے نکلی تھی
اور سفر میں راہ کے کانٹوں سے
ہم دونوں الجھتے، خود کو بچاتے
آگے بڑھتے جاتے تھے
اور موسم بُرا نہ اچھا تھا
کسی پیڑ کی شاخ میں چھپی ہوئی
ننھی سی بلبل بولتی تھی
پھر جانے اک دم کیا ہوا
یا مجھ سے ہی کوئی بھول ہوئی
مرے من کی اداسی، جنم جلی
مری سکھی سہیلی بچھڑ گئی
میں رہ گئی راہ میں تنہا سی
تب ٹھوکر کھا کے چونک اٹھی
اک پتھر سے ناتا جوڑا
اور اُس پر اپنا سر پھوڑا

فوزیہ اختر: سکونت: کراچی (پاک)

چار نظمیں

ایک جوتشی نے کہا
تمہارے ہاتھوں کی لکیریں بہت اچھی ہیں۔
اس کے جانے کے بعد
میں نے ہاتھ دیکھے
تو لکیر تو ایک بھی نہیں تھی۔

(۲)

محبت پہاڑوں میں چھپی ہوئی ہے
جہاں تک میرا پہنچنا ممکن نہیں۔

(۳)

میرا آنچل اڑا
بادلوں کے پیچھے چلا گیا
بجلی چمکی
اور جل گیا۔

(۴)

لوگ کہتے ہیں ستارے گردش کرتے ہیں
لیکن
میرا تو کوئی ستارہ ہی نہیں۔

ناہید نظم : سکونت، شکارپور۔سندھ (پاک)

کچا آنگن

(خدا کے ہاتھوں سے گری ہوئی دعا)

امرتا پریتم : اردو روپ : احمد ہمیش　　　　　　　　　　یادگار کتھائیں

ایک بار اپنے ماہانہ رسالہ کا ایک خاص شمارہ میں نے ترتیب دیا تھا، جس میں پنجابی کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اشارتی خط لکھے تھے۔ مثلاً انصاف کا خط قانون کے نام، وقت کا خط سیاست کے نام، مذہب کا خط اپنے پیروکار کے نام، حروف کا خط سیاہی کے نام، اور اسی سلسلے میں ایک خط میں نے لکھا تھا ...... حوا کا خط آدم کے نام

وہ خط تھا ......

"میرے محبوب، مخالفت کے دریا میں آج میری حالت اس ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ہے، جو ابھی کچھ لمحوں کے بعد اس پانی میں غرق ہو جائے گی۔

"تم جانتے ہو ...... ڈوبتی ہوئی کشتیوں کے جب کنارے کھو جاتے ہیں تو آخری پیغام کسی بوتل میں ڈال کر پانی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

"وقت کے بھنور مجھے ڈبو رہے ہیں، لیکن ایک پیغام وقت کے حوالے کر رہی ہوں کہ میرے پیغام والی اس بوتل کو وہ کبھی اس کنارے پہ لے جائے گا۔ جہاں تم رہتے ہو۔ ہو سکتا ہے...... میرا یہ پیغام تب کسی کنارے پہ لگے گا، جب میں کسی گزری ہوئی نسل کی کہانی بن جاؤں گی۔ شائد آخری پیغام صرف وقت کا حوالہ ہوتے ہیں۔ کسی مدد کے لئے کسی تک نہیں پہنچتے ...... وہ صرف موت کی تصدیق ہوتے ہیں ......

"میرے پیغام کو اگر حیات کا کنارا نہ ملا، تو جب بھی کنارے پہ لگے گا...... وقت کی نسل اس حقیقت سے واقف ہو گی کہ کبھی اس طرح بھی کشتیاں ڈوب جاتی تھیں اور کسی کی زندگی اس طرح بھی غرق ہوتی تھی۔

"میرے خوابوں کی ایک سبز وادی تھی اور جب میرے معاشرہ کی مخالفت ایک دریا کی طرح بہتی ہوئی آئی، میرے خوابوں کی وادی ڈوب گئی اور جب میری شادی کی شہنائی بجنے لگی، تو پانی میں بھنور پڑنے لگے ......

"بھرے ہوئے دریا میں جن کی کشتیاں ڈوبتی ہیں ...... ان کا جنازہ کوئی نہیں اٹھاتا، لیکن جب معاشرہ کے دریا میں کوئی کشتی ڈوبتی ہے تو اس کی ڈولی اٹھائی جاتی ہے۔

"تم میرے آدم کہاں ہو؟ کبھی وقت تھا، جب حوا کو خدا کے بہشت سے نکلنا پڑا تھا، اور آج اس حوا کو آدم کے بہشت سے نکلنا ہے۔

"طوفان اٹھنے والا ہے، شہنائی کی آواز سیاہ گھٹا کی طرح اٹھ رہی ہے اور میرے سر پر اوڑھی ہوئی کناری والی چنزی آسمان میں بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔

میرا یہ خط ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ سارا شگفتہ سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ قریب چھ مہینے گزر چکے تھے۔ پھر بھی خط لکھتے ہوئے وہ شعوری طور پر میرے ذہن میں نہیں تھی، لیکن وہ ایک ملاقات جب دوستی کی صورت میں بدل گئی، سارا کے خط برابر میرے پاس آنے لگے، میں اس کے ایک ایک احساس میں اترتی گئی، تو لگا...... جس حوّا کا خط میں نے لکھا تھا، اس حوّا کا نام سارا شگفتہ ہے...... جانے وہ کس طرح خاموش سی میرے نفسی شعور میں اتر گئی تھی کہ خط لکھتے ہوئے وہ میرے سامنے نہیں تھی، لیکن سائے کی طرح میرے حروف میں ابھرتی گئی......

ایک بار اس کا خط آیا...... "ہماری زمین کے دستور کے مطابق، ہمیں حرام سے حلال ہونا پڑتا ہے۔ اس بار چادر کُشائی کے بعد حضرت بولے، سارا! اب تیرا شاعروں میں جانا بند، اخباروں میں لکھنا بند، اب تم ہماری عزت ہو"۔ اور سارا نے تڑپ کر خط میں لکھا...... "میں کس زمین کی آبرو ہوں، میں نہیں جانتی"۔

اور اس نے لکھا......

ہماری دنیا میں ایک بہت لمبا بازار ہے۔ صدیوں کے ہاتھوں سے بنایا ہوا، جس میں آج بھی طرح طرح کے زیورات بِکتے ہیں، سنہرے تابوت بکتے ہیں۔ ریشم کے کفن بکتے ہیں۔ اور وہاں ہاتھوں میں مہندی کماں کا سندور اور کناری والے گھونگھٹ بھی بکتے ہیں...... اور زری کے رنگ کی تہذیب بِکتی ہے......"

(جاری)

تنقید اور دیگر مضامین

احمد ہمیش　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مرقعِ ذات
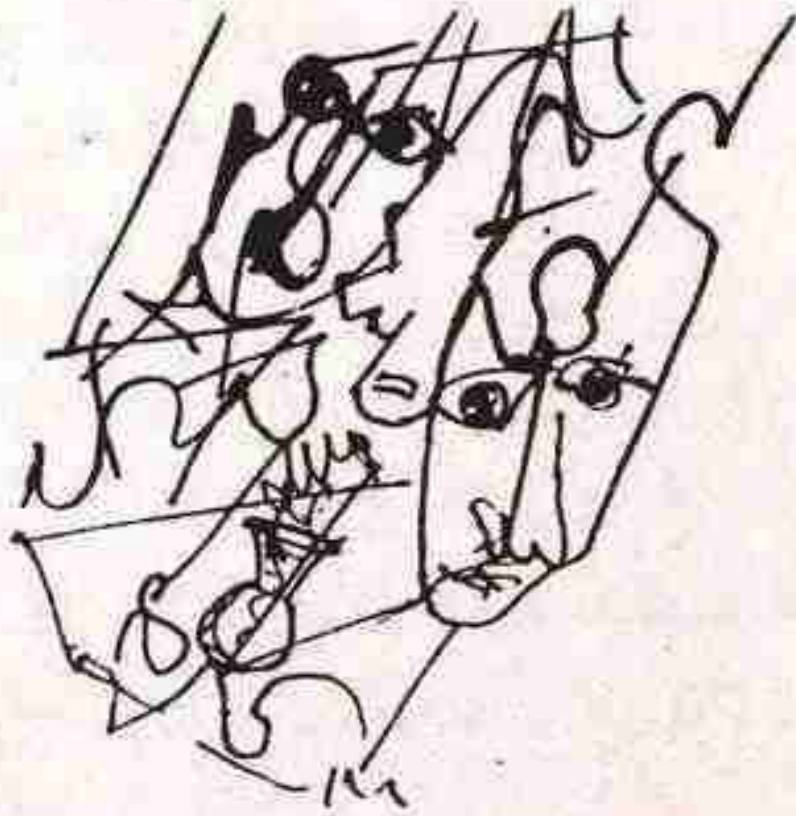
سہ ماہی تشکیل کے اجرا کے وقت سے یہ کوشش مسلسل رہی کہ حصہ مضامین میں کم از کم معتبر اور بحث طلب محققانہ و تنقیدی مواد شامل اشاعت ہو سکے۔ مگر افسوس اس میں اب تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ سو، اس بار بھی سہ ماہی تشکیل کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کا سبب مطلوبہ مضامین کی انتھک تلاش ہے۔ چند برسوں کے دوران ساختیات، رد تشکیل اور مابعد جدیدیت کی دبا پر ایک نظر کی گئی تو معلوم یہ ہوا کہ نارنگ، وزیر آغا اور ان کے نصابی قبیلہ کے کارندے مغربی تحریروں کے ناقص تراجم کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں۔ پھر کم بخت خود کو طبع زاد مضمون نگار ہونا باور کرانے کے مجرم بھی ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اپنی دانست میں اہلِ اردو کو مرعوب کرنے کی نیت سے ان کی پیٹھ پر جھوٹے علم کے ڈنڈے برساتے رہے اور یہ بھول گئے کہ ابھی تخلیقی تنقید اور گھمبیر محققانہ بصیرت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ ادارہ کی طرف سے فضیل جعفری اور عنبر بہرائچی جیسی گراں قدر شخصیتوں کے نام برائے مضامین کئی خطوط ارسال کیے گئے مگر معلوم نہیں ان کی طرف سے کوئی جواب کیوں نہیں موصول ہوا! اسی لیے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد جناب سلمان چشتی اور عبدالرشید حواری کے توسط سے مولانا حسن مثنیٰ ندوی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون نیاز فتح پوری...... ہیولاک ایلس" حاصل ہوا۔ یہاں یہ کہنا بھی ناگزیر ہے کہ اگر کچھ اہلِ علم توجہ فرمائیں تو سہ ماہی تشکیل میں شامل اداریوں سے اصل مسئلہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اس بار شامل اداریہ لگ بھگ سات ماہ کی علمی ابتلا میں بہ مشکل لکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی غور کیا جائے تو اس بار سہ ماہی "تشکیل" میں شامل "حکایتِ خونچکاں کا فکشن نگار...... انور سجاد سے گفتگو۔ از ریحان صدیقی تخلیقی تنقید کا حق ادا کرنے کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اب دور دور تک ایسی شخصیتیں نظر نہیں آتیں جن سے گفتگو کی جا سکے۔

محمد سلیم خاں کے نام

عظیم مفکر مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی خدمات اور حکومت کی سرد مہریاں......

عبدالرشید حواری

گوتم بدھ کا شہر گیا، جو بھارت کے صوبۂ بہار میں واقع ہے۔ اسی گیا کے ایک موضع کرہ میں ایک مفکر، فاضل حدیث، معلم، صحافی، ادیب، ژرف نگاہ سیاست داں اور ایک قائد اعظم و مسلم لیگ پر اتھارٹی نے ۱۸ جنوری ۱۹۱۳ء کو جنم لیا۔ اس نابغہ روزگار کا دادیہال خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف پٹنہ تھا۔ جنہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ قادریہ (کرہ) میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی، فاضل حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فیضیاب ہوئے۔ صحافت کی ابتدا "منادی" دہلی ۱۹۳۶ء، روزنامہ "پاسبان" بنگلور ۱۹۴۱ء، ماہنامہ "البلاغ" روزنامہ "اتحاد" حیدر آباد دکن سے کی۔

مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی سیاسی زندگی تقریباً اڑسٹھ سالوں پر محیط تھی۔ ۱۹۴۲ء میں صوبے کی تشکیل کے سلسلے میں بنگلور "کرگ صوبہ" بنانے کی تحریک چلائی، بھارت میں ۱۹۴۵ء میں جمعیت العلماء اسلام کی بنیاد رکھی، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان پاکستان میں فقہ اسلامی کی "تدوین جدید" کی تحریک شروع کی اور اس تحریک میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی بھی مولانا کے ہمرکاب رہے۔

مولانا، معتمر العالم اسلامی کے عہدۂ صدارت پر ۷۲ء سے ۷۸ء تک متمکن رہے۔ اور بڑے احسن طریقے سے اس ادارے کی رہنمائی کی۔ عجوبہ روزگار اور پارہ صفت ہستی مولانا حسن مثنیٰ صاحب علم وادب کے کسی گوشے سے مجتنب نہیں رہے۔ تراجم پر بھی بڑی عرق ریزی سے کام کرتے رہے، جن میں انتہائی نمایاں نام ابن حزم، امام ابن تیمیہ کے عربی رسائل، امام باقلانی کی شہرۂ آفاق کتاب "المہیہ"، بیدل کی فارسی کتاب "چہار عناصر" "الغزو الفکر کا ترجمہ "فکر یلغار" اور "What is Islam" وغیرہ۔ مولانا کی گرانقدر تصانیف خصوصیت سے "قائد اعظم کی اصل فکر کیا تھی"، "پاکستان مخالفین کی نظر میں" ہفتہ وار جریدہ "مقاصد" ماہنامہ "مہر نیمروز" ان کے علاوہ بہت سی غیر مطبوعہ اور اہم کتابیں جیسے "روداد چمن" جو ان کی حیات میں شائع نہیں ہو سکیں۔ مولانا نے اردو ادب کو دو شہ پارے ناول بعنوان "مریم" اور "شملا" کی شکل میں دیئے۔ ان کے علاوہ بے شمار مضامین و مقالات جو مختلف موقر، رسائل و جرائد و اخبارات میں تواتر سے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے "رفیق" نیشنل کالج کراچی کے پروفیسر اور حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری جو مولانا حسن مثنیٰ کے دادا حضرت بھی تھے، کی جانب سے "اجازت و خلافت" کے بھی حامل تھے۔ مولانا کی تحریر کی شگفتگی کا اندازہ مریم، شملا، مہر نیمروز اور حریت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان سے بے شمار سیاسی، سماجی و دینی پروگرام نشر کرتے رہے۔ حضرت قائداعظم اور تاریخ مسلم لیگ پر اتھارٹی تسلیم کئے جاتے تھے۔ چونکہ مسلم لیگ کے تمام اہم اجلاسوں میں خصوصیت ۱۹۳۷ء لکھنؤ، ۱۹۳۸ء پٹنہ، ۱۹۴۰ء منٹوپارک، ۱۹۴۱ء مدارس شریک وسرگرم رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کاؤنسل کے رکن بھی رہے۔

مولانا حسن مثنیٰ صاحب اپنے کمپیوٹرازڈ حافظے کی بدولت، کسی بھی موضوع پر خواہ وہ علم وادب، اسلامیات و سیاست ہو یا Global Politics، سے ہر لمحہ باخبر رہتے اور ان اصناف پر بے تحاشہ اور پُر مغز طریقے سے گفتگو فرماتے۔ سیاہ شیروانی سفید کرتا اور "کھالٹا" پاجامے میں ملبوس ایک باوقار شخصیت تھی ان کی۔

مگر اس عظیم مفکر کے سلسلے میں بڑی دل گرفتگی سے حکومت پاکستان کی بے حسی، ناقدری، بے اعتنائی، سردمہریوں، اور بے ثباتیوں کا ذکر ضرور کروں کہ اس نابغہ روزگار، جلیل القدر اور عظیم شخصیت کی وفات پر نہ تو صدر پاکستان، نہ ہی وزیراعظم پاکستان، گورنر، نہ ہی وزیر اعلیٰ سندھ نے اپنے اپنے سینے فراخ کئے۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی کے لواحقین سے ہمدردی کے چندبول تک نہیں ادا کئے گئے۔ ان کے گھر جانا توبڑی بات تھی۔ دوسری جانب عنان حکومت کا کردار یہ ہے کہ چاروں صوبوں میں کوئی ایک معمولی سانحہ بھی ہوجائے تو ان کے ہیلی کاپٹر وہاں لینڈ کر جاتے ہیں۔

ابھی بھی وزیر اعظم پاکستان وصدر پاکستان اپنا تھوڑا سا وقت نکال کر مولانا کے دولت کدے پر جاکر ان کے عظیم کارناموں، ان کے خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کریں اور ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کرانے، انہیں محفوظ رکھنے کا اہتمام فرمائیں تاکہ آئندہ نسل ان سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

نیاز فتح پوری .... ہیولاک ایلیس

سید حسن مثنیٰ ندوی

مضمون

ادبی دنیا میں حضرت نیاز اپنی خاص زبان وبیان اور لطیف اسلوب نگارش کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا مشہور رسالہ نگار لکھنؤ اردو زبان کے مقبول ہی نہیں محبوب رسالوں میں شمار ہوتا ہے، پھر یہ محبوبیت بھی اس کی ایک دو دن یا ایک دو سال کی نہیں تیس چالیس سال کی ہے۔ نیاز فتح پوری نے افسانے بھی لکھے ہیں، تنقیدیں بھی لکھی ہیں، ترجمے بھی کیے ہیں اور تالیف تو ان کا خاص فن ہے۔ وہ چھوٹی بڑی متعدد کتابوں کے مصنف، مولف یا مترجم ہیں، عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ اور اس بنا پر غلط نہیں ہے اگر ان کو مستقبل کے ادیبوں کے لئے ایک سند اور نظیر تصور کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نیاز صاحب جن کی بعض کتابوں اور تحریروں پر اس سے پہلے بھی الزام آچکا ہے کہ وہ اصلاً دوسروں کی محنت و مشقت کے ثمرات کا بدلا ہوا روپ ہیں، جیسے تاریخ الدولتین کا نام لیا گیا اور انتقادیات کا ذکر کیا گیا --- تنقید پر ہڈسن کی ایک کتاب ہے جس سے متعدد حضرات نے "فیض" پایا ہے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے، حامد اللہ افسر نے، عاشق بٹالوی نے، اور نیاز فتح پوری نے، سب نے اور ہم بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں کہ ایک ساتھ پانچ چھ کالم کس طرح بنائیں۔ اسی طرح رسالہ نگار کے باب الاستفسار کے صفحات پر چھپنے والے بیشتر مضامین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ نیاز صاحب انسائیکلو پیڈیا سے اور دوسری کتابوں سے لے کر، حوالے کے بغیر، خود اپنی کاوش اور اپنے جواب کی صورت میں تحریر فرماتے رہے ہیں۔ لیکن یہ کتاب جو "ترغیبات جنسی" کے نام سے انہوں نے پیش کی ہے وہ تو کچھ اور ہی چیز نکلی۔

ہیولاک ایلیس ایک مشہور محقق ہیں اس کی ایک کتاب مطالعہ نفسیات جنس (Statics in the Psychology of Sex) ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی اس کی چھ ضخیم جلدیں ہیں۔ "مطالعہ نفسیات جنس" کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے خصوصی پہلو کے متعلق دقیق بحثیں اس میں ہونگی اور تحقیق و تفتیش اور تلاش و جستجو کا غیر معمولی ذخیرہ اس کے اندر ہوگا۔ حضرت نیاز نے یہ کتاب دیکھی اور اس کی اہمیت ہی کا نہیں اس کی مقبولیت کے امکانات کا احساس بھی شدت سے ان کو ہوا۔ انہوں نے اس کے مختلف حصوں، مختلف شعبوں اور مختلف اجزاء کا ترجمہ کر کے ایک کتاب "ترغیبات

جنسی" کے نام سے مرتب کی اور اپنے نام سے شائع کر دی۔ کسی اچھی کتاب کا ترجمہ و تلخیص' خواہ وہ بڑی ہو خواہ چھوٹی' متعدد جلدوں پر مشتمل ہو' یا اس کی ایک ہی جلد ہو' بجائے خود ایک بڑا کام ہے۔ لیکن ,, ترغیباتِ جنسی' کا ایک ایک صفحہ اور ایک ایک سطر دیکھ لیجئے۔ کہیں بھولے سے بھی یہ تذکرہ آپ کو نہیں ملے گا کہ یہ کتاب ہیولاک ایلیس کی کتاب مطالعہ نفسیات جنس کا ترجمہ یا تلخیص ہے' اشارہ بھی نہیں۔

تصنیف' تالیف' تدوین' ترجمہ' تلخیص اور اخذ و اقتباس وغیرہ وغیرہ علمی اصطلاحیں ہیں اور وہ ان اصطلاحوں کا مفہوم جاننے والے اور ان کے باہمی فرق و امتیاز کو محسوس کرنے والے' کم ہی سہی مگر ادبی دنیا میں موجود ہیں' اور خود نیاز صاحب بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ مگر ,, انہی میں سے ایک ہونے کے باوجود دیکھئے کہ ان کا یہ ,, کارنامہ" جہاں ادبی سراغ رساں کی زد میں ہے وہیں اس کی حیثیت اس کھلاڑی کے جیسی بھی نظر آتی ہے جو تصنیف' تالیف' تدوین' ترجمہ و تلخیص اور اخذ و اقتباس وغیرہ کی واضح اور بین علمی اصطلاحوں پر بے تحاشا چلی ہے۔ ترجمہ کو تالیف یا تصنیف کو تلخیص اگر کوئی دوسرا کہہ دے تو خیر ہم اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور اس کی بے عملی پر اسے محمول کر سکتے ہیں لیکن یہی بات اگر نیاز صاحب یا ان کے جیسے ادیبوں کے قلم سے نکلے تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ انہوں نے اصل مصنف ہیولاک ایلیس کا اعتراف نہیں کیا' بلکہ مختلف ابواب میں تین چار جگہ ہیولاک ایلیس کے نام سے بھی ,, کچھ اقتباسات" درج کر کے ,, بے شمار حوالوں" کی بھیڑ میں اس کو بھی کہیں کھڑا کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ,, بے شمار حوالے" بھی اب ہیولاک ایلیس ہی کے پیش کردہ ہیں۔

آپ ,, ترغیبات جنسی" کا مطالعہ کیجئے تو ایسا محسوس ہو گا کہ ان بے شمار قیمتی معلومات اور حوالوں کے حصول میں حضرت نیاز نے' خدا معلوم' دنیا جہاں کی کتنی خاک چھانی ہو گی' کتنی محنت و مشقت برداشت کی ہو گی' کڑیاں جھیلی ہونگی' کتنی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کی ہو گی' تب کہیں یہ گرانقدر جواہرات ان کے ہاتھ آئے ہوں گے' بقول غالب۔

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی ☆ تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ,, سات دریا کے موتی فراہم کئے" ہیولاک ایلیس نے اور دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ ,, اس انداز کا گز بھر سہرا" حضرت نیاز کا۔

انسانی زندگی کے ہر شعبے میں عمل اور طرز عمل کے فرق و امتیاز ہی سے صورتیں الگ الگ قائم ہوتی ہیں' ان کے نام بھی الگ رکھے جاتے ہیں اصطلاحیں وجود میں آتی ہیں' اور ان کے دائرے اور حدود متعین ہوتے ہیں ---- اور ان حدود کی پامالی حد درجہ سنگین بات قرار دی جاتی ہے۔

"ترغیبات جنسی" نیاز صاحب کی مقبول کتابوں میں سے ایک ہے اور ۱۹۴۱ میں دوسری مرتبہ چھپی ہے۔ اس کے اندرونی ٹائیٹل پر دو سطروں کی ایک گول مول سی عبارت یوں درج ہے۔

"ترغیباتِ جنسی"

جس میں تاریخی علمی و نفسیاتی نقطہ نظر سے انسان کے میلانِ شہوانی پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔

از : "نیاز فتح پوری"

پہلے تو آپ اس لفظ "از" کی وسعت پر ایک نظر ڈالئے، جس کے دائرے میں تصنیف بھی آسکتی ہے، تالیف بھی، تدوین بھی، ترجمہ و تلخیص بھی، اخذ و اقتباس بھی (خواہ یہ اخذ و اقتباس مختصر ہو خواہ مطول، تلخیصی ہو یا تفصیلی) بلکہ اگر کوئی صورت اور، ان صورتوں کے علاوہ ممکن ہو تو وہ بھی ---- "از" کا دائرہ واقعی بڑا وسیع ہے اور نیاز صاحب اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے سوا تین صفحوں پر مشتمل کچھ باتیں اس موضوع اور اس کتاب کے بارے میں تحریر فرمائی ہیں، جس کی سرخی ہے "تمہید" ----- اور اس تمہید میں درج یہ ہے کہ!

"مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ گزشتہ ربع صدی میں کہ اس دور میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس پر توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا۔ لیکن مشرقی زبانوں میں اور خاص کر اردو میں کوئی ایک قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی......... عرصہ سے میرا خیال تھا کہ ایک بسیط تالیف اس موضوع پر پیش کروں اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلے کے کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدے ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

نیاز

پس اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ وہ اگر چاہتے تو یہیں دو چار سطریں اور بڑھا سکتے تھے کہ اس "خیال" کی تکمیل کس طرح ہوئی۔ انہوں نے اپنے خیال کا تذکرہ تو کیا لیکن اس کی تکمیل کی راہ جس طرح ہموار ہوئی اس کا اشارہ تک نہ کیا۔ بلکہ ایک گول مول سی بات کہہ کر اپنی تمہید ختم کر دی حالانکہ یہ تمہید متقاضی تھی کہ چند سطریں اور بڑھائی جاتیں۔ مثلاً یہی لکھ دیا جاتا کہ!

"حسن اتفاق دیکھئے کہ ہیولاک ایلیس کی ایک بسیط کتاب "مطالعۂ نفسیاتِ جنس" مجھے مل گئی جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہے اور میرا کام آسان ہو گیا۔ اب میں اسی کے مختلف اہم مباحث کا ترجمہ نسبتاً اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں......"

ترغیبات جنسی صفحہ ۷ سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۲۱۶ پر تمام ہو جاتی ہے۔ لیکن اہتمام رہے کہ بھولے سے بھی کہیں کوئی تذکرہ اصل ماخذ کا نہ آنے پائے۔ ویسے تو کتاب میں حاشیئے اور حوالے آپ کو بہت ملیں گے اور ماخذ کا کوئی تذکرہ درج نہیں ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ کتاب کے اندر جتنے بھی حاشیئے اور حوالے ہیں وہی ماخذ ہوں گے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام حاشیئے اور حوالے بھی 'جو فٹ نوٹ کی صورتیں ہیں اب ہیولاک ایلیس ہی کی عبارتوں اور حاشیوں کے اجزا ہیں' جن کو نیاز صاحب نے کہیں متن کی صورت میں' کہیں اقتباس کی صورت میں اور کہیں حاشیئے کی صورت میں درج فرما کر اطمینان سے اپنا لیا ہے۔

کسی شخص کی کتاب کا یا اس کی کتاب کی مختلف جلدوں کا یا ان جلدوں کے ابواب و مباحث کا اس طرح ترجمہ کرنا اور اس کو اپنی کتاب کی صورت میں پیش کرنا اور یہ اہتمام بھی کرنا کہ اصل مصنف و محقق کا کہیں نام تک نہ آنے پائے یا آئے تو غیروں کی طرح آئے اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ جس کا نام غیروں کی طرح آیا ہے در حقیقت وہی اصل مصنف و محقق ہے اور یہ اسی کی متاع عزیز ہے جس کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کر کے اپنایا لیا گیا ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے "کیا لکھئے" ☆ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے "کیا کہئے"

صفحہ ۷ پر "فحاشی کی تعریف" بہ صورت عنوان درج ہے اور یہیں سے ترجمہ و تلخیص 'اخذ و اقتباس اور الٹ پھیر کا آغاز ہو گیا ہے۔ ہیولاک ایلیس کی کتاب کے صفحہ ۲۲۴ پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ رومی الپیون (Romi Alpian) گیوت (Gyo..) بونگر (Bonger) رچرڈ (Richard) ڈاکٹر بلاخ (Bloch) وغیرہ کی باتیں اور حوالے سب وہیں کے ہیں' "فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب" کی بغلی سرخی بھی اور اس کی تمام باتیں بھی۔

خیر آیئے دیکھئے کہ حضرت نیاز نے ہیولاک ایلیس کی عبارتوں کا ترجمہ کس کس طرح کیا ہے، یا تلخیص کی ہے تو کس انداز سے کی ہے یا مضمون اڑایا ہے تو کس صورت سے۔!

صفحہ ۱۱ پر انہوں نے "نظام امہاتی" کی بغلی سرخی لگائی ہے اور ساتھ ہی ان کی عبارت یوں سامنے آتی ہے!

"نظام امہاتی سے مراد معاشرت کا وہ نظام ہے جس میں قوم کی ماؤں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اول اول یہی نظام قائم تھا چنانچہ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر باچوفن ایشیائے کوچک کی قوم لائسی کو پیش کرتے ہیں' جس میں نظام امہاتی کا رواج پایا جاتا تھا اور اس کی تصدیق ہیرو ڈوٹس کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ اس قوم میں بچہ کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جو

قدر و منزلت ماں کی ہوتی تھی وہی بچہ کی ہوا کرتی تھی۔

جزیرہ سماترا میں اب بھی نظام رائج ہے۔ یعنی شادی کے بعد شوہر اپنی بیوی کے گھر جاکر رہنے لگتا ہے اور اس کے تمام مصارف لڑکی والے پورا کرتے ہیں' اس قسم کی شادی کو "امبیل اناک" کہتے ہیں۔ (ہندوستان میں گھر دامادی کا رواج اسی قبیل کی چیز ہے۔)!

(ترغیبات جنسی صفحہ ۱۱)

ہیولاک ایلیس کی انگریزی عبارت آپ کے سامنے ہے جس کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں ہوگا :

"ایک زمانے میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ سوسائٹی کے ابتدائی احوال میں 'عہد پدری کے قیام سے پہلے' جس میں عورتیں مردوں کے زیر سایہ رکھی جاتی ہیں' نظام امہاتی رائج تھا اور اقتدار عورتوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اب سے کوئی نصف صدی پہلے باچوفن اس خیال کا بڑا علمبردار تھا۔ ایشیائے کوچک کے قدیم لائسی قبائل میں نظام مادری کی ایک خاص مثال بھی اس کو ملی تھی' جن کے یہاں بقول ہیرو ڈوٹس' بچے کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا تھا اور وہ درجہ بھی وہی پاتا تھا جو اس کی ماں کا ہوتا تھا۔ نہ کہ باپ کا......

بظاہر امہاتی خانوادے کی ایک شکل ہم اس کو بھی تصور کر سکتے ہیں' جو سماٹرا کے طریقہ ازدواج "امبیل اناک" پر مبنی ہے' جس میں شوہر اپنی بیوی کے گھرانے میں جا بستا ہے اور کچھ مصارف اس کو ادا نہیں کرنے پڑتے اس کی حیثیت ماتحت کی ہوتی ہے" (سیکس ان ریلیشن ٹو سوسائٹی صفحہ نمبر ۳۹۱-۳۹۰ جلد ہشتم)

نیاز صاحب نے اپنی عبارت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا ہے کہ "ہندوستان میں گھر دامادی کا رواج بھی اسی قبیل کی چیز ہے" جس سے تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ انہوں نے متاع غیر کو اپنا رنگ دینے کی دلچسپ صورت نکالی ہے۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ ہیولاک ایلیس نے ساری دنیا کے قبائل و اقوام کی زندگی' رسم و رواج اور طور طریق پر بحث کی ہے اور ہندوستان کو بھی اس نے چھوڑا نہیں ہے۔

پھر "شادی کی انگوٹھی" کے عنوان سے نیاز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حال یہ ہے کہ دو ورق پہلے کی بحث سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ "اگرچہ قدیم اہل روم میں عورتوں کی کافی عزت و وقعت کی جاتی تھی۔" حالانکہ صفحہ نمبر ۴۲۸ پر ہیولاک ایلیس نے یہ لکھا ہے کہ "روم کے آخری عہد میں جب نظام پدری باقی ہونے کے باوجود برائے نام رہ گیا تھا۔ عورتوں نے تقریباً آزادی کامل حاصل کرلی تھی" نیاز صاحب نے ۴۳۱ کے پیراگراف کی ایک عبارت بیچ سے لے لی اور دونوں کو جوڑ دیا۔ نیاز صاحب کی اردو عبارت اور ہیولاک ایلیس کی انگریزی عبارت دونوں آپ کے سامنے ہیں :

۱۱؎ "اگرچہ قدیم اہل روم میں عورتوں کی کافی عزت و وقعت کی جاتی تھی لیکن قدیم جرمنوں نے جو فطرتاً جنگجو واقع ہوئے تھے' بیوی کو کبھی گھر کی لونڈی سے نہ سمجھا اور خریداری عروس ہی کے طریقے کو وسعت دی اور اس طرح سارے یورپ میں عروس فروشی کا رواج عام طور پر پھیل گیا۔ پہلے بطور بیعانہ کچھ نقد رقم وصول کرلی جاتی تھی لیکن جب سوسائٹی اس بات کو معیوب خیال کرنے لگی تو بجائے رقم بیعانہ کے دلہن کو ایک بیش قیمت انگوٹھی پیش کی جانے لگی۔ اس کو جرمن اصطلاح میں "ازحا" کہتے تھے۔ جس کے معنی ہیں شادی کا بیعانہ"

قرون وسطیٰ میں اس رسم کے ساتھ اور رسمیں شامل کرکے دلہن کو بالکل کنیز کی حیثیت دے دی گئی۔ مثلاً انگلستان میں دستور تھا کہ جب دولہا دلہن کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تو وہ پہن کر شوہر کے قدموں میں گر پڑے۔ روس میں بھی دلہن اپنے شوہر کے پاؤں چوما کرتی تھی۔ پھر بعد کو اس رسم میں کچھ تبدیلی کردی گئی' یعنی منگنی کے وقت دولہن قصداً انگوٹھی کو ہاتھ سے نکال کر شوہر کے قدموں میں گرادیتی' اور اس کو اٹھانے کے بہانے شوہر کے پاؤں چھولیتی۔ (ترغیبات صفحہ نمبر ۲۴ تا ۲۵)

ہیولاک ایلیس کی انگریزی عبارت کا اصل ترجمہ کچھ یوں ہوگا کہ :

"لیکن ان جرمن ابتدائے عہد انسانی سے پائی ہوئی بے لگام وحشت کی جنگجویانہ جبلتوں کی بدولت اپنی بیوی کو کنیز بنا کر رکھنے میں دور اول کے اہل روم سے بھی آگے تھے۔ انہوں نے ان بیاہی لڑکیوں کو بڑی حد تک جنسی چھوٹ تو دے رکھی تھی مگر ان کے نظام ازدواج نے (اہل روم کی بیویوں سے مقابلہ کرکے دیکھئے تو) بیویوں کو باندیوں سے زیادہ نہ رکھا تھا۔ کسی نہ کسی شکل اور کسی نہ کسی بھیس میں جرمنوں کے یہاں خریداری کا طریقہ جاری رہا۔۔۔۔۔ عروس فروشی عام رہی' انگوٹھی اصلاً علامت کنیزی نہیں تھی۔ جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ عروس کی قیمت کی ایک صورت تھی جسے "اراہ" کہتے تھے یعنی معاہدہ ازدواج کی پیشگی زر امانت یا اس کی نشانی۔۔۔۔۔ پھر بعد میں اس کا مفہوم کنیزی ہو گیا' اور پھر اور بعد کو قرون وسطیٰ میں دوسری رسموں کے ذریعہ یہ کنیزی حتہ تر ہو گئی۔ چنانچہ انگلستان اور یارک اور شاہ روم کے ضوابط میں دلہن کے لئے یہ ہدایت درج تھی کہ انگوٹھی پانے کے بعد وہ اپنے شوہر کے قدموں پر گر جائے اور کبھی تو یہ بھی کہ اس کا داہنا پاؤں چومے۔۔۔۔۔ روس میں بھی دلہن اپنے شوہر کے پاؤں چوما کرتی تھی۔ بعد کو فرانس میں اس رسم میں تخفیف ہوئی اور یہ رواج ہوا کہ قربان گاہ کے سامنے دلہن انگوٹھی اپنے ہاتھ سے گرادیتی اور پھر اس کو اٹھانے کے لئے شوہر کے قدموں میں جھک پڑتی تھی"

یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ نیاز صاحب نے ترجمہ کیا ہے' تلخیص کی ہے یا کچھ اور۔ ہیولاک ایلیس

کی عبارت میں جہاں نقطے نقطے درج ہوں وہاں یہ سمجھیے کہ بیچ میں کچھ عبارتیں اور موجود ہیں جن کو نیاز صاحب نے کسی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور بعض الفاظ کو بھی نظر انداز کیا ہے بعض کے معنی بدل دیے ہیں۔

اس کے بعد "آزمائشی شادی" کی سرخی دے کر لکھتے ہیں :

یورپ میں بغیر نکاح کے جو تعلقات جنسی قائم ہو جاتے ہیں انہیں آزمائشی شادیاں کہتے ہیں' ان تعلقات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نکاح سے قبل ہی آئندہ ازدواجی زندگی کے خوشگوار ہونے کا یقین کر لیا جائے۔ (صفحہ نمبر ۲۵)

ترجمہ یا تلخیص یا جو کچھ آپ اس کو کہیں۔ اس کا سلسلہ صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۰ تک "اسی طرح" چلا گیا ہے۔ جس میں مختلف ملکوں اور علاقوں میں آزمائشی شادی کے رواج' ان کی اصطلاحات اور اثرات و کیفیات کا تذکرہ ہے' یہ بحث ہیولاک ایلیس کی اصل انگریزی کتاب میں صفحہ ۳۷۹ سے ۳۸۹ تک پھیلی ہوئی ہے۔

پھر قدیم ویلز' آئرلینڈ' قدیم چین' جاپان' قطب شمالی کے اسکیمو قبائل اور اہل فرانس وغیرہ کے دستور طلاق و خلع' کی تفصیل ہے جو صفحہ ۳۲ سے ۳۶ تک نیاز صاحب نے بغلی سرخیاں لگا کر ترغیبات جنسی میں درج کی ہے' وہ ہیولاک ایلیس کی کتاب ششم کے صفحہ ۴۶۱ کا ترجمہ ہے۔

نیاز صاحب نے "فحاشی پر عمومی تبصرہ" کے عنوان سے بھی ایک باب قائم کیا ہے' جس میں محافل نشاط، عید الحمقاء، قدیم یونانیوں اور رومیوں کا خیال' وحشی اقوام کی رنگ رلیاں' عصمت فروشی' وحشی اقوام میں' شادی کا خرچ اور جہیز' فحش کی ابتداء' فحاشی ممالک مشرق میں ..... قحبگی قدیم روم میں' مسیحیت کا اثر فحاشی پر' قحبگی کے خلاف جہاد' اوارت فحش' پیشہ ور عورتیں' قحبگی کے قواعد و ضوابط' اور اسباب و علل وغیرہ وغیرہ کی بغلی سرخیوں کے تحت جو بحثیں یا بحثوں کی جھلکیاں درج کی گئی ہیں اور ترغیبات جنسی کے صفحہ ۸۷ سے صفحہ ۱۸۲ تک پنچانوے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں وہ ساری بحثیں ہیولاک ایلیس کی جلد ششم کے صفحہ ۲۱۸ سے صفحہ ۲۹۸ تک کا ترجمہ ہیں۔ لیکن کہیں کہیں تلخیص ناقص بھی ہے' کہیں بعض عبارتیں حذف بھی کر دی ہیں اور کہیں عبارت سمجھ میں نہیں آتی ہے تو مفہوم کچھ اور ہو گیا ہے۔

نیاز صاحب نے "قحبگی میں حیاتیاتی عنصر" کی بھی ایک بغلی سرخی لگائی ہے اور لکھا ہے کہ "بعض ماہرین فن اور محققین کا یہ خیال ہے کہ جس طرح بعض مردوں میں جرائم پیشگی کی طرف ایک پیدائشی رغبت ہوتی ہے اسی طرح بعض عورتوں میں بھی فحاشی کی طرف میلان پایا جاتا ہے" ..... اور یہ نقل کیا ہے کہ ایک پیدائشی مجرم اور پیدائشی فاحشہ بلحاظ نفسیات اور بلحاظ تشریح الاعضاء اخلاقی پاگل ہیں' دونوں میں

وہی احساس اخلاق کا فقدان' وہی سنگدلی' وہی میلان بدکاری' وہی متلون مزاجی' وہی تن آسانی اور وہی عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق اور وہی خود بینی و خود نمائی ہوتی ہے۔ گویا فحبگی نسوانی پہلو ہے مجرمیت کا" (ترغیبات صفحہ ۱۵۷) پھر لکھتے ہیں کہ لومبروز (Lombroz) کا قول یہ ہے کہ "فحبگی کی بنیاد اخلاقی حماقت (Moral Idiocy) ہے" اور اگر "اخلاقی حماقت کے معنی "اخلاقی کمزوری" کے ہیں یعنی قواعد و ضوابط اور تہذیب تمدن سے بے پروائی اور شرم وحیا کی طرف سے بے حسی' تو یہ قول کسی حد تک سچ ہے" (ترغیبات صفحہ ۱۶۳) یہاں ارتکاب جرم پر تبصرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے اور نہایت اہم ہے۔ ہمیں اس کی بابت مزید کچھ کہنا نہیں۔ سوائے اس کہ یہ تبصرہ بھی ہیولاک ایلیس کی بحث "Sex in relation to Society" کے صفحہ ۲۶۸ پر موجود ہے۔

آپ کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجئے اور اصل انگریزی کتاب کو سامنے رکھ کر پڑھتے اور پڑھتے چلے جایئے۔ ہم تو اس مشکل میں پڑ گئے ہیں کہ چھوڑیں تو کیا چھوڑیں اور درج کریں تو کیا درج کریں'......

صفحہ ۸۷ پر ایک ذیلی سرخی آپ کی نظر سے گزرے گی' "محافل نشاط"۔ ہیولاک ایلیس کے یہاں یہی "Orgy" ہے۔ اور دیکھئے کہ دونوں نے کس طرح اس کو سمجھا اور سمجھایا ہے:

جن حضرات نے ارتقاء مذہب و تمدن پر نظر ڈالی ہے وہ خوبی واقف ہیں کہ جوں جوں انسان کا روایتی اخلاق' احساس مذہب اور سوسائٹی کا آئین ترقی پاتا گیا اسی قدر انسان میں جذبہ زہد و اتقا بڑھتا گیا۔ لیکن جب جب اس کا رد عمل ہوا تو پھر اسی مذہب سے رواج فحاشی کا کام لیا گیا اور محافل عیش و نشاط پر تقدس کا رنگ چڑھا کر ان کو جائز و مباح قرار دیا گیا' انگریزی زبان میں اس قسم کی محافل شبینہ کو "اورجی" (Orgy) کہتے ہیں۔ لفظ "اورجی" درحقیقت یونانی زبان کے لفظ "اورجیا" (Orgia) سے متعلق ہے جس سے مراد قدیم یونان کا وہ جشن ہے جو شراب کے دیوتا کی یادگار میں منایا جاتا تھا۔ اس جشن میں اس دیوتا کی سوانح حیات کا کوئی واقعہ منتخب کر کے بطور تمثیل دکھایا جاتا تھا اور نوشانوشی کے ساتھ ایسا زبردست ناچ ہوتا تھا کہ لوگ آپ سے باہر ہو جاتے تھے اور اپنی خواہشات نفسانی بھی پوری کر لیتے تھے۔

(اسی طرح ہندوستان میں سری کرشن مہاراج اور برج کی گوپیوں کی رنگ رلیاں طور تمثیل عموماً دکھائی جاتی ہیں جن کو "رہس" کہتے ہیں۔ ان میں بھنگ چرس گانجہ کا استعمال ہوتا ہے اور ناچ گانے کی آزاد محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان تماشوں کا اصل مقصد تعمیر سیرت تھا لیکن بعد کو خواہشات نفسانی کا عنصر بھی ان میں داخل ہو گیا۔)

اسی طرح مسیحیت میں بھی رہس لیلا پائی جاتی تھی جس میں حضرت مسیح یا دیگر اکابر مذہب کے سوانح حیات میں سے کوئی واقعہ چن کر بطور تمثیل دکھاتے تھے۔ مسیحی دنیا میں محافل عیش و نشاط عموماً خانقاہوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں بڑے راہبان اور بڑی بڑی پاکدامن مسیح کی تمرلیاں (Nuns) شریک ہوا کرتی تھیں۔ چنگ و ارغنوں کے ساتھ دور بادہ ناب چلتا تھا اور خوب خوب خوش فعلیاں ہوتی تھیں۔ یہ سب باتیں اس زمانہ کی "باقیات" سے تھیں جب تمام یورپ شرک و بت پرستی کی تاریکی میں مبتلا تھا۔

دوسری سرخی ہے "عید الحمقاء" لکھتے ہیں:

۷۴۳ میں بمقام "بینالٹ" "کلیسائے مقدس کے علماء کا اجلاس ہوا جسے "سناڈ" کہتے تھے اس میں یہ بات پیش کی گئی کہ "فروری" میں جو "اور جی" ہوئی ہے اسے بند کیا جائے کیونکہ وہ زمانہ بت پرستی کی یادگار ہے۔ لیکن یہی "بت پرستوں کی عید" کلیسائے مسیحی کی مقدس ترین "کارنوال" میں شامل کرلی گئی، جو مسیحی تہوار "بینٹ" کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس تہوار کے شروع ہونے سے قبل جو منگل واقع ہوتا ہے اس دن اور اس کے بعد والے اتوار کو عیسائیوں کی بڑی بڑی محافل عیش و نشاط برپا ہوتی تھیں، جن میں ہر طبقے کے لوگ شرکت کرتے تھے اور آزادی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بعض آدمی خوش غلاف ہو کر چلتے تھے بعض جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتے تھے اور بعض بالکل حیوانِ مطلق بن جاتے تھے۔ صفحہ نمبر ۸۸

اس عبارت کی صورت جیسی بھی ہو، اس میں "بعد والے اتوار" کی بجائے "پیشتر والے" ہونا چاہئے۔ اسی طرح جہاں یہ ہے کہ "بعض" "چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے تھے" اس کے ایک فقرہ یہ رہ گیا ہے کہ "بعض پرندوں کی طرح" پرندوں کی ٹانگیں بنا کر اس کے سہارے چلتے تھے۔

آگے کی عبارت ہے:

بارھویں صدی میں یورپ میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً یہ سلسلہ عید نوروز ایک عید الحمقاء قائم ہوئی جسے انگریزی میں Feast of Fools کہتے تھے اس تقریب میں تمام مسیحی دنیا حد درجہ بیہ مستیوں کا اظہار کرتی تھی جس میں سب سے زیادہ حصہ مقدس پادری لیتے تھے۔ صفحہ ۸۹

اس کے بعد حضرت نیاز نے ایک اور بغلی سرخی قائم کی ہے "قدیم یونانیوں اور رومیوں کا خیال ہے" اور لکھتے ہیں کہ:

قدیم یونانیوں اور رومیوں نے اس خیال کو اکثر جگہ ظاہر کیا ہے کہ مسلسل محنت اور زہد و اتقا کے بعد انسان کو کبھی کبھی "غم غلط" کرنا چاہئے چنانچہ نطشے نے قدیم یونانیوں کی نسبت بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"وہ لوگ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے، خواہ ان میں

بعض کتنے ہی ادنی درجے کے کیوں نہ ہوں اور اسی لئے وہ ایسا انتظام کرتے تھے کہ کسی دن خاص رسوم کے ساتھ جذبات کو آزاد چھوڑ دیتے تھے۔"

حکیم Sencer نے جو رومی معلمین اخلاق میں سب سے زیادہ صاحب اثر شخص تھا یہاں تک سفارش کی ہے کہ کبھی کبھی ہمیں اتنی شراب پی لینی چاہئے کہ سروپا کا ہوش نہ رہے کیونکہ شراب ہمارے آلام وافکار کو دھو دیتی ہے اور ہم کو عمیق ترین گہرائیوں سے ابھار کر مسرت وشادمانی کی سطح پر لے آتی ہے۔ شراب کے موجد کا نام لائبر (Liber) ہے کیونکہ وہ انسان کی روح کو فکروں کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ غلامی کی زنجیریں توڑ دیتا ہے نئی روح پیدا کرتا ہے اور شراب ہم کو تمام کاموں کے لئے پوری طرح دلیر بنا دیتی ہے۔ صفحہ نمبر ۹۰

روم والے یونانیوں کے شاگرد تھے اور ان لوگوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جذبات وخواہشات کو کبھی کبھی پورے ہونے کا موقع دینا چاہئے لہذا انہوں نے بھی اپنے یہاں بعض ایسے تہوار قائم کر لئے تھے جن میں انسانوں کی خواہشات نفسانی کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ (صفحہ نمبر ۹۰)

یہ آپ دیکھئے کہ یہ ترجمہ یا مفہوم عبارت کس قسم کا ہے' "روم والے ابھی یونان کے شاگرد تھے" یہ اصل عبارت کا مطلب تو نہیں ہے۔

ایک اور ذیلی سرخی ہے "وحشی اقوام کی رنگ رلیاں۔" مگر یہ بھی دیکھتے چلئے کہ ان رنگ رلیوں کی بابت ان کی تحریریں کس طرح سے رواں ہیں۔

دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی وحشی وپست ہو، ایسی نہیں ہے جس میں وقتاً فوقتاً یا مقررہ اوقات پر رنگ رلیاں منانے کی ضرورت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ اسپنسر اور گلن نے اپنی کتاب "وسطی آسٹریلیا کی شمالی قومیں" کے باب از دہم میں لکھا ہے کہ :

"وسطی آسٹریلیا کی واڑاموںگا قوم میں ایک تہوار ہوتا ہے جسے وہ لوگ "ناتھاگورا" کہتے ہیں اس تہوار میں لوگ آگ سے کھیلتے ہیں اور بعض عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ یہ تہوار بالکل ایسا ہے جیسا رومیوں میں سٹرنیلیا ہوتا تھا۔ یا ہندوؤں میں ہولی کی دلبستگی ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب واخلاق کے تمام آئین وقوانین بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی اور لوگوں کو نوشا نوش کی پوری اجازت حاصل ہوتی ہے۔"

ہل ٹاؤٹ نے جرنل انتھرو پولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جولائی و دسمبر ۱۹۰۴ء) کے صفحہ ۳۲۹ میں لکھا ہے کہ :

,,برطانوی کولمبیا کی امریکی قوم ساش" بیان کرتی ہے کہ یورپیوں کے آنے سے قبل ان کے آباء واجداد ہفتہ میں ایک روز یوم السبت یعنی آرام و آسائش کا دن منایا کرتے تھے اس روز وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے تھے اور صبح سے لے کر دوپہر تک مذہبی ناچ رنگ میں مصروف رہتے تھے" صفحہ نمبر ۹۲

دیکھئے انگریزی عبارت میں قبیلہ (Trib e) تھا۔ نیاز صاحب نے اس کو ,,قوم" بنادیا۔ پھر یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ اسپنسر اور گلن کا تذکرہ انگریزی عبارت میں کس طرح آیا ہے اور ہل ٹاوٹ کا بیان کس طرح منقول ہوا ہے" لیکن ان دونوں کے بیان کو انہوں نے مسخ کر کے خود اپنی تحریر کا ,,اقتباس و حوالہ" قرار دینے کی کس اہتمام سے کوشش فرمائی ہے جیسے اسپنسر اور گلن کی کتاب اور جرنل انتھر وپولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جولائی و ستمبر ۱۹۰۴ء) کے صفحات خود ان کے سامنے کھلے رکھے ہوں۔ یہ تاثر دینے کا سبب بالکل ظاہر ہے۔ اسی طرح سے اے ای کرالی کی کتاب ,,پر اسرار گلاب" (Mystic Rose•) کا حوالہ بھی دیکھئے۔ کس طرح پیش کیا ہے" فرماتے ہیں کہ اے ای کرالی نے اپنی کتاب ,,پر اسرار گلاب" (Mystic Rose) میں لکھا ہے :

" مختلف اقوام میں رنگ رلیوں کے لئے جو دن مخصوص کر دیئے جاتے تھے، ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان پر انا بوجھ اتار کے ہلکا ہو جائے اور دنیا میں از سر نو کام کرے۔ بعض ملکوں میں لوگ یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ایسے تہواروں میں اپنی بیویاں تک بدل لیتے ہیں۔ اس کا مقصد شادی بیاہ نہیں ہوتا ہے بلکہ قانون ازدواج کو توڑنا ہوتا ہے اور یہ تبدیلی دوامی نہیں، عارضی ہوتی ہے ایسے مواقع پر حرام و حلال کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی از سر نو شروع کی جائے۔" صفحہ ۹۲

ان دونوں عبارات پر بھی غور کیجئے" جو مفہوم جہاں بدلا ہے" یا جو کچھ انہوں نے حذف کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ شاید نیاز صاحب کو بحث کی نوعیت سے غرض نہیں بلکہ صرف رنگ رلیوں کے تذکرے سے ہے۔ ورنہ وہ نہ صرف یہ کہ کرالی کے تذکرے وہ عبارت جو ہولاک ایلیس نے لکھی تھی" نظر انداز نہ فرماتے" بلکہ اس سے بیشتر ,,اورجی" کے تذکرے میں بھی جو یہ بات درج تھی اس کو بھی حذف نہ کرتے کہ ,,اورجی" میں اصلاً مذہبی مقاصد کے مراسم ہوا کرتے تھے مگر بعد میں اس کی تقدیس وغیرہ غارت ہو گئی......"

ہیولاک ایلیس نے اپنی ضخیم کتاب کی ہر جلد کے ہر صفحے پر دوسروں کے پیش کردہ بیانات اور خیالات کو اور حاصل تحقیقات کو پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے اور ہر فلسفی یا محقق و مصنف کے نام کا اس کی کتاب کے نام کا اور کتاب کے صفحات کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر یہی بات تھی جس کو نیاز صاحب نے

روا نہیں رکھا۔ حالانکہ جتنی معلومات ان کو حاصل ہوئیں وہ سب ہیولاک ایلیس کی محنتوں اور جانفشانیوں کے ذخیرے سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس پورے باب کو دیکھئے، نیاز صاحب کا اشہب قلم جو ترغیبات جنسی کے صفحہ نمبر ۹۳ سے ۱۸۲ تک رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ ہیولاک ایلیس کی جلد ششم (صفحہ نمبر ۲۱۸ تا ۲۹۸ کے مرتب کردہ صفحات پر سرپٹ دوڑتا چلا گیا ہے' جا بجا اسے ٹھوکر بھی لگتی ہے، وہ بدکتا بھی ہے، چھلانگ بھی لگا لیتا ہے اور کترا بھی جاتا ہے۔

ترغیبات جنسی کے صفحہ ۹۵ پر وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر شورٹز کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جس قوم میں نوجوانوں کے آزادانہ اختلاط و ارتباط میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور اس کے ساتھ جلد شادی کرنے کا بھی انتظام نہ ہوگا اس قوم میں عصمت فروشی لازمی طور پر پیدا ہوگی اور لذت نفس حاصل کرنے کے مختلف طریقے پیدا ہو جائیں گے۔

یہ ستم ظریفی ہے یا نہیں کہ ہیولاک ایلیس کی اس بات کو بھی نیاز صاحب نے اپنی ترغیبات میں کچھ اس انداز سے درج فرمایا ہے جیسے ڈاکٹر شورٹز کے حوالے سے وہ خود اپنی بات اور اپنا خیال پیش کر رہے ہوں یا ڈاکٹر شورٹز کے بیان کی تصدیق خود اپنی تحقیق کی بنا پر کر رہے ہوں' حالانکہ لب نہیں ہے ہیولاک ایلیس نے ڈاکٹر شورٹز کی یہ بات پیش کرنے کے بعد مزید ایک بات تبصرے کے طور پر لکھی تھی کہ :

وحشی اقوام میں شادی سے قبل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلقات شہوانی بہت آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعض خاص تہواروں اور تقریبوں میں کوئی روک ٹوک ہوتی ہی نہیں۔ لیکن ان وحشیوں میں پیشہ ور کسبیاں ہرگز نہیں ہوتیں۔ اگر فی زمانہ وحشی عورتیں نفس فروشی کرتی ہیں یا ان کے شوہر انہیں فروخت کر ڈالتے ہیں تو یہ صرف جدید تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔

ترغیبات جنسی کے صفحہ ۱۲۴ پر ایک بغلی سرخی ,,اعلی معیار کی پیشہ ور عورتیں'' بھی ہے اور اس سرخی کے بعد ہی کوئی نو سطروں کی عبارت ہے، جس کو پڑھ کر آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ یہ چند سطریں اسی شخص کے غور و فکر کی پیداوار ہونگی جس کی یہ اردو کتاب نظروں کے سامنے ہے کیونکہ نویں سطر کے بعد ہی ,,اقتباس'' کی صورت میں حسب ذیل عبارت درج ہے کہ ,,برچارڈ نے جو دربار پاپائیت کا نہایت سچا مورخ ہے۔

اپنے روزنامچہ میں لکھتا ہے کہ :

,,ماہ اکتوبر ۱۵۰۱ میں پاپائے اعظم نے جو حکم دیا کہ دربار میں پچاس ایسی عورتیں لائی جائیں چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ عشاء کے بعد یہ عورتیں قیصر بورجیا (Caiser Borgia) اور اس کی بہن

لقریزیہ (Luqrazia) کے سامنے پہلے تو پشواز پہن کر اہلِ دربار کے ساتھ خوب ناچیں بعد ازاں انہیں ننگا نچایا گیا- اس کے بعد شمع ہائے کافوری کے جھاڑوں کی مختلف روشنیں بنائی گئیں- شمعیں روشن کر دی گئیں اور فرش پر اخروٹ بکھیر کر ان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان بلوریں جھاڑوں کے درمیان جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلیں اور اخروٹ چنیں' اس سلسلے میں انعامات بھی تجویز ہوئے اور ان کو دیئے گئے، جن کی بے حیائی اہلِ بزم کو زیادہ پسند آئی-

اس پوری عبارت کو نیاز صاحب نے بڑی توجہ سے سمیٹ کر بہ صورت اقتباس نہیں کیا ہے اور اس میں بر چارڈ اور اس کی ڈائری کا جو تذکرہ کیا تھا، اس کو اقتباس سے علیحدہ کر کے اپنی عبارت کے طور پر درج کیا ہے پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ یہ عبارت اور اس سے اوپر کی نو سطری عبارت جو تمہید کتب کی صورت میں ہے' نیاز صاحب کی اپنی تحریر ہے اور اقتباس بر چارڈ کا- لیکن نیاز صاحب جس کی تحریر نہ یہ ہے نہ وہ' بلکہ تمام باتیں اور تمام عبارتیں' بغلی سرخی سے لے کر نیچے تک' ہیولاک ایلیس کی تحریر کے اجزا ہیں- انہوں نے کیا یہ ہے کہ ایک حصے کو متن کی شکل میں رکھا ہے- دوسرے کو اقتباس کی صورت دی ہے اور کہیں متن کو حاشیہ اور حاشیئے کو متن بنا دیا ہے- یہی ان کا خصوصی انداز پیش کش ہے- پڑھنے والا ترغیبات جنسی کے ۴۱۶ صفحات پر نظر ڈالے گا تو یہی سمجھے گا کہ بیشتر حصہ نیاز صاحب کا ہے' نیاز صاحب نے اس فن خاص کا گہرا مطالعہ فرمایا ہے اور اپنی زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور دیکھنا اقتباسات و حواشی کس قدر ہیں' انہوں نے کیسے کیسے محققین و مصنفین کے اقوال و بیانات سے اپنی کتاب کو مزین کیا ہے- محققانہ کتابوں کی صورت عام طور پر یہی ہوتی ہے اور کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا نہ ہوگا جس کے ذہن میں کتاب کا' اور اس کے اصلی' ذیلی اور ضمنی اجزاء کا' اور پھر کتاب کی صورت شکل کا ایک نقشہ موجود نہ ہو- یہ نقشہ معیار عام کی حیثیت رکھتا ہے' اس لئے ترغیبات جنسی کو پڑھنے والا شدید مغالطے کا شکار ہوگا اور اس کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ نیاز صاحب کی یہ کتاب اصل میں ہیولاک ایلیس کی مشہور ضخیم کتاب " مطالعۂ نفسیاتِ جنسی " کے مختلف مباحث کا ترجمہ ہے- اور انہوں نے کہیں تو پوری بحث اٹھائی ہے کہیں اس کے اجزاء کھینچ لئے ہیں- کہیں جلدی میں ان سے کچھ چیزیں چھوٹ گئی ہیں' کہیں مصلحتاً کچھ چیزیں حذف کر دی ہیں' مگر وہ نہ اس کو ترجمہ کہتے ہیں' نہ اخذ و اقتباس' نہ تلخیص نہ کچھ اور' بلکہ خاص طور پر اس سے گریز فرمایا ہے- اس گریز کا ایک اور بڑا ثبوت صفحہ ۱۳۹ پر خود ان کی یہ عبارت بھی ہے کہ " ہیولاک ایلیس کو ایک تجربہ کار شخص نے مندرجہ ذیل بیان لکھ کر بھیجا تھا جسے ہم اس کی کتاب " تعلقاتِ نفسانی اور معاشرت " سے اقتباساً درج کرتے ہیں-" یہاں لفظ " اقتباساً " خاص توجہ چاہتا ہے- کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ اقتباس جو درج

ہونے والا ہے' یا دو چار اور اقتباسات جو کہیں پہلے اس نام سے درج ہو چکے ہوں ان کو تو البتہ ہیولاک ایلیس کی چیز سمجھا باقی اور ساری چیزیں ہماری ہیں--- حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ نیاز صاحب جس کی یہ کتاب "ترغیبات جنسی" ساری کی ساری ہیولاک ایلیس کے گرانقدر سرمایہ حیات کے اڑائے ہوئے اجزا ہیں-

ہیولاک ایلیس کا یہ گرانقدر سرمایہ حیات "مطالعۂ نفسیات جنسی" اس کی عمر بھر کی محنت و جانفشانی اور تلاش و تجسس کا زبردست ذخیرہ ہے- اور کئی جلدوں میں ہے' ان جلدوں کے نام بھی' مباحث کی اہمیت و نوعیت کی بناء پر جدا جدا ہیں- مثلاً Sex in relation to society' یا "Sexual In-version" وغیرہ وغیرہ-

ایک بار نیاز صاحب نے---- بلکہ ہم نے غلط کہا' ہیولاک ایلیس نے---- استلذاذ کے مختلف طور طریق کے متعلق بھی قائم کیا ہے اور چونکہ اس کی کتاب جنسیات کے جملہ متعلقات پر ایک ہمہ گیر مجموعہ ہے' اس لئے استلذاذ کے جتنے بھی طریقے اور وسیلے زمانہ قدیم اور زمانہ جدید میں رائج رہے ہیں وہ سب اس نے جمع کر دیئے ہیں اور ان پر طرح طرح سے بحث کی ہے- اس نے ساری دنیا کے قبائل و اقوام کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی چھان بین کی ہے۔ خود ہندوستان کے عہد قدیم و جدید کی فحاشی اور اس کے ضمن میں رونما ہونے والے واقعات اور پیش آنے والے حالات بھی اس نے بیان کئے ہیں- نیاز صاحب نے جب "نعمت غیر مترقبہ" کے طور پر ہیولاک ایلیس کی اس بسیط کتاب کی جلدیں پائیں اور اس کے اجزا سمیٹے تو اپنی کتاب ترغیبات میں انھوں نے بھی استلذاذ کے بالوحوش" کی ایک فصل قائم کی اور سرخی کے نیچے اس کا انگریزی مرادف لفظ "Zorostra" صفحہ نمبر ۲۶۱ پر لکھا مگر آپ ہیولاک ایلیس کی کتاب دیکھئے اس میں "Zocerastia" درج ہے- اور یہی اصل لفظ ہے' ورنہ نیاز صاحب کے یہاں جو انگریزی لفظ لکھا گیا ہے اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہے- بہر حال نیاز صاحب اپنی اس فصل کا آغاز یوں کرتے ہیں کہ :

استلذاذ بالوحوش کے متعلق سب سے پہلا تاریخی ثبوت مشہور و معروف یونانی مورخ سیاح ہیرودوطوس کا بیان ہے جس نے منڈلیس کے متعلق لکھا ہے کہ :

"یہاں ایک مقدس بکرا ہے جس کی لوگ بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مقدس بکرا در حقیقت "پان دیوتا" (PAN) کا اوتار ہے- اور لطف یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں اولاد حاصل کرنے کی خواہش میں اس کی مدد حاصل کرتی ہیں-"

انگریزی عبارت ہیولاک ایلیس کی ہے اور اس کی کتاب میں صفحہ نمبر ۸۰ پر موجود ہے- اس نے اپنی بات' متن ہی میں ہیروڈوٹس کے حوالے کے ساتھ بیان کی ہے اور نوٹ میں "Book ii.

Chapter. 46" لکھا ہے۔ مگر علامہ نیاز نے اپنی، عبارت پر ۱ کا نشان لگا کر نیچے حاشیہ میں حوالہ اس طرح درج تو فرمادیا ہے کہ "Herodoutus, Book ii. Chapter 4" لیکن جس کے سرمایہ پر ان کی توجہ خاص ہے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ سبب واضح ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں مگر شمر یئے اوپر جو اوپر عبارت ہے وہ انگریزی عبارت کے مطابق نظر نہیں آتی اس کا سبب یہ ہے کہ ہیولاک ایلیس نے صفحہ نمبر ۸۰ کے فٹ نوٹ میں یہ بات لکھی تھی کہ :

Dulare (des Dirinities General views, chapter ii) brings together the evedences showing that in Egypt Women had connection with the saered goat, appently in order to secure fertility.

حاشیئے کی اس عبارت کو نیاز صاحب نے متن میں جوڑ لیا اور اس کے بعد لکھا کہ "اسی طرح مصر قدیم کی عورتوں کے متعلق دولارے (Dulare) نے لکھا ہے "۰۰۰۰۰ اور اس پر بھی نشان لگا کے نیچے حاشیہ میں اس کا نام اس کی کتاب کا نام اور باب کا حوالہ درج کر دیا ہے۔

پھر صفحہ نمبر ۲۶۳ پر لکھتے ہیں :

سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں قدیم باشندوں کے اور اس کا شوق موجود تھا' -------- متمدن دنیا میں یہ شوق عموماً دیہاتوں میں پایا جاتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں :

۱- حیات انسانی کے متعلق قدیم خیالات جن میں انسان اور حیوان کے اندر کوئی تمیز نہیں ہوتی۔
۲- دیہاتیوں اور ان کے جانوروں کا ہر وقت ساتھ رہنا۔
۳- عورت کا میسر نہ آنا۔
۴- بعض قدیم روایات، جن کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بعض بیماریوں کی شفا ہوتی ہے۔
۵- بعض قدیم اور پست قوموں کا اعتقاد یہ ہے کہ مرنے کے بعد بعض آدمی جانور اور بعض جانور آدمی بن جاتے ہیں۔ لہذا انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے جانور سے استلذاذ کوئی ذلت اور شرم کی بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جانور در حقیقت آدمی ہی ہوتے ہیں صرف "چولا" بدلا ہوا ہے۔ مذہبی کھیل تماشوں اور لیلاؤں میں بعض جانوروں کا روپ غالباً اسی خیال سے اختیار کیا جاتا ہے۔ (صفحہ نمبر ۲۶۳ تا ۲۶۴)

خوب غور کیجئے اور بتائیے' کہیں بھی کوئی بحث آپ کو ایسی نظر آتی ہے جس کی بنا پر یہ کہنے کی گنجائش نکلے کہ یہ سب کچھ نیاز صاحب کے ذہن و فکر' دل و دماغ' علم و فضل' تجربات ظاہر و باطن' اور تلاش و

تجسس کا ثمرہ ہے؟ اس باب میں بھی سب کا سب صفحہ نمبر ۱۷۲ ہیولاک ایلیس ہی کاوشوں کے نتائج ہیں جن کو انہوں نے اپنے صفحات پر بلا تکلف، مگر ٹکڑے ٹکڑے اٹھا کر بکھیر لئے ہیں۔ لیکن جب ہم نے یہ کہا کہ "صفحہ ۱۷۲ تک" تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آگے جو کچھ ہے وہ ان کی اپنی کاوش ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ، بیشتر انگریزی عبارت ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور نہ انگریزی کی نزاکت بیان کو وہ ہی محسوس کر سکے۔

ہیولاک ایلیس کی بحث "Modesty and Auto Eroticism" بھی نیاز صاحب کی یہاں ان کے "استلذاذ بالنفس" کی فصل میں (جو صفحہ ۲۷۲ سے شروع ہوئی ہے) اسی طرح اردو کا روپ بھرتی چلی گئی ہے۔ مگر ضروری نہیں ہے کہ یہ روپ مکمل ہی ہو، اور لطف یہ ہے کہ وہ مختلف محققین کے ناموں کے ساتھ ان کے حوالے درج کرتے کرتے صفحہ ۲۸۳ پر جب پہنچے تو یہ بھی فرمایا کہ "ہیولاک ایلس ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں"...... اللہ اللہ! "ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں"۔ جیسے کہیں راستے میں اتفاقاً مل گئے ہوں! یہ نہ بتایا کہ کہاں ملے اور کب ملے؟ خیر یہ ہم بتائیں گے۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ استلذاذ بالنفس، جانوروں میں، انسانوں میں، پھر اس کی تاریخ قدیم، استلذاذ بالادریہ، استلذاذ بالخیال وغیرہ وغیرہ، اس کے اسباب و عمل اور اس کے نقصانات...... یہ ساری تفصیل اسی ہیولاک ایلس کے مطالعہ نفسیات جنس کی جلد اول "ارانک سمبلزم" (Erotic Symbolism) کے صفحہ ۷۹ تا صفحہ ۸۵ سے ستون و حواشی سے، نیز صفحہ ۱۶۵ تا صفحہ ۱۷۰ کے ستون سے اور بقیہ حواشی صفحہ ۱۷۱ سے لی گئی ہے۔

وہ تو کہیئے کہ "تنگی داماں" والی بات تھی۔ یعنی نیاز صاحب کا ظرف کتابی بہت ہی مختصر تھا۔ صرف ۴۱۶ صفحات کا۔ ورنہ ترغیبات کی کوئی کمی نہ تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہیولاک ایلس کے اس عظیم الشان سرمایۂ تحقیق کی تمام جلدوں کو اسی طرح سمیٹ لیتے۔ مگر اس کا نام پھر بھی نہ لیتے۔

ہیولاک ایلس کی اس بسیط کتاب مطالعۂ نفسیاتِ جنس کی وہ تمام جلدیں جو نیاز صاحب کی نظروں کے سامنے تحقیق اور جن پر وہ ٹوٹ کے گرے تھے اور جن کے صفحات پر سرخ و سبز پینسل سے نشانات لگا لگا کر اس کی بہار دانش لوٹی تھی۔ "وہی سب جلدیں" ہمارے سامنے ہیں۔ یہ کتاب ادیب شہیر سید حسن امام صاحب وارثی کی ملکیت تھی اور لکھنؤ کے زمانہ قیام میں ان کے ساتھ تھی۔ نیاز صاحب ان کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے اور مطالعے میں ڈوب جاتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری صاحب بھی وہاں آتے تھے اور وہ بھی اسی انداز سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز

قصہ مختصر "ترغیبات جنسی" جو کچھ بھی ہے وہ ہیولاک ایلس کی ہے۔ نیاز صاحب کی نہیں ہے۔ ترغیبات کا ٹائیٹل یقیناً ان کا ہے اور ٹائیٹل کے بعد جو سوا تین صفحوں والی "تمہید" ہے وہ بھی ان کی ہے اور ترغیبات کے اندرونی ٹائیٹل کی پیشانی پر جو "حقوق محفوظ" کا ایک ستارہ چمک رہا ہے وہ بھی ان کا اپنا ہے۔ عام

طور پر لوگ بعض کتابوں پر "جملہ حقوق محفوظ" کا نقش جماتے ہیں۔ مگر یہاں مسئلہ نفسیات کا تھا، "جملہ حقوق محفوظ" رکھتے ہوئے، ان کے قلم اعجاز رقم نے بالآخر ایک جھجک محسوس کی ...... اور صرف اسی حد تک لکھا کہ "حقوق محفوظ"

۲۸۔

محترمی جناب احمد ہمیش صاحب ، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

حسب وعدہ بھائی جان مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی مرحوم کی ایک بڑی ہی دقیق تحقیق جو علامہ نیاز فتحپوری مرحوم کی شہرہ آفاق کتاب "ترغیبات جنسی" کے سلسلے میں ہے آپ کے رسالے "تشکیل" کیلئے ارسال کر رہا ہوں۔ مولانا مرحوم کو خدانخواستہ علامہ فتحپوری سے کوئی پرخاش نہ تھی جو اس مضمون کا محرک ہو بلکہ نئے تخلیق کاروں کا راستہ روکنے والے سرقہ باز صاحبان قلم کی گرفت کا سلسلہ مولانا مرحوم کے ماہنامے "نو عمروز" میں جید دلاور اسٹ ہر روز کے پہنچتا ہے جن ادبی سرقہ بازیاں کے نام سے چلا تھا۔ یہ مضمون بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ قارئین کرام انصاف کریں گے کہ دوسروں کی تخلیق اور کاوش و تحقیق پر ڈاکہ ڈالنا کیا ایسا جرم نہیں جسے نظرانداز کیا جائے۔ "جید دلاور اسٹ" کے نام سے ان تمام مضامین کا مجموعہ جو "نو عمروز" میں شائع ہوئے تھے ان شاء اللہ عنقریب شائع ہو جائے گا۔ علامہ فتحپوری کی "الحاد کی ترقی" پر بھی مولانا نے بہت کاوش کی تھی اور جو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ آپ کے رسالے کیلئے اس مضمون کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا ہے کہ فرسٹ ہینڈ ہے۔

اسرار ارشاد

۱۶ مئی ۹۸ء

تانیثی تنقید ۔۔۔ ایک تعارف ۔ ۲

مضمون

پروفیسر ساجدہ زیدی

عام غزلیہ شاعری کے برعکس جس شاعری میں نسوانی کردار ہمیں پورے جلال و جمال، آب و تاب، خودی و سپردگی، وفاو عشق، ہجر و وصال کے درد و نشاط، المختصر اپنے وجود کی تمام نیرنگیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں وہ میر انیس کے مرثیے ہیں۔ جن میں ہر کردار منفرد ہے۔ خصال اور اپنی ذہنی و جذباتی نہج میں خود گرو خود بیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انیس کا موضوع واقعہ کربلا اور شہادت امام حسینؑ ہے۔ ان کے کردار اہل بیت ہیں اور اخلاق و عظمت کی علامتیں ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بہ ایں ہمہ ان کی انفرادیت برقرار ہے۔ ان کے عمل، جذبوں اور رشتوں کی Dynamics میں ان کے وجود کے سب نشیب و فراز جلوہ گر ہیں۔ یقیناً یہ شاعری مرد و عورت کی مکمل نفسیات، اور فرداً فرداً ہر کردار کی شخصیت پر دسترس کا معجزہ ہے۔ (*۲)

اس ضمن میں ایک اہم نکتہ قابل غور ہے کہ تانیثی تنقید کا رجحان مکمل تنقید نہیں۔ یہ بھی اسی طرح تنقید کا ایک اور مدرسہ فکر ہے۔ جس طرح نفسیاتی تنقید لسانیاتی تنقید عروضی تنقید وغیرہ جو فن پارے کی جملہ ابعاد میں سے صرف ایک بُعد پر منطبق ہوتی ہیں اور اسی پر روشنی ڈال کر اسے فوکس میں لاتی ہیں۔ لہذا اور قسم کی یک جہتی تنقیدوں کی طرح تانیثی شعبہ بھی مکمل تنقید نہیں، لہذا تعین فرد کا واحد پیمانہ نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک زاویہ ہوتی ہے۔ اس تنقید سے کام لیتے ہوئے ہمیں فن پارے کی مجموعی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگانا چاہئیے۔ شعر و ادب کی مجموعی تاثیر، اس کے جمالیاتی پہلوؤں، موضوع کی عظمت، ہیئت کے حسن و دلکشی و آہنگ کے جملہ صفات ہی میں مضمر ہوگی۔ دراصل تانیثی تنقید اس ضمن میں اقداری تنقید کا درجہ رکھتی ہے مجموعی تنقید کا نہیں۔

اس نسبتاً طول طویل تمہید کے بعد ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہم عصر اردو ادب میں تانیثی تنقید کے جو تھوڑے بہت نمونے ملتے ہیں، ان کا رخ کس سمت ہے اور نمایاں رجحان کیا ہے۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ خواتین کی اچھی بری پختہ، ناپختہ، ادبی، غیر ادبی ہر طرح کی تحریروں کا علاحدہ سے جائزہ لینا ہی تانیثی تنقید کا مقصد و منصب ہے۔ لہٰذا اکثر جوش تانیثیت میں ان تحریروں کی بھی بڑی پذیرائی ہوتی ہے جو کسی لحاظ سے ادب کے زمرے میں شامل ہونے کے لائق نہیں۔ محض اس بناء پر کہ ان میں کسی نہ کسی قسم کا نسوانی احتجاج شامل ہے۔ یا صرف اس لئے کہ وہ عورتوں کی تحریریں ہیں۔ احتجاجی شاعری اچھی شاعری ہونے کے امکانات یقیناً رکھتی ہے۔ لیکن ہر نسوانی احتجاج شاعری نہیں ہوتا۔ (اعلیٰ شعری منصب تک پہنچنا تو درکنار) شعروادب کو سب سے پہلے شعروادب ہونا چاہئے خواہ وہ مردوں کی تخلیق ہو یا عورتوں کی۔ بحیثیت نقاد اولاً ہمیں عورتوں کی بہترین تخلیقات کی شناخت کرنا چاہئے جس میں فکشن اور شاعری ڈرامہ سب شامل ہیں۔ نقاد کو تانیثی ادب کے بہ نظر غائر مطالعے سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ خواتین کی تخلیقات میں کیا مخصوص ابعاد ہیں۔ مثلاً ان کی محبتیں، نفرتیں، جنس و جذبہ، مامتا اور انسانی رشتوں کی نہج کس حد تک اور کس انداز میں نسوانیت کے آئینہ دار ہیں۔ نیز ان کی تخلیقات میں عورت کا تصور ایک بھرپور و فعال شخصیت کے طور پر ابھرا ہے یا ایک شئے کی حیثیت سے۔ کیا ان کے منفرد جذبات و خیالات کو دکھ درد اور مسرتوں کو، ان کے تخیل کی اڑانوں کو پیش کیا گیا ہے یا وہ محض پرچھائیاں ہیں، جو سیاسی اور سماجی اتھل پتھل اور دنیا کے ہنگاموں سے بیگانہ، چراغ خانہ ہیں، جیسے وہ کشمکشِ زیست میں شامل ہی نہیں۔ کیا یہ تصور کیفیات و احساسات کے ہر شیڈ کی اہل ہے۔ فکر و نظر کی صلاحیت کا اس میں امکان ہے، یعنی کیا یہ کردار کارزارِ حیات میں شامل ہیں یا اس کی مجہول تماشائی ہیں۔ مختصر یہ کہ عورت، عورت کو کس طرح پیش کرتی ہے؟ مروجہ تصورات و تعصبات کے تانے بانے سے اس کی تصویر بناتی ہے یا اسے ایک جیتی جاگتی متحرک مخلوق کی طرح پیش کرتی ہے اس کی وہی امیج بناتی ہے جو مرد کے احساسِ برتری کو تقویت دے اور اس کی لذت کوشی، حسن پرستی اور جنسی ہوس کو تسکین دے یا عورت کو اس کے وجود کے تمام امکانات کی حامل سمجھتی ہے؟ خواہ اس کا تعلق کسی بھی طبقے یا ماحول سے ہو۔ اور اس کا ایک بھرپور تصور پیش کرتی ہے۔

مدعائے کلام یہ نہیں کہ عورتیں عورت کا آئیڈیل تصور پیش کریں ہرگز نہیں۔ بلکہ قابل اعتناوہ تحریریں ہیں، جس میں عورت بھی مرد کی مانند ایک فعال اور جیتی جاگتی مخلوق ہو، محض نسائیت کا منفعل مجموعہ نہ ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ جن نسوانی تحریروں میں شعروادب کے معیارات مجروح نہ ہوں، ان کو معرض بحث میں لانے کا کوئی جواز ہو سکتا ہے۔ سفر میں رمزیت، اشاریت، ایمائیت، استعارہ و علامت اور باریک سا ابہام کا پردہ نہ ہو، محض عریاں بیانی ہو تو وہ تخلیق نہیں محض کتھارسس ہوتا ہے۔ راست بیان یا عریاں بیانی یا زبان کا بھونڈا استعمال یا ڈکشن میں نظم و تناسب کا فقدان تحریر کو تخلیق کے زمرے سے ہی خارج کر دیتا ہے پھر اس کی تنقید چہ معنی دارد اور اس میں نسوانی احتجاج تلاش کرنا بے سود۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ جب کبھی نقاد عورتوں کی تحریروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو عموماً نسائی حسیت کی دہائی دے کر، ایسی تخلیقات کی بڑی پذیرائی کرتے ہیں جن میں آنچل، سہاگ، سیندور، مہندی، چوڑی وغیرہ کا ذکر ہو، یا دوسرے انداز میں مستقل قسم کی نسوانیت کا راگ الاپا گیا ہو۔ اس قسم کی نسائیت اس قسم کی نسائی حسیت کا راگ بھی ایک طرح سے مردانہ انگو کی تسکین کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ ان حربوں سے بھی عورت اپنے عورت پن کے ذریعے مرد کو مسحور یا متوجہ کرنے کے جتن کرتی ہے اور خود کو منفعل محسوس کرتی ہے یا ایک شے کی طرح پیش کرتی ہے۔

نسائی حسیت عورت کی زندگی اور تخلیق کا ایک پہلو یقیناً ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مفہوم نہ لینا چاہئے نسائی حسیت کا اظہار تو عورت کے جذبات و تجربات کی پوری رینج میں ہوتا ہی ہے جس کا عکس اس کی شاعری میں نظر آنا لازمی ہے۔ لیکن نسوانیت کے چند پیش پا افتادہ کلیشوں کو نسوانیت کی معراج سمجھنا اور ظاہر کرنا اور نازو غمزہ کو نسوانیت کا استعارہ سمجھنا بھی پرانی شراب کو نئے شیشے میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔ وہی شاعری قابل اعتنا ہو سکتی ہے، جو معیار ادب کی کسوٹی پر پوری اترے اور جس میں عورت اپنی مکمل موضوعیت اور اپنے وجود کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ ابھرے تنقید کا رخ اس سمت موڑا جائے تو معتبر تنقید وجود میں آسکتی ہے۔ ایسی تنقید جس

میں عورت بحیثیت فرد اور بحیثیت صنف اپنے وجود کی پوری معنویت کا استعارہ بن سکے۔ اپنے امکانات کے رو برو آسکے۔

ایک مَرد اساس معاشرہ میں جہاں عورت کو صدیوں سے ایک کمتر، کمزور، مجہول اور ناقص العقل مخلوق سمجھا گیا ہو، جہاں فی زمانہ اپنے حسن و جمال کی بناء پر اسے ایک شے میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔ جس کی معراج ہمارے موجودہ معاشرہ میں موڈل گرلز، طوائفیں، کمرشل فلموں کی ہیروئنیں، حسن کے مقابلے میں شریک ہونے والی عورتیں ہیں اور فلموں میں جنس کی عام مثالیں ہیں۔ احتجاج کم از کم دانشور اور فنکار عورتوں کا ایک فطری عمل ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس طور پر عورت کو "استعمال کی شے" بنانے کی کوشش ہے بلکہ تجارتی زندگی کے تانے بانوں میں اسے شیئت کا درجہ دے کر اسے منافع خوری کا آلہ کار بھی بنایا جاتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تانیثی تنقید میں احتجاجی اظہاریت کی کیا اہمیت ہے؟ احتجاجی اور مزاحمتی ادب کی اہمیت سے انکار تو ممکن نہیں لیکن اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ محض احتجاجی تحریروں سے عورت کی پوری شخصیت کا اثبات ممکن نہیں۔ احتجاج کی لے کبھی اتنی تیز بھی ہو جاتی ہے کہ اس میں جوش و تندی سے آگے بڑھ کر تلخی اور جھلاہٹ کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسی شاعری اور دوسری اصناف ادب کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ افراط و تفریط سے ہر رجحان نعرہ بن سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں جب کم از کم نظریاتی طور پر عورت کی آزادی اور مساوات کے تصور کو رد کرنا آسان نہیں رہا، خواتین کے احتجاج کی لے بھی مدھم ہو تو زیادہ پر اثر ہو سکتی ہے۔ اور احتجاج کا رخ بھی صحیح سمتوں میں موڑنا ضروری ہو گیا ہے۔ عورت کے اثبات ذات اور اظہار ذات کا معاملہ مرد عورت کے درمیان دار و گیر کا معاملہ نہیں ہے۔ عورت تیر و تفنگ لے کر مرد سے بر سرپیکار ہو بھی جائے تو نہ وہ اپنی نوعی آزادی حاصل کر سکتی ہے نہ اپنے فطری و بشری تقاضوں کی تکمیل کر سکتی ہے۔ یہ معاملہ خود شناسی اور خودگری کا ہے، جس کے لئے صالح لہجے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ میدان کارزار کا نہیں ہے۔ نہ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھایا جا سکتا ہے نہ بستر کو میدانِ کارزار بنانے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ عورت کا انفرادی اور نوعی اثبات وہی ادب کر سکتا ہے جو اس کی فردیت کی مکمل رینج پر اصرار ہو۔ نہ صرف یہ کہ احتجاج اور طنز و تشنیع کی عمر کم ہوتی ہے، اس کا

دائرہ اثر بھی محدود ہوتا ہے۔ اس سے متوجہ تو کیا جا سکتا ہے، متاثر نہیں۔ لہجے کی ایسی جھلاہٹ جو کبھی کبھی گالم گلوج کی سطح پر اتر آئے، ادب نہیں ہو سکتی، احتجاج کا مقصد مردوں کو چڑانا نہیں بلکہ سماج کو جھنجھوڑنا ہے۔ مردوں کو عورت کی فردیت اور موضوعیت کا احساس دلانا ہے۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ عورت کا جھگڑا فرداً فرداً مردوں سے نہیں بلکہ معاشرے اور پدرانہ سماج کے ان رویوں، اقدار اور نظریات سے ہے جنہوں نے عورت کو محکوم بنا دیا اور مجبور ثابت کر دیا ہے۔ جس کے لئے منجملہ اور اجبار کے مرد کی حفاظت کو بھی ضروری قرار دے دیا ہے۔ یہ رویے صرف مردوں ہی کے نہیں عورتوں کی سائیکی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں، جن کی حدود انفرادی طور پر مردوں سے بہت آگے سماجی اداروں، سماجی و مذہبی، سیاسی اور اقتصادی نظاموں تک پھیلی ہوئی ہیں ان اداروں کی جکڑ بندیوں میں صرف مردوں کے ہی نہیں عورتوں کے ذہن بھی اسیر ہیں۔ یہ ادارے اپنی بعض صورتوں میں زیادہ زور پکڑ رہے ہیں اور دنیا کے تمام سماجوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تجارتیت کے فروغ نے بھی عورت کا بہت استحصال کیا ہے کہ منڈی معیشت کا تمام کاروبار اشتہاروں پر چلتا ہے جن کا الیکٹرونک میڈیا پر پورا کنٹرول ہے، جو عورتوں کو لذت کوشی کی شئے بنانے میں بے روک ٹوک مصروف ہیں۔

کھلے ذہن سے سوچا جائے تو مرد اور عورت کا رشتہ تو دلکشی اور آسودگی کا سرچشمہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حریف نہیں، حلیف ہیں ایک دوسرے کے لئے صرف طبعی اور جنسی سطح پر ہی نہیں بلکہ جذباتی، نفسیاتی اور اقتصادی سطح پر بھی لازم و ملزوم ہیں۔ مرد و عورت کے رشتے کی حدود اس کے درد و نشاط تک پھیلی ہوئی ہیں، جس میں عشق، محبت، ہم آہنگی، ہم دردی، دوستداری، ہم خیالی، اختلافات و اتفاقات، بحث و مباحث، وصل و فراق کی لذتیں، الیے طربیے سب ہی شامل ہیں۔ اور جس میں افزائش نسل کا فطری جذبہ بھی اپنی تمام نیرنگیوں اور نفسیاتی تقاضوں کے ساتھ موجود ہے۔ مرد عورت صرف میاں بیوی ہی نہیں دوست اور رفیق یا رفیق کار بھی ہو سکتے ہیں۔ کہنہ بنیادوں کو ہلانے کے لئے سرعام نعرے لگانے کی ضرورت نہیں یہ کام ادب کا نہیں سماجی اداروں کا ہے۔ ادب کشف و ریاض چاہتا ہے۔ عورت کو اپنی تخلیقات، اپنے

تصورات اور اپنے فکر و عمل کے ذریعے اس مسخ شدہ امیج کا سدِ باب کرنا ہے جو عورتوں کو تفویض کر دی گئی ہے۔ جس نے مرد عورت کے فطری رشتے کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ (یہاں میں معذرت کے ساتھ اپنی نظم "میں وہ تصویر نہیں" (مطبوعہ) آتش سیال ۱۹۷۲ء) کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتی ہوں۔ اس نظم میں عورت کو اس کی شخصیت کی گوناگوں جہتوں، اس کی زندگی کے تمام درد و نشاط، امکان و وجود، فکر و تخیل، عشق و عمل، افکار کے شعلوں کے بھڑک اٹھنے کے عیش، اور حرف تمنا کے فن شعر میں ڈھل جانے کی کیفیت کے وسیع امکانات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور مرد اساس سماج میں اس کی حقیقی حیثیت کی نشان دہی کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک بیدار اور آزاد عورت کی تصویر ہے، جو امکانات کی دنیا میں موجود ہے۔ فوکس عورت کی ذات کے ہمہ جہت تجربے اور اس کے وجود کے اثبات پر ہے)۔ ابتداء اس نظم کی بھی احتجاجی لے سے ہوتی ہے۔

تانیثی نقادوں کو بھی، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ادب کا وہ مقصد نہیں جو دوسرے تانیثی اداروں یا تنظیموں کا ہے۔ ادب کا تا اور لے دوڑی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ادب ذہنی تربیت اور جذبوں کی تہذیب کرتا ہے نعرے نہیں لگاتا۔ تیر و تفنگ لے کر میدان کارزار میں نہیں اترتا۔ عملی میدان کے طریقہ ہائے کار بھی دوسرے ہوتے ہیں، جو اپنے سیاق و سباق میں زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔

یہ راقم الحروف کا اپنا تجربہ بھی ہے۔ Status of women کی جو ملک گیر پیمانے پر پہلی کانفرنس بمبئی کی Women.s University میں ہوئی تھی (بین الاقوامی عورتوں کے سال کے دوران) اس میں مختلف شعبوں کے لحاظ سے نو سیکشن شامل تھے۔ (یہ خاکسار اس کی یو جی سی کی کمیٹی کے Founder member اور اس کے تعلیمات کے شعبے میں شامل اور ادب کے شعبے کی سربراہ تھی) یہاں آٹھ دن تک ملک کے گوشے گوشے سے آئی ہوئی دانشور پروفیشنل اور Activist خواتین نے عورتوں کی آزادی اور ان کے مقام سے متعلق بحث و مباحثے کئے مقالے پڑھے اور عورتوں کا مقام بلند کرنے اور ان کی صحیح اور معتبر امیج قائم کرنے نیز انھیں سیاسی اور سماجی حقوق دلانے کے سلسلے میں مشترکہ طور پر بھی اور شعبہ جاتی لحاظ سے بھی غور و خوض کیا اور ہزاروں عورتوں اور سینکڑوں مندوبین نے اتفاق رائے سے اس مسئلے کے

حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ادب کا منصب بھی اس میں شامل تھا اور Well Defined تھا اور ادب اور دوسرے اقتصادی، قانونی اور سماجی شعبہ جات کے مقاصد میں مختلف و متنوع طریقہ ہائے کار کی سفارش کی گئی تھی۔

اس جملہ معترضہ کا مقصد محض اس طرف توجہ مبذول کرانا تھا کہ ادب کا منصب دوسرے شعبوں سے مختلف اور ادارہ جاتی پروگراموں سے منفرد ہے۔ اس کا منصب اگرچہ دیر آمیز لیکن دیرپا ہوتا ہے۔

تخلیق کی طرح تنقید میں بھی تانیثی ادب میں معتبر، مستند اور مستقل اقدار اور تصورات کی دریافت اور اعلیٰ ادب کی نشان دہی کرنا ضروری ہے۔ تاکہ تانیثی تنقید اپنا وقار اور اعتبار قائم کر سکے بلکہ عورت بھی اپنے زمانی اور مکانی تناظر اور زندگی کے مکمل سیاق و سباق میں اپنی جگہ پہچان سکے۔ اس کی شخصیت محض جنگ و جدال میں سکڑ سمٹ کر نہ رہ جائے بلکہ وہ زندگی کی وسعتوں میں پھیل کر کائنات کی رمز شناسی کر سکے اور کشمکشِ زیست میں شامل ہو کر اپنے وجود کا راز پا سکے اور آزادی و بیباکی سے زندگی کرنے کا منصب اپنا سکے کہ عورت کی۔

" یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون "

؎ ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون "میر انیس کی شاعری میں نفسیاتی دروں بینی" مطبوعہ "تلاش بصیرت" ..... ۱۹۹۲ء نصرت پبلشرز لکھنؤ۔

رات کا نواگر

عرفان احمد عرفی

مضمون

ٹیک رات کا ذکر ہے کہ میں اپنی بے خوابی کے سرہانے رتجگا روشن کیے کاغذ پر قلم سے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کا سوچ رہا تھا۔ کچھ بھی لکھنے سے پیشتر میں اس کی شباہت ذہن میں لانا چاہتا تھا لیکن میرے حافظے کی سلیٹ بالکل صاف تھی' کوئی ہیولا' کوئی پیکر' کوئی ہیئت سوچ کی دھند میں نمایاں نہ ہو رہی تھی۔ پہلا لفظ گرفت میں آ ہی نہیں رہا تھا اور ابھی رات کا پہلا پہر تھا! جو دبے پاؤں کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے سرہانے روشن رتجگا بجھا دیا اور اس خیال سے حرف در حرف بہت سے چراغ سوچ کی بالکنی پر روشن کر دیے۔ ممکن ہے کسی لفظ کی شکل بن جائے۔ لیکن یہ سب جبھی ممکن تھا اگر اس کی صورت ذہن میں واضح ہو جاتی۔

جس کا کوئی خاکہ ہی نہ ہو اس پر کوئی کیا خاکہ آزمائی کرے اور پھر اگر اس کی کوئی شکل ہے بھی تو وہ بھی کتنی عام سی ہے' یاد رکھنے والی کوئی خاص بات ہے ہی نہیں۔ عام سی آؤٹ لک' (Out look) عام سا لباس' کوئی انداز نہیں' کوئی ترت نہیں کوئی بھاؤ نہیں۔ خاکہ تو لکھا جاتا ہے پرسنلٹی کا، ورسٹائل سی پرسنیلٹی رنگین سی شخصیت، رنگ بھی وہ جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں، تضادات اور امکانات سے بھری شخصیت اندر سے کچھ، یا کم از کم کچھ اس طرح کی قابل توجہ شخصیت جو اپنے ہمراہ اپنا ایریا (Ar-ea) علاقہ لئے پھرتی ہو اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ بہت سی شامیں گزاری ہوں، راتوں کا رازدان ہو، اس سے وابستہ کچھ مضحکہ خیز باتیں ہوں، اس کی زندگی کے کچھ پوشیدہ پہلوؤں سے آپ پردہ اٹھا سکتے ہوں اور کچھ پر گرا سکتے ہوں۔ آپکے سامنے اس کی ایک آنکھ بند ہو......وہ خود ہی کوئی مسٹری ہو، کوئی سکینڈل، کوئی رومانس، کوئی واردات، کچھ تو اس سے منسوب ہو، وہ رنگے ہاتھوں کبھی پکڑا گیا ہو، اسے کچھ پینے پلانے، سلگنے سلگانے کی ہی عادت ہو... اب جسے خود اپنے شناختی نشان کے خانے کو پر کرتے ہوئے پہروں آئینہ ٹٹولنا پڑتا ہو۔ کوئی دوسرا اس کے بارے میں کیا دیکھ سکتا ہے، جسکا کوئی برتھ مارک نہ ہو، (identity mark) کوئی برتھ مارک نہ ہو، اس کی آپ کسی سے کیا پہچان کرا سکیں گے۔ مجھے تو اس

سے اپنی پہلی ملاقات بھی یاد نہیں۔ کم از کم وہی اتنی ڈرامائی ہوتی کہ یادگار بن جاتی مجھے تو وہ موسم بھی یاد نہیں جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا یا پھر میں نے ہی وہ موسم یاد رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی...... ابھی رات کا پہلا پہر تھا اور میں پہلے لفظ کی تلاش میں تھا اور جب تلاش تھک جاتی ہے تو انتظار سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارا نہیں۔ معاً مجھے محسوس ہوا جیسے پہر در پہر چلتی ہوئی رات ٹھہر گئی ہے اور میرے کانوں میں سرگوشی کر رہی ہے۔ کہ میں جسے موجود میں ڈھنڈ رہا ہوں وہ تو ایجپائر ہو رہا ہے۔ تحلیل کے عمل میں ہے۔ جسمانی سطح پر معدوم ہو رہا ہے تو گویا وہ روحانی سطح پر زندگی کر رہا ہے تو کیا وہ صوفی قسم کی کوئی چیز ہے۔ نہیں۔ ایسا بھی نہیں، صوفی تو پھر Spiritual existance پر یقین رکھتے ہیں وہ تو جسم کے موسم بھی اس پار کے موسم میں نہیں کرتا۔ اس کا کوئی برتھ مارک نہیں تو وہ کسی طرح کا ڈیتھ مارک بھی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ جسم کا ساتھ چھوڑ دینے کے بعد بھی اگر کچھ ہے تو کب تک ہے؟۔ وہ تو یاد کی صورت بھی زندہ رہنے کا متمنی نہیں۔ وہ تو بھلا دینے والی اور بھول جانے والی رت کا جھونکا ہے۔ ہیت، شباہت، جسم، پرسنیلٹی، شکل، لباس سے ماورا ہے۔

کسی کو کیا علم ہے کہ میں کس مدار میں ہوں
میں ایک بے انت فاصلہ ہوں، کسے خبر ہے

وہ رات کا ذکر کیوں کرتا ہے۔؟ اس لئے کہ رات ہی اس کا پتہ بتاتی ہے۔ اس کا وجود اگر کوئی ہے تو رات ہی میں ٹٹولا جا سکتا ہے۔

اندھیری رات سے طے ہو گئے پیمان میرے

رات اسے اس لئے ہانٹ کرتی ہے کہ وہ جانتا ہے دراصل جو ہے وہ رات ہی ہے، یہ تو درمیان کہیں سورج کا چراغ روشن ہے، اور جہاں جہاں تک روشنی کی رسائی ہے وضاحتیں ہیں، زاویے ہیں (Dimentions) ہیں، حدیں ہیں، قد ہیں...... روشنی کی زد میں جو نہیں ہے، دراصل وہ انہی سناٹوں اور تیرگیوں کا باسی ہے۔ اور وہی سناٹا، وہی رات اس کے اندر ہے۔ اسے کائنات کے ایسے ہی (Codewords) کے معنی ڈھونڈنے ہیں۔ اسے رات بھی خالص رات کی صورت میں پسند ہے۔ رات کی (Purity) اسی میں ہے کہ اس میں کوئی چاند، کوئی کرن، کوئی ستارا حتیٰ کہ خواب بھی نہ ہو۔ وہ رات کے ختم ہونے پر رنجیدہ ہے، اسے صبح کی تلاش نہیں۔ صبح شکلیں اور زاویے واضح کرتی ہے۔ جب کہ وہ بے انت فاصلہ ہے جو دراصل رات ہے رات ہی کا راج ہے۔ تیرگی کے اسٹیج پر روشنی کا رقص ہے۔ اسٹیج کے سامنے تھیٹر میں کون ہے اور آف دی اسٹیج کیا ہے؟ بس وہ یہی معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن صبح ہونے لگتی ہے۔ اسی لئے وہ سحر کو رات کی موت کہتا

ہے۔ اسے رات کے مرنے کا غم ہے۔ سحر کو وہ شب کی بے ردائی کہتا ہے۔ اسے غروب ہوتا سورج پسند ہے جو اس کے سائے کو بھی ساتھ لے ڈوبتا ہے۔ اور پھر ہر طرف وہی سایہ پھیل جاتا ہے۔ وہ رات کے سائے سے اپنا سایہ شیئر کرتا ہے اور یوں مائیکرو سے میکرو کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ وہ صوفی بھی نہیں کہ صوفی کو تو روشنی کی تلاش ہوتی ہے وہ تو رات کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے۔ اسے تو سب سے روشن تارے میں بھی تاریکی نظر آتی ہے۔

عجیب بے رنگ وھند مجھ میں ہے ایستادہ
میں وسط شب میں کہیں کھڑا ہوں کسے خبر ہے
فلک کا آخری بے نور زینہ
چراغ خاکداں سے ڈھونڈ لوں گا
کسی آزمائش و امتحاں میں پڑا رہا
میں سیاہی شب خاکداں میں پڑا رہا
ڈھونڈتا ہے کوئی مجھ کو چاند کی مشعل لئے
میں چھپا ہوں رات کے بے نور پردوں میں کہیں

گویا رات ہی اس کا جسم ہے اور رات ہی اس کا وجود۔ رات کے بدلتے پہر دراصل اس کے بدلتے ہیں۔ اس نے اپنے اندر کی رات اور باہر کی رات کو (Synchronize) کر لیا ہے۔

یا دوسرے لفظوں میں باہر کی اس ایک ہر طرف پھیلی رات نے اس کے اندر جھانک لیا ہے۔ جیسے اس وقت رات کھڑکی سے میرے کمرے میں جھانک رہی تھی۔ اندر کے بیچ اور باہر کے بیچ میں (Harmony) تب بنتی ہے جب درمیان میں حائل جسم اور جبلتوں کی دیواریں گرا دی جائیں۔ پھر اندر اور باہر کا سناٹا اور باہر کی حیرت ایک ہو جاتی ہے...... اور "میں" "مرا جسم" "میرے ہاتھ" "میرے پاؤں" (Broad Perspective) میں سامنے آتے ہیں۔

بدن کو "لا" کیا تھا فرض میں نے
جنوں میں کیا کیا تھا فرض میں نے
جو میرے اور افق کے درمیاں تھا
اسے پردہ کیا تھا فرض میں نے
مرے شش جہات میں کوئی آخری حد نہ تھی
میں وسیع تھا، سر لامکاں میں پڑا رہا
پڑاؤ کرنے کو لامکاں رکا تھا میں

رُکا نہ جس جگہ کوئی وہاں رکا تھا میں
کسی کو علم ہی کیا تھا، مری شعمِ مسافت
زمیں جس مقطے پر ختم ہوتی تھی، وہیں تھی
جمے ہوئے تھے مرے قدم آسماں کے سر پر
زمیں کا بوجھ میرے کندھے پہ آ گیا تھا
بازوؤں کے دائرے میں ایک پہاڑی کا وجود
اور دھرا ہے آنکھ کے کونے میں بحرِ بیکراں

جسم کے رد و اثبات کے لئے جو سب سے پہلا حربہ اس نے استعمال کیا، وہ جسم کی بے نقابی ہے جو نہ صرف روحانی، نفسیاتی اور جمالیاتی سطح پر (Self exposure) کے زمرے میں آتا ہے بلکہ جنسی سطح پر بھی۔ اس نے خود اپنا آپ (-Sexu ally expose) کیا ہے۔ اس کے بدن سے پسینہ بعد میں، لذت مٹھاس اور خوشبو پہلے پھوٹی۔ عورت، انجیر اور شراب کے خواب سے اس کی رات بہت پہلے آشنا ہو گئی تھی۔ جو لوگ یہ خواب دیکھ لیتے ہیں، پھر رات کی تاریکی اور اس کی ناشناسائی انہیں ڈراتی نہیں بلکہ ان کی مارل سپورٹ بن جاتی ہے۔ جسم کو بے نقاب کرنے کے لئے اس نے خود سے شدید جسمانی جنگ کی۔

دروازۂ وحشت سے گزرے گا بدن میرا
سالم نہیں رہ سکتا بکھرے گا بدن میرا

کہاں ٹوٹے میری طناب جسم کے حوصلے
جو لگا تھا خیمہ وجود کا وہ کہاں گیا

مجھے ٹھکانہ نہیں ملا تھا کسی طبق پر
میں تھک کے خاکی بدن کے ٹیلے پہ آ گیا تھا

کوئی جنگ ہے جو نہیں بدن سے لڑی گئی
کوئی معرکہ ہے جو مجھ سے سر نہیں ہو رہا

میرے چہرے پر مقرر ہوگا باہر سے بدن
اور مرا یہ نفس اندر سے چبائے گا مجھے

کبھی میں جذب کے عالم میں ہو جاؤں برہنہ
لبادہ پھر مرے وجدان کا اترے کسی دن

اب اس جسمانی تبرد آزمائی میں بھی وہ اتنا (Monogamist) ہے کہ اس نے صرف اپنے بدن کی رات ہی سے (Commitment) کا ذکر کیا ہے۔

پہلے آنکھ کی شہ رگ کاٹی اور اس فعل کے پیچھے
اک تاریک سرنگ سے میں نے اپنی ذات گزاری

جسم کے تاریک لشکر سے بچائے گا مجھے
اک ستارہ رات کے شر سے بچائے گا مجھے

کوئی دیکھتا مرے خال و خد سے برہنگی
شب یک نفس میں بڑا حسین مرا جسم تھا

سیاہ رات ہو ہر شے کو نیند آئی ہو
مرے وجود کی تقریب رونمائی ہو

اندھیری رات نے پوچھا مرے بدن کا پتہ
نہیں تھا علم مجھے ، پھر بھی کہہ دیا معلوم

کہاں یہ جسم ، کہاں الف لیل کا رستہ
میں تھک گیا ہوں سفر ایک رات کا کر کے

اندھیری شب میں تغیر پذیر تھی ہر شے
بس ایک جسم ہی تھا جس پہ انحصار کیا

اگر آپ نے جنس میں شدت کو (Experience) کیا ہے تو حس لطیف میں بھی شدت در آتی ہے، پھر اپ کو نیچر کی (Choreography) میں بھی (Agression) اپیل کرتی ہے۔

بیٹھ گیا تھا چاند زمیں کے پاؤں میں
اوج خلا سے ناطہ توڑے پھرتا تھا
دور کرے پر شور مچا تھا آندھی کا
بادل کان میں انگلی ڈالے پھرتا تھا

سرخ بگولے پیچھے پیچھے پھرتے تھے
قطبی تارا آگے آگے پھرتا تھا

جلوسِ ابر ماتم کر رہا تھا اور سر پہ
ستارے تعزیہ شب کا اٹھائے آرہے تھے

خود کو جمالیاتی اور جنسی سطح پر بے نقاب کرنے کے بعد وہ جسم سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ گویا جسم کی موت کے لمحے سے گزرنا چاہتا ہے۔ سورج کی رسائی سے اس پار کی رات، موسم کے بعد موسم کیا ہے۔ جلد از جلد جاننا چاہتا ہے۔

قریب تر ہے وہ ساعت کہ میں بھی دیکھوں گا
یہ جسم و جاں کے حصے جدا جدا کر کے
میں روک دوں گا کسی روز دھڑکنیں دل کی
کروں گا مر کے کبھی راز موت کا معلوم
کسی دن عنصرِ خاکی سے نکلوں گا دبے پاؤں
کہ میں نے بھی ارادہ موت کا رکھا ہوا ہے
پریشاں ہوں میں تن خاکداں چھوڑنے کیلئے
مگر روح کو کوئی غیبی اشارہ نہیں مل رہا
سانس کی چھت بھی کسی ثانیے گر سکتی ہے
دل کی ہر اینٹ کو عجلت میں رکھا ہے میں نے
مجھے بھی موت کا یہ تجربہ کرنا تھا اک دن
خوشی سے جان دیدی تھی کہ جان اولیں تھی

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا وہ اپنے Commitment میں بہت Monogamist ہے۔ آپ دیکھیں کہ وہ مرنا بھی رات ہی کو چاہتا ہے۔ رات اور رات کی تاریکی کے حوالے سے اس کی سرگرمیاں دیدنی ہیں۔

قطرہ ہوں سرِ آب سے نکلوں گا کسی رات
میں کالبدِ خواب سے نکلوں گا کسی رات
جسم و خلا میں سانس اور تارے غائب تھے
شام اور موت کے سائے میں تاریکی تھی
ایک سیاہ بشارت والے ڈر کے ساتھ گزاری
میں نے پہاڑ کے اک درے میں ساری رات گزاری

میں کاٹ دوں گا اندھیرے میں اس شبیہہ کا ہاتھ
کسی طلسم کی شمشیر خواب کو دوں گا
اس اعتکافِ تمنا کی سرد رات کے بعد
میں جل مروں جو کبھی آگ تک جلائی ہو
سکوت شب تھا، بنی تھیں فرشِ سفید لہریں
میں سطحِ دریا پہ اپنا بستر لگا رہا تھا
کسی بحرِ خواب کی سطح پر مجھے تیرنا ہے تمام شب
مری آنکھ کشتیِ جسم ہے، مرا بادباں مرا ہاتھ ہے

شاید وہ رات کا آخری پہر تھا کہ اس کے وجود نے آخری بار پہلو بدلا تھا، دور آسمان پر نمودار ہوتا صبح کا ستارہ مجھے اس کی موت کا پیغام دیتا محسوس ہوا۔ روشنی میرے کاغذ پر بہہ رہی تھی، رات میرے کاغذ سے سرک رہی تھی اور وہ مجھ سے بچھڑ رہا تھا۔ یہ کائنات جو دراصل روشنی کی زد میں ایک وضاحت ہے، اس رات کا ایک ذکر ہے جو روشنی کے مدار کے اس پار ہے۔ اور یہ بھی، اسی رات کے نواگر رفیق سندیلوی کی ایک بات ہے جو آج میں نے آپ سے کہی ہے۔

کوئی مکالمہ ایجاد کیوں نہیں کرتے (ساقی بہ نام ندیم)

پیارے قاسمی صاحب

ساقی فاروقی اور احمد ندیم قاسمی کے خطوط بہت عرصہ پہلے ادارہ کو ریحان صدیقی کے ذریعہ حاصل ہوئے تھے۔ یہ خطوط ریحان صدیقی کو خود ساقی فاروقی نے بھیجے۔ بہر حال اب یہ خطوط قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ...... ادارہ

احمد فراز کے سلسلے میں فون پر اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا ہوں۔ اب لکھ کر دو چار جملوں میں اپنا رویہ واضح کر رہا ہوں۔ آپ نے لکھا "...... اس روز آپ نے آتے ہی فراز کو ایک گالی نکادی" آتے ہی نہیں نکائی تھی بلکہ دوپہر میں لندن کے ایک شاعر نے فون پر بتایا تھا کہ میرے "چونی" والے (۱) والے فقرے کو شہر میں اس نے یوں پھیلایا تھا گویا وہ فقرہ میں نے فراز پر نہیں قاسمی پر کسا تھا اور شام کو سفیر صاحب کے گھر پر اسے دیکھتے ہی میرا خون کھول گیا تھا کہ فاروقی ہوں یعنی کوھائی پٹھان نہیں عزلی پٹھان ہوں۔ آپ نے لکھا "جس طرح آپ میری شاعری کے دس فیصد کو قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں اسی طرح تھوڑی "رعایت" احمد فراز کو بھی دے دیا کیجئے" آپ نے اپنے نام کے ساتھ اس ٹٹ پونجیے فراز کا نام لکھ کر مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں ہرگز ہرگز ادب میں "رعایت" کا قائل نہیں ہوں۔ چاہے غالب ہوں چاہے قاسمی، میں سب کے احساس وخیال والفاظ کو اپنے احساس جمال کی میزان پر تولتا ہوں۔ یہ ترازو "بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے" کو اردو کا ذلیل ترین مصرعہ سمجھتا ہے۔ ہٹ دھرمی نہیں کرتا۔ میر سے لے کر جوش تک کے دوانین میں اچھے شعروں کا کال اور لوبڑ کھابڑ کی بہتات ہے۔ میں نے اردو کے تمام نقادوں سے درگزر کیا۔ ان دونوں کا سارا کلام خود کھنگالا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی سنجیدہ قاری، اپنی تمام فراخ دلی اور کشادہ ذہنی کے باوجود، ان کے دس فیصد سے زیادہ کلام کو پسند کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو گا تو میں اس کے علم اور ذوقِ شعری کو شک اور غصے کی نظر سے دیکھوں گا۔

اگر اسی پیمانے سے جانچا جائے تو آپ کی دس فیصد شاعری کو پسند کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اردو کے اہم ترین میر اور "Not so important" جوش دونوں کی انجمن میں شامل ہیں کہ ان دونوں کا دس فیصد کلام ہی مجھے پسند ہے۔ مجھے آپ ۵۶ء یا ۵۷ء سے امروز، لیل و نہار اور فنون میں چھاپ رہے ہیں۔ جس طرح میں آپ کی محبت میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہوں اسی طرح تقریباً چالیس برس سے آپ میری صاف گوئی کی قدر کرتے رہے ہیں۔ میں آپ کے سامنے وہی کہتا ہوں جو آپ کے غیاب میں۔ مگر شاید آپ بھول گئے کہ ۵ سال پہلے رشید ملک اور محمد کاظم کے سامنے خود آپ نے مجھے

۱۔ ہوا یوں کہ لندن کے ایک مشاعرے میں منتظمین نے مجھے مدعو کیا اور سو (۱۰۰) پونڈ کی پیشکش کی۔ میں نے دو سو (۲۰۰) پونڈ پر اصرار کیا اور نہیں گیا۔ دوسرے دن ایک محفل میں، قاسمی صاحب کے سامنے فراز نے مجھ پر فقرہ کسا کہ "ساقی، تم مشاعرے میں چونی والی سیٹوں کے سامعین کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے"۔ تس پر میں نے جواب دیا کہ "فراز تمہاری شاعری سننے کے لئے آدمی چونی سے زیادہ کیسے خرچ کر سکتا ہے"۔ ایک زبردست قہقہہ پڑا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ (ساقی)

آجائیے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک خاص رومانی انداز میں اسے گاہے گاہے دو مصرعوں کو کلاسیکی رنگ میں کہنے کا ڈھنگ آتا ہے مگر ۴۰ سال پہلے بھی "پھول کتابوں میں ملیں" اور "مفت کی شرابیں مفت کی شرابوں میں ملیں" کہہ رہا تھا اور آج بھی اس بات پر فخر کر رہا ہے کہ "ماؤں نے بیٹوں کے نام اس کے نام پر رکھ دیئے ہیں" یہ شاعری کی کون سی سطح ہے؟ ۴۰ برس میں اس نے ایک انچ بھی Grow کر کے نہیں دکھایا۔ ساری عمر قاسمی کے خیال اور فیض کے انداز کی نقالی کرتا رہا ہے اور تو اور، موضوعات اور الفاظ میں ۵۰ سال بعد بھی ایک طرح سے ساحر لدھیانوی کو Re-write کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ اپنی محبت اور شفقت میں گم عام کر رہے ہیں کہ "پیارے ساقی جی، اس کی ۵ فیصد شاعری کو "رعایتی" نمبر دے دیں" مشاعرے کے نیم جاہل سامعین کو توجہ قوف بنا کر داد بٹوری جا سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے حکومت کے خلاف ڈائرکٹ نظمیں لکھ کر حبیب جالب مرحوم دھوم مچایا کرتا تھا یا ہندوستان کے بے کل اتنا ہی یا بشیر بدر مشاعرے لوٹتے رہتے ہیں۔ مگر آپ نے تو ساٹھ سال کا ادبی زمانہ دیکھا ہے۔ یاد کیجئے اختر شیرانی اور مجاز کی پاپولیریٹی کو۔ مگر آج ادب میں ان بیچاروں کا مقام کیا ہے؟ کھلا کہ سامعین کے مقابلے میں قارئین زیادہ معتبر ہوتے ہیں اور انہیں صرف رومانی تے سے خوش نہیں کیا جا سکتا۔ فراز کا ذہن "۱۸ سالہ میٹھے برس" میں اٹکا ہوا ہے۔ کالج میں اس نے درسی کتابیں تو امتحان پاس کرنے کے لئے پڑھ لی ہوں گی مگر اس سے گفتگو کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے ۳۵ برس میں اس نے ایک کتاب بھی (اور "ایک" کا مطلب "ایک ہی ہے") نہیں پڑھی۔ نہ اردو نہ پشتو نہ انگریزی نہ نثر نہ نظم۔ اگر کسی کا کوئی شعر سناتا ہے تو وہ بھی اس نے محفلوں اور مشاعروں میں سنا ہے۔ کتابوں میں پڑھا نہیں۔ سو، پلیز پلیز پلیز، میری حالت پر رحم کیجئے۔ فراز کی سفارش مت کیجئے ورنہ آپ کے حکم کی تعمیل میں کہیں لکھ دوں گا کہ "ہاں فراز کی ۵ فیصد شاعری اچھی ہے" اور لکھنے کے بعد خودکشی کرا لوں گا کہ رشید ملک سے لے کر محمد کاظم تک، فتح ملک سے لے کر عطاالحق قاسمی تک، خالد احمد سے لے کر منصورہ احمد تک اور اختر حسین جعفری مرحوم سے لے کر اطہر نفیس مرحوم تک مجھ پر لعنت بھیجیں گے، نفریں کریں گے۔ تھڑی تھڑی کریں گے۔

☆☆☆☆☆

بارے "آموں" کا کچھ بیاں ہو جائے :- "حاجی بھائی پانی والا" میری پہلی نظم ہے جسے ۴۰ سال میں آپ سمیت دو مدیروں نے (افسوس دونوں پاکستانی ہیں) چھاپنے سے انکار کر دیا ہے۔ صہبا (۲) "صہبا لکھنوی، مدیر افکار۔ کراچی (ادارہ)" نے یہ کہہ کر کہ "یہ ایک عظیم نظم ہے مگر خطرناک نظم ہے، میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور کچہریوں میں دوڑنے کی طاقت مجھ میں نہیں، قاسمی صاحب کو بھجوا ان پر حکومت ہاتھ نہیں دھر سکتی" قاسمی صاحب نے یہ کہہ کر انکار کیا "آپ اتنے پیارے شاعر ہیں اتنی پیاری پیاری نظمیں غزلیں لکھتے ہیں مگر بعض اوقات اتنی عجیب نظمیں کیوں لکھ دیتے ہیں ...... فیل کے "پا" تو سب نے دیکھے ہیں "فا" کس نے دیکھے ہونگے، پھر اتنے غور سے کون دیکھے گا .... پھر

---

۲) صہبا لکھنوی۔ مدیر افکار۔ کراچی (ادارہ)

حالی کے دونوں "فاؤں" کو "مفاعلین" قرار دیکر نا قابل فہم زیادتی بھی کر دی"۔ ان تمام اعتراضوں کا جواب پہلے ہی اپنے خط میں لکھ چکا ہوں (میں نے احتیاطاً نظم کیساتھ ہی ان سوالوں یا اعتراضوں کے جوابات پہلے ہی لکھ بھیجے تھے جو آپنے بعد میں کئے)۔

میں نے آج تک اپنی کسی نظم کی تشریح یا مدافعت نہیں کی ہے مگر "اتنے غور سے کون دیکھے گا" اتنا خوبصورت اور دلچسپ جملہ ہے کہ پڑھ کر گھنٹوں لطف لیتا رہا اور مسکراتا رہا یہاں تک کہ بیوی کا یہ طعنہ بھی سننا پڑا "اچھا، تم جیسا سخت جان دل آزار مسکرانا بھی جانتا ہے"۔ انہیں آپ کا جملہ سنایا تو وہ بھی دیر تک مسکراتی رہیں۔

میں "پیاری پیاری نظمیں غزلیں" کہنے والا شاعر ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ اچھے یا اہم یا بڑے (جو میں ہر گز نہیں ہوں مگر ہونے کی تمنا دل میں رکھتا ہوں) شاعر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ زبان اور بیان اور موضوع کو Stretch کرتا رہے۔ سرحدوں کی اس کھینچ تان ہی سے آنے والوں کو حوصلہ ہوگا کہ دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس پر طبع آزمائی نہیں کی جاسکتی اور اردو شاعری بھی ایسی بالغ شاعری ہے جو صرف تیسری دنیا کی شاعری نہیں ہے بلکہ فرانسیسی شاعری اطالوی شاعری سپانوی شاعری اور امریکی شاعری وغیرہ کے برابر رکھ کر پرکھی جاسکتی ہے کہ یہ صرف "رومانی بیانوی" ملغوبا نہیں ہے۔ ہمارے یہاں بھی میرؔ، "عطار کے لونڈے" سے دوا لیتے رہے ہیں۔ نظیرؔ "سویاں ہیں کہ جھانٹیں ہیں" لکھتے رہے ہیں۔ سہیلیوں سے "چپٹی" کھلواتے رہے ہیں سوداؔ اپنے معاصر ضاحکؔ سے خفا ہو کر اسے اس کی ماں کی "پشمین" سے پیدا کرواتے ہیں۔ "پہنچی پشمین سے ہو نطفے کی حلت جس تک" (۳)

جوشؔ "حیض کی بوند کو لعل یمنی کہتے ہیں" کہہ کے جاچکے ہیں۔ پھر آپ کے دوستوں میں منٹو، عصمت اور میرا جی نے کیا کیا کہہ کر اور کر کے نہیں دکھایا۔ جنس یا جنسی اعضا کے بیان سے ان شاعروں اور افسانہ نگاروں کی عظمت کم نہیں ہوئی۔ میرؔ، نظیرؔ، سوداؔ اور جوشؔ کے جو مصرعے میں نے لکھ دیئے ہیں یہ بڑے مصرعے نہیں ہیں مگر منٹو، عصمت اور میرا جی کی نظمیں اور افسانے اس لئے اہم اور ایک طرح سے عظیم ہیں کہ ان کا سفاک تجربہ صد فیصد تخلیقی ہے۔ (یہ ہماری عجب بد نصیبی ہے کہ منٹو، عصمت اور میرا جی کو "جنسی فنکار" کہہ کر ایک طرح سے انکی تحکیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ اگر میں دنیا کی زبانوں سے حوالے دینا شروع کروں تو یہ خط دس ہزار صفحات کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔ کاش اردو میں لارنس کی "لیڈی چیٹر لیز لور" جیسی کہانی (ناول) لکھی جاسکے جس میں دو ذاتوں کی مکمل آشنائی کے لئے لارنس نے عورت کے دونوں اطراف سے استفادہ کیا ہے۔ ریاح تک خارج کروائی ہے اور اس آواز پر عاشق سے محبت بھرے جملے بھی کہلوائے ہیں۔ Ckoig Raine نے جو جدید انگریزی شاعری کے نہایت اہم شاعر ہیں۔ اتنے کہ Faber + Faber نے انہیں وہی کرسی دی جو ایلیٹ کی تھی یعنی وہ اس پبلشنگ ادارے

"غور" سے دیکھا ہے کہ مشاہدے پر قاری عش عش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (آپ مجھے 'غور سے دیکھنے' کا طعنہ دیتے ہیں۔ موضوع چاہے کوئی ہو، غور سے دیکھنا تو شاعر کے فرائض میں شامل ہے اس بات کو آپ سے بہتر اور کون جانے گا) Raine کے شروع کے چار مصرعے دیکھئے:-

....It is shy as a gathered eyelet

neatly worked in shrinking viet,

It is the dilating iris, tucked away,

a tightening throb when f----d.

چونکہ آپ کا اعتراض Two-Fold ہے یعنی "جنسی" بھی اور "مذہبی" بھی۔ اس لئے جنسی اعضا کی طرف چند اشارے کر دیئے ہیں۔ مذہبی کتابوں (توریت، انجیل وغیرہ) نے ان اعضا کو اسی نیچرل انداز میں بیان کیا ہے جس انداز میں منہ، آنکھ، ہاتھ، پیر کو۔ تفریق نہیں کی۔

پھر، نظم لکھتے ہوئے ایک ایک مصرعے کو میں نے یوں نافذ کیا کہ اپنی سفاکی اور چابک دستی پر خود بھی لرز لرز گیا۔ "مفاعلین" والے مصرعے کو بار بار لکھا۔ اس مصرعے میں "راز" کو اس طرح لکھا کہ انہی معنوں میں "مفاعلین" کھپ جائے۔ چونکہ کنایے اور استعارے اگر تمام نہیں تو ۸۰ فیصد Water-Based تھے اس لئے "مفاعلین" کے درمیان "زم زم" کی موجودگی سے یہ نادر کنایہ استعمال کیا۔ فنی لحاظ سے نظم اتنی کسی ہوئی تھی کہ ایسے ہی اختتام کی ضرورت تھی۔ اودھر مشفق خواجہ نے اودھر آپ نے اتنا ڈرا دیا ہے کہ طبیعت پر سخت جبر کر کے اسے "مفاعلین" سے بدل دیا ہے اور کتاب میں اب یہ نظم یونہی چھپے گی۔ اب مت کہیئے گا کہ میں آپ کی بات نہیں مانتا۔

مگر قاسمی صاحب، آپ اور میں اور مشفق خانہ وغیرہ...... ان خوش قسمتوں میں سے ہیں جو صحت مند فاؤل کے مغرور مالک ہیں۔ اب ذرا اس بیچارے کو (اور اس کی قسمت کو) دیکھئے جسے میں نے ۵ سال کی عمر میں دیکھا تھا جب اپنے نوکر صاحب جان کے ہمراہ سودا سلف لینے جاتا تھا۔ اس کا اصل نام حاجی محمد علی تھا۔ ایک بار جب میں پہنچا تو ان گنہگار آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اندر سے دکان میں داخل ہو رہا ہے اور پیچھے پیچھے اس کی بیوی دونوں ہاتھوں سے اس کے "فاۓ" اٹھائے اٹھائے چل رہی ہے۔ یہ منظر لاشعور میں منجمد تھا۔ ۵۵ برس بعد میں نے اس Tragic Figure کو Comic irony کے ذریعے ابھارا۔ اس بیماری پر اپنی انسائیکلوپیڈیا پڑھی اپنے انگریز ڈاکٹر سے آدھ گھنٹے گفتگو کی۔ دو راتوں اور ایک دن میں یہ ساٹھ مصرعے لکھے۔ اتنی محنت میں نے اپنی کم کم نظموں پر کی ہے۔ "مفاعلین" سے بدلا اس لئے کہ ساری گفتگو ان دو لفظوں پر مرکوز ہوتی جا رہی تھی اور نظم کے فنی حسن سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ آپ نظم دوبارہ پڑھیں گے تو میرے "حاجی بھائی پانی والا" میں اور آپ کی کہانی "الحمد للہ" کے مولوی میں المیہ مشترک ملے گا۔ معاشرے کے

خلاف احتجاج بھی مشترک ہے کہ ایک معمولی آپریشن سے یہ مرض دور ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ ہمارے دیہاتوں میں اتنی سہولتیں آج بھی میسر نہیں، ساٹھ ستر سال پہلے تو حالت اور بھی ابتر تھی۔ لب، مسکرا کے نظم کی داد بھیج دیجئے (چھاپئے مت) کہ ۳۷ برس میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ آپ نے میری ایک تحریر کی داد نہیں دی۔ مزید خوش کرنے کے لئے ایک نئی غزل بھیج رہا ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی دو صفحے کا مختصر سا مضمون مجھ پر لکھا ہے اس کی کاپی بھی بھیج رہا ہوں۔ رسالے میں جگہ ہو اور پسند آئے تو وہ بھی چھاپ دیجئے۔

سوچا تھا کہ رشید ملک صاحب کو، محمد کاظم صاحب کو، امجد اسلام صاحب کو، خورشید رضوی صاحب کو، عطاالحق صاحب کو، خالد احمد صاحب کو بلکہ سارے لاہور کو آپ کے پاس بھیجوں کہ وہ سب میرا مقدمہ آپ سے لڑیں مگر جبر اور صبر کر کے بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں، یہ لوگ صبح سویرے خود اپنے فاؤں کو بھی "غور" سے دیکھتے ہیں کہ نہیں یا صرف غیر عورتوں کی پیاڑیوں پر ہی گزارا ہے۔

قاسمی صاحب، شاید آپ اپنا وعدہ بھول گئے، فون پر آپ نے کہا تھا کہ میرے "۵ جدید شاعر" کے جواب میں جو مضمون آیا ہے اس کی کاپی آپ مجھے بھیجیں گے۔

بے شمار محبتوں کے ساتھ آپ کا ساقی
(ساقی فاروقی)

ندیم قاسمی کا خط ساقی کے نام ۲۴۹

پیارے ساقی جی۔ چند روز پہلے ایک عریضہ بھجوا چکا ہوں جس میں "علامت" کے مدیر منتظم کے ایک اداریے کا فوٹو اسٹیٹ بھی شامل تھا۔ میں نے فون پر بھی عرض کیا تھا۔ یقیناً مل چکا ہوگا۔

(۱) سید شاہد علی اور سید مجاہد علی کے منعقد کردہ مشاعرے کے سلسلے میں ان دونوں بھائیوں کے علاوہ یلو جرنلزم کے بعض نمائندہ اخباروں نے اور خود لندن میں مقیم بعض "مہربانوں" نے "سکینڈل مانگرنگ" کے جو کمالات دکھائے، ان کے جواب میں، تنگ آ کر، میں نے "جنگ" میں ایک کالم لکھا، جو خدا کرے کہ لندن کے "جنگ" میں بھی چھپا ہو۔ بہر حال میں اس کا ایک فوٹو اسٹیٹ بھجوا رہا ہوں۔ اس سے حقیقت حال روشن ہو جائے گی۔ اس کی اشاعت کے بعد سید مجاہد علی صاحب نے مجھے ایک خط اوسلو سے لکھا ہے۔ میں نے اس کا جو جواب عرض کیا، اس کی ایک نقل بھی منسلک ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کو پریشان نہ کرتا مگر مجاہد صاحب نے احمد فراز صاحب کے نام اپنے خط کی ایک نقل آپ کو بھیج کر اپنی اور اپنے برادر خورد کی زیادتیوں سے بچنے اور آپ کو اس جھگڑے میں شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور شاید اس لئے کی ہے کہ انھیں فراز صاحب کے بارے میں آپ کے خیالات کا علم ہوگا۔ ویسے حیرت ہے کہ لندن کے اس مشاعرے میں لندن ہی میں مقیم ساقی فاروقی جیسے بڑے شاعر کو نظر انداز کرنے منتظمین کا ایک جرم ہی ہے۔ ہم نے پوچھا بھی کہ "لوکل" شعرا میں سے کون کون مدعو ہیں مگر بتایا گیا کہ کوئی بھی مدعو نہیں۔ سب لمبی لمبی رقمیں مانگتے ہیں اور ساقی صاحب تو مشاعرے کے حاضرین میں شامل ہونے کا بھی معاوضہ طلب کرتے ہیں!...... ہمارا اس مشاعرے کے انتظامات میں کوئی دخل نہ تھا ورنہ ایسی صورت کیوں پیدا ہوتی۔ اس کے باوجود مجاہد صاحب نے فراز صاحب کا نام اپنے خط کی ایک نقل آپ کو بھیجنا مناسب سمجھا تو ان کی نیت کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ احمد فراز کا نام آتے ہی ننگی گالیوں کا طومار باندھ دیتے ہیں۔ اسلئے میں نے آپکو فون کے آغاز ہی میں وضاحت کر دی تھی کہ ساری زیادتی ان سید برادرانگی ہے اور فراز صاحب یا میرے کسی بھی ساتھی کا اس میں دخل نہیں ہے۔

اگر ۲۳، اپریل کو مجھے کوئی مالی مشکل پیش آتی تو میں یقیناً آپ سے رجوع کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتا، مگر میں یہاں سے بھی کچھ پونڈ ساتھ لے گیا تھا۔ منتظمین نے بھی کچھ رقم "عنایت" فرمائی تھی۔ چنانچہ میرے پاس ہوٹل قابل ادا کرنے کا تسلی بخش انتظام تھا۔

اگر "لندن کے ایک شاعر" نے آپ کو فون پر بتایا کہ فراز نے "چوتی" والے فقرے کے بارے میں قاسمی کو آپ کے حوالے سے ہدف بنایا ہے تو یہ سراسر غلط ہے۔ فراز تمام عرصہ میرے ساتھ رہے اور ایک بار بھی آپ کا یا آپ کے ارشادات کا کوئی دور دراز کا ذکر بھی نہیں آیا۔ لندن ہی کے ایک شاعر نے جس طرح ہوٹل سے منسوب سکینڈل کو

ڈرامے کی صورت دے کر اسے پاک و ہند کے متعدد اصحاب اور اخباروں کو بھجوایا، اس کا شاید آپ کو علم نہیں۔ اور علم ہونا بھی نہیں چاہیئے کہ اس سے آپ کے منہ کا ذائقہ تلخ ہو سکتا ہے۔

(۱) دو بھائی جو ٹکٹ بیچ کر اوسلو اور لندن میں سالانہ مشاعرے برپا کرتے ہیں۔ (ساقی)

یہ آپ کا کرم ہے کہ دس فیصد شاعری کی پسند کے حوالے سے آپ نے مجھے میرؔ اور جوشؔ کی صف میں شامل کیا ہے (اور یہ میرا اعزاز ہے) مگر ان دونوں کے ہاں رطب و یابس اتنا ہی ہے، جتنا فارسی اور اردو کے ہر بڑے شاعر کے ہاں ہے۔ میراجی آپ کے ممدوح ہیں مگر کبھی اس نظر سے ان کا بھی مطالعہ کیجئے اور فیض کی خوبصورت مگر یک رُخی شاعری کا بھی۔ (راشد میری نظر میں فیض سے بڑا شاعر ہے)۔

میں آپ کی صاف گوئی بلکہ فاش گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ یہ بڑے حوصلے اور جرأت کی بات ہے مگر خدارا ---- خدارا، مقابل کو گندی ننگی گالیاں دے کر اپنے ایوانِ تنقید کی بنیادیں کھوکھلی نہ کر دیا کیجئے۔ کم سے کم اب اس عمر میں تو گالی دینے سے پرہیز کیجئے۔ لہجے کی سختی اور تندی سے کام لیجئے مگر گالی کا ہتھیار قطعاً استعمال نہ کیا کیجئے۔

مجھے معلوم ہے اور متعدد احباب نے مجھے بتایا ہے کہ ضیاء الحق کے اقتدار کے دنوں میں فرازؔ صاحب نے جگہ جگہ میرے متعلق سخت باتیں کیں۔ میں نے ان سب سے عرض کیا تھا کہ وہ میں ہی تھا، جس نے دوبار اس آمر کے دورِ اقتدار میں علی الاعلان کہا تھا کہ ہم شاعر اور ادیب کسی حکومت کے وفادار نہیں ہیں۔ ہم صرف اپنی مملکت پاکستان کے وفادار ہیں اور ہم اپنے نظریات و خیالات کا اعلان ہر حال میں، ہر پابندی اور زباں بندی کے علے الرغم کریں گے کیونکہ اگر ایسا نہیں کریں گے تو اپنے فن کا جواز ختم کر ڈالیں گے۔ میں نے اپنی ایک تقریر کے آخر میں اپنا یہ شعر بھی آمر صاحب کی نذر کیا تھا:

ندیم کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نغمۂ ہنر میں رہوں

میں نے "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز اس لئے قبول کیا کہ یہ میرے وطن کا اعزاز ہے مگر میں نے ایک بار بھی ضیاء الحق سے ملاقات نہیں کی۔ میرے مقابلے میں فیض صاحب نے زندگی کے آخری دنوں میں خود آمر صاحب سے ملاقات کے لئے وقت طلب فرمایا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ان سے گفتگو فرماتے رہے اور ظاہر ہے کہ یہ گفتگو صرف "آب و ہوا" کے بارے میں تو نہیں ہو سکتی۔ پھر انہی دنوں انہوں نے پولیس کے ایک نہایت جابر انسپکٹر جنرل (ریٹائرڈ) کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی (اور یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں تھی) اور خود فیض صاحب کی تحریر موجود ہے کہ انہوں نے گورنر گورسائی کی متعدد تقریریں لکھیں!...... اور اعتراضات کا پہاڑ مجھ پر توڑا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ میری رسائی حکومتوں تک نہیں ہے۔ صرف ساقیؔ یا فرازؔ تک ہے اور بس۔ آج وہی مجھے "بے ضمیر" کہنے والے میرے "باضمیر" ہونے کی قسم کھاتے ہیں تو ان کے ماضی کی زیادتیوں سے قطع نظر کر لینا چاہیئے کہ معاف کر دینا انسانیت کا حسن ہے۔

آپ اگر فراز کی غزل کے قائل نہیں ہیں تو فیض کی غزل کے کیوں قائل ہیں۔ یہ نکتہ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر فیض نے بھی تو اپنی پیاری پیاری غزلیں حافظ اور داغ کے اسلوب میں کہی ہیں۔

حبیب جالب شاعر تو تھے مگر پھر خالصتاً سیاسی آدمی ہو گئے۔ انھوں نے جو شاعری کی وہ مولانا ظفر علی خاں کی اس شاعری سے بڑی نہیں جو انھوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف کی۔ اور جس طرح آج ظفر علی خاں کی اس شاعری کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ بعینہ جالب کی شاعری بھی چند برس بعد محض حوالے کی چیز بن کر رہ جائیگی۔ میں جالب کی بلند حوصلگی اور جرأت مندی کا معترف ہوں مگر اس نے اپنے جینئس کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کیا۔

میں فراز کی سفارش نہیں کر رہا ہوں۔ آپ ان کے بارے میں جو چاہیں لکھیں۔ میں روکنے والا کون۔ میری صرف یہ التجا ہے کہ ان کے "کتابوں میں پھولوں" اور "شرابوں میں شرابوں" کی رتبہ والی شاعری کو ایک طرف رکھ کر ان کے اس نوعیت کے اشعار کی داد بھی (علی الاعلان نہیں، جی ہی جی میں) دے دیا کیجئے!

یاد اس کی غیرتِ مریم کی جب آتی ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

باقی رہا کے جنس کے بارے میں یاوہ گوئی اور تخلیق کاری کے درمیان فرق، تو میں اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہوں کہ میں ان موضوعات پر حاوی نہیں ہوں۔ آپ نے اگر لارنس کی "لیڈی چیٹر لیز لور" کے کچھ مکروہات عورت کے دو طرفہ استعمال اور عورت کے ریاح کے اخراج کو سراہا ہے تو یہ آپکی اپنی صوابدید ہے (البتہ مجھے آپکے اس معیار پسندیدگی سے شدید صدمہ ہوا ہے کہ ان حرکتوں میں کہاں کا تخلیقی حسن در آیا ہے اور اگر یہ حسن ہے تو کراہت کیا ہوتی ہے!)

Raine کی وہ لائنیں لکھ کر آپ نے مجھے پھر سے صدمے کی حد تک حیرت زدہ کر دیا ہے کہ اس نے مقعد کا قصیدہ رقم فرمایا ہے۔

ساقی جی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟۔ آپ نظم غزل میں اس طرح کی موشگافیوں کو داخل کرنے کے یقیناً مخالف ہوں گے۔

(۲) آپ کی نظم پر شمس الرحمٰن فاروقی نے جو رائے دی ہے وہ نہایت درجہ گمراہ کن ہے۔

شاید فاروقی صاحب نے محض آپ کو خوش کرنے کے لئے یہ سب کچھ لکھا ہے۔

محبت کے ساتھ

آپ کا

(احمد ندیم قاسمی)

(۲) قاسمی صاحب کی یہ رائے انتہائی گمراہ کن ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مذکورہ مضمون ساقی فاروقی کی شاعری کی صحیح تفہیم کیلئے ایک اعلیٰ درجہ کا غیر جانبدارانہ تنقیدی تجزیہ ہے جو تشکیل کے پچھلے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

ہماری کہانی کی تاریخ - ۱۱

(نظیر اکبر آبادی - ۱)

احمد ہمیش

مضمون

مشرق کے نشاۃ الثانیہ کی دسویں یادگار زمانہ ہستی نظیر اکبر آبادی اردو سمیت بر صغیر کی تمام زبانوں کی نظم کی شاعری کے پہلے شاعر ہیں۔ بلکہ ایک طرح سے وہ مغرب کی زبانوں کی نظم کی شاعری کے بھی پہلے شاعر ہیں۔ اس لئے کہ جب نظیر اکبر آبادی اردو ہندی میں نظم کی شاعری کر رہے تھے۔ تب مغرب کی کسی بھی زبان میں نظم کی شاعری موضوعی و ہئیتی اعتبار سے قابلِ ذکر نہیں تھی۔ اب اگر تاریخی و معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے تو نظیر اکبر آبادی کے حوالے سے بر صغیر میں نظم کی شاعری کا موضوعی پس منظر بہت وسیع تھا۔ ایسی وسعت اس زمانہ میں مغربی زبانوں میں کی جا رہی شاعری کو میسر نہیں آئی تھی۔ اب یہاں دیکھنا ہوگا کہ نظیر اکبر آبادی کو وہ موضوعی پس منظر کیسے میسر آیا جس کی کڑیاں امیر خسرو سے کبیر داس، میرا بائی، بے دل، اور میر تک آملتی ہیں۔ غور کیا جائے تو بر صغیر کی اجتماعی ذات کی کہانی نظم کے خالص ہندی تہذیبی موضوعات سے بنیاد میں آئی۔ امیر خسرو نے بر صغیر کی رسوم، شادی بیاہ اور تیوہاروں کو شعری سانچہ میں ڈھالا تو یہ دراصل شاعری کی کہانی کا آغاز تھا۔ کبیر داس کے یہاں بر صغیر کی شاعری کی کہانی اجتماعی مقدر کی روحانی عبارت بن گئی جب کہ میرا بائی نے شاعری کے توسط سے ہندوستانی کہانی میں تصور عورت اور تصور مرد کی روحانی یکجائی سے ایک جمالیاتی نظام کی بنیاد رکھی۔ اسی جمالیاتی نظام کو بے دل نے فکر و دانش کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ مگر بیدل کے بعد بر صغیر میں مغل اقتدار کی نزاعی ابتری اور زوال سے معاشرہ میں ایسی اتھل پتھل ہوئی کہ عام زندگی کو مفلسی، گرسنگی، بھوک اور فلاکت نے آلیا۔ ایسے میں تصور انسان سے فرار کی راہ دکھانے والے تصوف یعنی فنا فی اللہ والی رہبانیت کے خلاف نظریہ انسان نے عام دل و دماغ میں جگہ لینے شروع کی یہ بھی ایک طرح سے فکر کی سطح پر مشرق کے نشاۃ الثانیہ کی ابتدائی صورت تھی۔ حالانکہ کبیر داس نے اپنے دور میں نرآکار برتمہ کے تصور سے قطع نظر حقیقتِ انسان کا چہرہ تو دکھا دیا تھا۔ میر نے غزل اور مثنوی میں انسانی معاشرہ کی تباہی اور اس کی کہانی بیان کی۔ پھر بھی زبان کی توسیع اس لئے نہیں ہو سکی کہ میر صاحب غزل اور مثنوی میں زبان کے ایک خاص برتاؤ سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔

نظیر اکبر آبادی نے کبیر داس سے تو حقیقتِ انسان کا چہرہ منتخب کیا اور میر سے انسانی معاشرہ کی کہانی بیان کرنے کا انداز اختیار کیا۔ البتہ منظر نامہ میں اپنے پورے اسلوب ذات کو ڈھالنے کی جرأت اظہار انہیں اکبر آباد (آگرہ) کی عام زندگی کے رہن سہن سے ملی۔ یہاں سوچنا ہوگا کہ نظیر اکبر آبادی کے دور میں فلسفہ، نفسیات اور معاشیات وغیرہ قبیل

کے علوم نہیں تھے...... کہ جن سے کوئی مطمع نظر، فکری رجحان اور نظریہ ترکیب کیا جاسکتا۔ تاہم اکبر آباد (آگرہ) میں افراد اور عام خلقت کے رہن سہن میں کثرتِ نظارہ والا وصف تو ضرور تھا۔ یعنی نظیر اکبر آبادی نے اپنے علاقہ اکبر آباد (آگرہ) میں رہتے ہوئے ایک عالم بسیط کا نظارہ کرلیا تھا۔ ریچھ کا بچہ صرف اکبر آباد (آگرہ) میں ہی نہیں، اس زمانہ کی دنیا میں ہر جگہ دیکھا جاسکتا تھا۔ اور جس فقیر کی آنکھ سے نظیر اکبر آبادی نے اکبر آباد کے آسمان پر چاند اور سورج کو روٹی کی شکل میں دیکھا تو یہ شکل تو اس زمانہ کی دنیا کے کسی بھی فلاکت زدہ علاقہ کے آسمان پہ دکھائی دے سکتی تھی!

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نہ کوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے
نا دشمنی و دوستی نا تندخوئی ہے
سب کوئی ہے اسی کا جس کے ہاتھ ڈوئی ہے
نوکر، نفر، غلام بناتی ہیں روٹیاں

یہاں صرف "روٹی" کے ہی موضوع کو لے کے ایک عالم تک اجتماعی موضوعات کا تصور کیجئے اور پھر کثرت نظارہ کیجئے تو یہ خوبی اندازہ ہوگا کہ نظیر اکبر آبادی نے اپنے زمانہ کی دنیا سے آج تک کی دنیا کا نظارہ کرلیا تھا اس طرح نظیر اکبر آبادی کی نظم کی شاعری سے اجتماعی موضوعات کی کہانی کو تحریک ملی۔ اور یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ "انگارے" کا رجحان اور ترقی پسند تحریک دراصل نظیر اکبر آبادی کی نظم کی شاعری کے اجتماعی موضوعات کا چربہ تھی۔

ابوالاشاد

غزل

زینتِ گلستاں کی نہ بدلی نہ فضا میرے بعد
اب بھی چلتی ہے وہی تیز ہوا میرے بعد

رونقِ بزم تھی زندہ مری میخواری سے
در نہ میخانے کا پھر بارِ دگر کھلا میرے بعد

حضرتِ خضر نے بتلایا مجھے بھی برسوں
اب بلائے نہ ہیں وہ آبِ بقا میرے بعد

قیس و فرہاد کی تمثال تھی میری ہستی
قصۂ ماضی ہوئے مہر و وفا میرے بعد

"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق"
سلسلہ یہ بھی چلو ختم ہوا میرے بعد

اہلِ دل مجھ کو بہت یاد کریں گے اس دن
شہر میں ہوگا جو اک حشر بپا میرے بعد

قدر جانی نہ مری شہر کے رکھوالوں نے
اب کیا کرتے ہیں قسمت سے گلہ میرے بعد

کس نے سر اپنا کٹایا تھا پئے بیزارِ رضا
کون یہ جسم لئے پھر حق کا اٹھا میرے بعد

مجھ سے سقراط کی سنت میں جو زہر پیا
اب کرے گا نہ کوئی ایسی خطا میرے بعد

حق پرستی کا انہیں کون یہاں دے گا خراج
در پہ لکھوا اہلِ وفا کا جو بہا میرے بعد

میرے بچوں نے کیا مجھ سے عجب ایک سوال
خوں بہا تھا انہیں ہوگا ادا میرے بعد

زندگی بھر میں رہا تیرِ ملامت کا ہدف
لوگ چومیں گے مرا نقشِ کفِ پا میرے بعد

آکے دیدار کو گیا تربت پہ سرِ شام کوئی
میری چاہت کا صلہ مجھ کو ملا میرے بعد

کوئی پیغام کبھی آئی نہ اس کا مجھ تک
مجھ کو کیا اب جو چلے بادِ صبا میرے بعد

اب کیا روئے تمہیں ابوالاشاد یہ کچھ نام
جانشیں کون ہوا میرا بھلا میرے بعد

ابوالاشاد

۹۹ء

غالب سے چھیڑ چھاڑ

تصدق سہیل

ایک عرصے سے میری یہ خواہش تھی کہ میں غالب کے ان شعروں کی جو آج تک غلط پڑھے اور سمجھے جاتے ں کے بارے میں کچھ لکھ کر سالوں پرانی غلط فہمیاں دور کردوں۔ مگر آج تک دوسری مصروفیات کی بدولت موقعہ نہ مل کا۔ آج جب میرے گھر والے مجھے غلطی سے یا جان بوجھ کر مجھے کمرے میں بند کر کے چلے گئے ہیں تو سوچا اس موقع سے ئدہ اٹھاؤں

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بازیچہ کوئی لفظ نہیں کتابت کی غلطی کی وجہ سے باغیچہ، بازیچہ چھپ گیا تھا اور اسی دن سے آج تک غلط ں چھپتا چلا آرہا ہے۔

اطفال، میاں جمیل الدین اطفال، غالب کے ابا کے بہت عزیز دوستوں میں سے تھے، جن کے گھر کا ت بڑا باغیچہ غالب کے گھر کے بالکل سامنے تھا، جہاں غالب بچپن میں مداری۔ سانپ والے، بندر والے اور ریچھ کا اشا دیکھنے جایا کرتے تھے۔

اب اگر آپ اس شعر کو ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پڑھیں تو یہ شعر ایک بالکل سیدھا سادھا شعر ظر آنے لگے گا۔

یعنی کہ میاں اطفال احمد صاحب کا باغیچہ جو ہمارے سامنے ہے۔ اس میں رات دن تماشے وغیرہ ہوتے تے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یوں تو غالب نے بہت سے شعر کمرشل پبلٹی کے لئے لکھے ہیں مگر سب سے زیادہ جو مشہور ہے وہ مندرجہ یل شعر ہے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد

ایران کے تین چار بہت سی مشہور بہادروں میں کوہکن کا نام آتا ہے۔ رستم و سہراب اور پھر کوہکن یہ وہ آدمی جس پر کوئی زہر اور کسی قسم کے ہتھیار یا کہ گولی تک سے اسے نہیں مارا جا سکتا تھا۔ اس لئے 150 سال کی عمر میں ان

نے زندگی سے تنگ آ کر تیشہ مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ اس شعر کا یہ مصرا ع

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد

ہندوستان کی تمام بسوں پر لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ایڈورٹائزمنٹ ایک مشہور تیشہ بنانے والی کمپنی کا تھا، اس کے نیچے کی سطور کچھ اس طرح تھیں۔

ہم نہیں چاہتے کہ آپ کوہکن بنیں۔ ہمارا تیشہ آپ کی جان جا بھی سکتا ہے۔ اس لئے اپنی حفاظت کے لئے آج ہی ہمارا تیشہ خریدیں۔

دق سہیل　　　فردوس حیدر جنیوئن آرٹسٹ

یورپ اور امریکہ میں آج کل ایسی بہت سی گیلریاں ہیں جو صرف Primitive Art، Naieve A، Raw Art اور Out Sider آرٹ ہی بیچتی ہیں۔

مگر اپنے ہاں اسکی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ یورپ میں جہاں آجکل اس آرٹ کی ت قدر و منزلت ہے۔ وہاں ان آرٹسٹوں کے پیچھے باقاعدہ جاسوس یہ جاننے کیلئے لگے رہتے ہیں کہ ںوں نے کبھی زندگی میں کہیں پڑھا لکھا تو نہیں، کسی سے کچھ سیکھا تو نہیں۔ یہ جان بوجھ کر Primitive A پیدا کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔ کیونکہ Its an Intuitive and Visionery A۔ یہ آرٹ روح کی گہرائیوں سے آتا ہے۔ اس کو اسکولوں اور کالج کی ہوا سے جتنا رر رکھا جائے اتنا ہی اچھا ہے وہ اس کی معصومیت کو پراگندہ کر دے گا۔

اسی لئے چند سال پہلے جب فردوس حیدر نے مجھ سے پینٹنگز سیکھنے کو کہا تو میں نے جواب یا۔ میں رنگ ملانے سکھا دونگا۔ پیلیٹ نائف کو کیسے چلانا ہے، بتادونگا۔ کاغذوں کے بارے میں دوں گا۔ باقی تم خود کرو۔

ٹیڑھی میڑھی شکلوں میں جو معصومیت ہے، میں نہیں چاہتا تھا، وہ جاتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ردوس حیدر کی شکلیں اور چہرے آج بھی اس کے اپنے ہیں۔ دن بدن اس کی تصویریں اچھی سے اچھی تی جارہی ہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ یہاں وہ گیلریاں نہیں، جو اس آرٹ کو فروغ دیتی ہیں۔ Raw Visio جیسے رسالے نہیں، جو دنیا بھر میں ان آرٹسٹوں کی تشہیر کرتے ہیں، ان گیلریوں کے گاہک ایسی تصویریں جمع کرتے ہیں یا ان تصویروں کے پرستار دوسری گیلریوں سے علیحدہ ہیں، وہ ان ٹسٹوں سے جو کبھی کسی آرٹ کالج کے باہر سے بھی گزرے ہوں ایسے بھاگتے ہیں جیسے چوہا، بلی سے۔

فردوس حیدر اگر انگلستان میں ہوتی تو اب تک کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی اگر اس پر "ساچی
(Millionair directer of advertising and a wellknown art collector an promoter of modern British Art)
وہ اب تک Turner Prize سے لے کر Tate Gallery میں لٹک رہی ہوتی۔

ہماری یہ بد قسمتی ہے کہ آج کل آرٹ Talent پر نہیں پبلسٹی پر بکتا ہے موجودہ دور میں Art ایک Comodity بن کر رہ گیا ہے۔ ناجائز پبلسٹی سے اب ہر ایرے غیرے کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ بنا سکتے ہیں یقین نہیں آتا تو اس دفعہ کے Turner Prize جیتنے والوں کی لسٹ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ مگر ایسے لوگوں کی حیثیت پانی کے بلبلوں کی سی ہوتی ہے۔ امریکی تہذیب کے گندے چھینٹے جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے کاروبار، ادب وثقافت پر پڑے ہیں تو آرٹ بھی ان کی زد سے نہیں بچ پایا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم ہر ایرے غیرے کو پبلسٹی کے ذریعے سے اپنے ملک کا صدر تک بنا سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں کوکا کولا بچے بچے کو بیچ سکتے ہیں۔ Mecdonald کا بیف برگر کھلا سکتے ہیں۔ تو کیا چوٹی کے آرٹسٹ نہیں بنا سکتے۔ امریکن پالیسی پیسے پر منحصر ہے۔ پیسے سے ان کے خیال میں خالی کینوس کو Master Piece کہہ کر بیچا جا سکتا ہے۔

یہ جھوٹ نہیں 1948ء میں جب لڑائی کے بعد یورپ بھوکوں مر رہا تھا امریکہ نے CIA کے ذریعے بے شمار پیسہ خرچ کر کے کچھ بڑی گیلریوں کو پیسہ کھلا کر کچھ بڑے نقادوں کو رشوت دے کر اپنے ملک کے ایسے آرٹسٹوں کو، جنہیں برش پکڑنے کی تہذیب بھی نہیں تھی، دنیا کے بڑے آرٹسٹوں میں لا کھڑا کیا۔

(Ref. BBC. Documentry of CIA, Secret files)

آج کل پھر لندن میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

میں Figurative آرٹسٹ ہوں۔ مجھے وہ تصویریں اچھی لگتی ہیں، جو کہانیاں بنائیں، جو ہمیں سوچنے پر مجبور کریں، جو ہمیں اپنے رنگوں سے موہ لیں، جن میں کوئی خیال ہو، کسی بات پر طنز کی گئی ہو، کوئی سوال اٹھایا گیا ہو، کسی پر پھبتی کسی گئی ہو۔ جس سے کچھ حاصل کر سکیں، جو ہمارے دلوں کے تاروں کو چھیڑے، جو بیتے لمحوں کی یاد دلائے، جسے دیکھ کر ہم کھو جائیں، سوچ میں پڑ جائیں۔

فردوس حیدر افسانہ نویس ہے۔ اس کی تصویر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان میں اڑتے ہوئے لمحات کو قید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کو پکڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تصویریں اپنے اندر ان گنت کہانیاں لئے ہوئے ہیں۔ امریکن یا دورِ حاضرہ کے برٹش آرٹ کی طرح Shit Art نہیں ہیں۔ یہ Sensationalism نہیں ہے، جو دوسروں کو خواہ مخواہ چونکا دینے کے لئے ہو۔ یہ آرٹ دل وروح کی گہرائیوں سے درد بن کر آیا ہے۔ اس لئے برٹش آرٹ کی طرح چند دنوں بعد ختم نہیں ہو گا۔

☆☆☆☆☆

عنبر بہرائچی کا شعری مجموعہ

لم یاتِ تطیرك وی نظر

تحریری مطالعہ حنیف اسعدی

عنبر بہرائچی کی یہ گرانقدر تصنیف اردو ادب میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک نادر کتاب ہے۔ نادر اس لئے کہ اول تو اردو میں رزمیہ شاعری کا فقدان ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر پوری وضاحت سے روشنی ڈالی ہوئی کوئی دوسری رزمیہ میری نظر سے نہیں گزری۔ اہلِ علم نے رزمیہ کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک تاریخی رزمیہ اور دوسرا ادبی رزمیہ۔ عنبر بہرائچی کی یہ رزمیہ دونوں اوصاف سے متصف ہے۔ مصنف نے ان دونوں خصوصیات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تاریخی واقعات تو سیرتِ طیبہ کی صورت میں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ رہ گیا ادبی محاسن کا معاملہ تو اس کے لئے عنبر بہرائچی کی علمی استعداد، تاریخی معلومات، مختلف زبانوں پر دسترس اور حضور اقدس ﷺ سے نیاز مندانہ گرویدگی کافی ہے۔ رزمیہ شاعری ہمیشہ بیانیہ انداز کی ہوتی ہے لیکن بیان میں ادبی چاشنی کی آمیزش اور محاسنِ شعری کا امتزاج عنبر بہرائچی کا اپنا کمال ہے۔ رزمیہ شاعری کی ایک اور خاصیت جس کا تعلق شوکتِ لفظی، پر شکوہ طرز بیان، معنی آفرینی، فنکارانہ طریق اظہار اور علوِ فکر سے ہے۔ یہ سب کچھ بھی مصنف میں موجود ہے۔

کسی ہیرو کی سوانح جو داستان کی صورت بیانیہ انداز میں لکھی جائے، رزمیہ کی تعریف میں آتی ہے۔ اس میں کہانی، کردار سازی، مقصدیت اور زندگی کے دوسرے پہلو ایک ساتھ ہی تخلیق میں سمو دیئے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر رزمیہ کائنات کی سب سے ارفع واعلیٰ ہستی کی حیاتِ طیبہ کا تفصیلی جائزہ ہے، جس کی ابتدا و حرا اور انتہا فتح مکہ ہے۔ یعنی نبوت کے چونکا دینے والے اعلان سے شروع ہو کر یہ داستان پاک حضور پر نور ﷺ کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس میں ذاتِ اقدس کی وہ تگ و دو بھی شامل ہے جو حق و صداقت کی اشاعت و ترویج کے لئے کی گئی اور ان دشواریوں اور مصائب کا ذکر بھی ہے جو خود حضور اکرم ﷺ اور آپ کے رفقا کو درپیش ہوئے۔ اس رزمیہ میں حضور ﷺ کے اوصاف حمیدہ اور پاک و پاکیزہ کردار کی وضاحتیں بھی ہیں جن کے سبب دوست و دشمن سب ہی آپ کے قدموں میں آنے کو اپنا اعزاز سمجھنے لگے تھے اور جس کی روشنی آج بھی جادۂ انسانیت کو روشن کئے ہوئے ہے۔

یہ رزمیہ عالم انسانیت کو ایک مکمل ضابطۂ حیات بخشنے والے کے عملی کارناموں کی داستانِ عمل ہے۔ جس نے ہمیں ایک ایسا منشور حیات عطا فرمایا ہے، جسکی اہمیت دائمی اور جسکی افادیت عالمگیر ہے۔ انسانی معاشرہ انسانی جبلت کے زیر اثر شر و فساد سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ اسلئے اسکی اصلاح کا تسلسل بھی ساتھ ہی ساتھ چلنا چاہئیے۔ اصلاح حال کیلئے اسلام سے بہتر دین اور قول و فعل کے اعتبار سے مکمل و اکمل ذات حضور اکرم ﷺ کے علاوہ کائنات میں کہیں نہیں۔

عنبر بہرائچی بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کو ایک ایسی کتاب لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، جو اللہ اور اللہ کے رسول کے دربار ڈربار میں ضرور بالضرور قبولیت کا درجہ حاصل کرے گی۔

کتاب بہت سلیقے اور حسن کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ عمدہ کاغذ، معیاری کتابت، پاکیزہ طباعت معیاری اور شاندار گٹ اپ سب کچھ قابلِ تحسین ہے۔ اتنی خوبیوں کے باوجود کتاب کی قیمت صرف سو (۱۰۰) روپے ہے۔ جو نہایت مناسب ہے۔ کتاب علی گڑھ اور لکھنؤ کے مختلف تجارتی اداروں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

عشق میں روگ ہزار

صابر ظفر کا دسواں شعری مجموعہ

احمد ہمیش — تحریری مطالعہ

۶۲ غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ، عشق میں روگ ہزار، کو پڑھتے ہوئے صابر ظفر کی نہ صرف قادر الکلامی، متنوع زبان اور لفظیات کے جہانِ نو کا پتہ چلتا ہے بلکہ قبل از وقت ایک بہت بڑے غم سے ہمیشہ کے لئے منسلک ہونے کا اندازہ بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس مجموعہ میں شامل ایک غزل عبید اللہ علیم کے جسمانی وجود سے بچھڑ جانے کے غم کو ظاہر کرتی ہے:

ویران سرائے کے دیے کو
سُنتا ہوں، ستارے رو رہے ہیں

اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی عزیز ہستی سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے پہ رونے والوں کے آنسو کسی گھڑی تھم جاتے ہیں یا ایک طرح سے کتھارسس ہو جاتا ہے۔ لیکن مذکور غزل میں یہ کیسے رونا تھا کہ آنسو نہیں تھمے یا کتھارسس نہیں ہوا۔ اس کی بجائے مذکور کتاب کی اشاعت کے بعد لگ بھگ تین ماہ ہی گزرے ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ صابر ظفر کے ایک بیٹے کو کچھ قاتلوں نے گلا گھونٹ کے ہلاک کیا اور اس کے مُردہ جسم کو دریائے سندھ میں پھینک دیا۔ یہاں تک کہ کئی دنوں بعد صابر ظفر کو اپنے مقتول بیٹے کا مردہ جسم دیکھنا نصیب ہوا۔ یہاں غور کیا جائے تو عبید اللہ علیم سے بچھڑنے کا غم صابر ظفر کے مقتول بیٹے کے بچھڑ جانے کے غم سے آملا اُس طرح کہ رونے والے تب سے اب تک مسلسل رو رہے ہیں اور آئندہ بھی روتے رہیں گے۔ یعنی آنسو کبھی نہیں تھمیں گے اور کتھارسس کبھی نہیں ہوگا۔

ناشر

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز۔ ۲
عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی

قیمت ۱۲۰ روپے

شب بہ خیر

ایک تحریر ناول جیسی

محمود شام

احمد ہمیش — تحریری مطالعہ

ستیہ جیت رائے کی ایک فلم میں ایک سانپ کو بڑی دیر تک ایک ویران گھر کی طرف جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس میں سانپ سے ویران گھر کی نسبت دیکھنے والے کے ذہن پر ثبت ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسا ہی منظر نامہ حرف و لفظ کی بساط پہ ممتاز شاعر محمود شام نے "شب بہ خیر" ایک تحریر ناول جیسی میں حقیقت نگاری کی انتہا پر دکھایا ہے۔

دراصل ہمارا ملک پاکستان تہذیبی و معاشرتی قدروں سے بالکل خالی ستیہ جیت رائے کی فلم والے مذکور ویران گھر کی طرح ہے اور محمود شام کی کتاب، شب بہ خیر، کے ۸۸ کردار خاص طور پر بیگم سرخاب، بیگم سلیمان، بیگم خان، کرن، جنرل جہاں تاب، رضا عسکری، ارشاد رحمن، حاجی رحمت، سردار اللہ بخش، شرمین، رانا خادم خاں، سیما اور سفینہ وغیرہ اپنی مجموعی شکل میں اس سانپ کی مثل ہیں، جس کا رخ ویران گھر یا پاکستان کی طرف ہے۔ یوں بھی سمجھ لیا جائے کہ مذکور سانپ ویران گھر یا پاکستان میں سکونت کرتا ہے۔

تاہم شب بہ خیر کے منظر نامے کو اسکیچ کرنے میں محمود شام نے بڑا رسک لیا ہے۔ خدا انھیں محفوظ اور سلامت رکھے۔

زیر اہتمام: ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ مین اردو بازار۔ کراچی۔

قیمت: 25 روپے۔

☆☆☆☆☆

ہمدرد نونہال ماں نمبر

مدیر اعلیٰ : مسعود احمد برکاتی

تبصرہ

ہمدرد نونہال ماں نمبر حکیم محمد سعید شہید کی شہادت سے تقریباً سات ماہ قبل شائع ہوا۔ اب جب ہم ہمدرد نونہال ماں نمبر کے مشمولات پر ایک نظر کر رہے ہیں تو مختلف تحریروں خاص طور پر ڈاکٹر سید فرحت حسین کی کہانی "پیغمبر کی ماں" "مسعود احمد برکاتی کی کہانی" "ایک عظیم ماں" بہ شمول کچھ خطوط : ایک ماں کا دل، لیڈی ڈیانا ..... ایک ماں۔ شان الحق حقی اور انجم اعظمی کی نظموں سے ماں کی لازوال محبت یا ماممتا کی تصویریں نمایاں ہوتی ہیں۔ تاہم مذکور "ماں نمبر" کے شروع کے صفحات پر "میری آپا" کے عنوان سے حکیم محمد سعید شہید کی تحریر ان کی شخصیت کے لازوال ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ اس میں ماں کی عظمت اور اس کی ماممتا کی قیمتی یادوں کو اجاگر کیا گیا ہے، جب کہ اس معتبر حوالہ سے حکیم محمد سعید شہید کی انسان دوست اور ہمدرد شخصیت کو دھیان میں لائیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب محبت اور ہمہ گیر جذبۂ خدمت سے معمور نہ صرف ایک مرد مومن تھے بلکہ وہ ایک طرح سے ملک و قوم کی "اجتماعی ماں" کا درجہ رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد فاؤنڈیشن اور مدینۃ الحکمت دراصل حکیم محمد سعید شہید کی "اجتماعی ماممتا" کا کبھی نہ ختم ہونے والا قومی ورثہ ہیں۔ جب کہ حکیم صاحب نے دنیا سے ایمان کی سلامتی کے سوا کچھ نہیں لیا۔ ان کا ایک یادگار قول قارئین کی توجہ کے لئے قابلِ ذکر ہے: "کفن میں جیب نہیں ہوتی"۔

قیمت (فی شمارہ) ۰۰-۱۵ / روپے

پتہ :- دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاکخانہ، ناظم آباد، کراچی-۷۴۶۰۰

مکی مدنی / تسکین واحدی

انجلا ہمیش

تبصرہ

ضلع بلیا ہندوستان کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے۔ لفظ بلیا "بلی" سے بنا ہے جس کے معانی بہادری کے ہیں چونکہ اس علاقے کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت انتہا درجے تک پہنچی ہوئی تھی للذا لارڈ رپن نے انتظامی سطح پر علاقہ کو تقسیم کر دیا اور جس حصے میں زیادہ بغاوت پائی جاتی تھی اسے ضلع بلیا کا نام دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کے خلاف چتو پانڈے نامی ایک بہادر نے انگریزوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ بلیا سے گزرتی گنگاندی انگریزوں کے خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ جہاں بلیا کی تاریخ میں چتو پانڈے نامی بہادر انسان گزرا ہے۔ وہیں اس مٹی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ مہاتما گوتم بدھ نے گیان کیلئے گھاگھرا کی میدانی پٹی (بلیا) پہ اپنے قدم رکھے گویا یہاں سے لوگوں نے وراثت میں چتو پانڈے سے بہادری اور گوتم بدھ سے علم و عرفان اور سادگی لی۔ علم و ادب کے حوالے سے بلیا کی مٹی نے نو نامور ہستیوں کو جنم دیا مگر اپنی فطری سادگی کی بنا پر نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ کے مصداق کئی ہستیاں علم و ادب کی تاریخ کے صفحات پر نہ آسکیں اور جن ہستیوں کا نام سامنے آیا ہے ان ہستیوں میں حضرت آسی رحمتہ اللہ علیہ، مولانا آزاد سجانی، نشور واحدی، عارف عباسی، فاروق بانسپاری، قمر جمیل، محبوب خزاں اور تسکین واحدی جن کا تعلق علم و ادب کے گھرانے سے ہے اور انہوں نے خود بھی ایسے آباؤاجداد سے وراثت میں علم و ادب کا سرمایہ لیا، طبعیت چونکہ شاعری کی طرف مائل تھی۔ ابتداء میں انہوں نے نظمیں اور غزلیں کہیں مگر خدا نے ان کے قلب کو عشق رسول سے بھر دیا۔ نعت اتنی حساس صنف ہے کہ اس میں کچھ نزاکتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کی شان میں اس طرح کی کوئی سطر نہیں لکھنی چاہئے کہ انہیں خدا کے درجے تک پہنچا دیا جائے جیسا کہ بعض نعت گو شعراء سے یہ لغزشیں ہوئی ہیں اس طرح ہمارے اکثر نعت گو حضور ﷺ کی محبت میں دوسرے انبیاء کی شان میں تکذیب کرتے ہیں بے شک آنحضرت ﷺ سردار الانبیاء ہیں مگر ایک تو ہمارے مذہب نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام انبیاء کرام سے احترام کو ملحوظ خاطر رکھنے کا کہا ہے اور خود آنحضرت ﷺ نے ان نزاکتوں کا خاص خیال رکھنے کا حکم دیا ہے آپ ﷺ ارشاد ہے کہ مجھے حد سے نہ بڑھا جیسا کہ نصارٰی نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا ہے میں تو صرف خدا کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے بھی یہ ثابت کیا کہ وہ تمام انبیاء کا ذکر اتنی ہی محبت اور احترام سے کرتے تھے تسکین واحدی نے ان دونوں نزاکتوں کا خیال رکھا۔ نعتیہ شاعری کے حوالے سے اپنا پہلا شعری مجموعہ "مکی مدنی" کے عنوان سے سامنے لائے ایک خوبصورت بات یہ ہے کہ شاعر نے آغاز ہی اس سے کیا۔

دعا تسکین کی سن لے حق احمد مرسل
الٰہی اس کو دیوانہ بنا اپنی محبت کا

اس میں سب سے پہلی نعت ہے "آپ جیسا دو عالم کوئی نہیں" اس پوری نعت کا مرکزی خیال ہے کہ آپ ﷺ سردار الانبیاء ہیں شاعر نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس پوری نعت میں دوسرے انبیاء کرام میں سے کسی کی شان میں بھی تکذیب نہیں کی۔

آپ ہی خواب آدم کی تعبیر ہیں
آپ بھی ابن مریم کی تفسیر ہیں

خواب خوش جمیل کے عنوان سے شاعر نے اسلام کی تاریخ بیان کی ہے کہ کیسے ظلمت کا ابر سارے عرب پر چھایا ہوا تھا اور پھر دعائے ابراہیمی کے نتیجے میں آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔ اور سارے عرب کی کایا پلٹ دی۔

خدا کا ایک اشارہ تھا خواب ابراہیم
کہ جس پہ آپ ہی خم ہو گیا سر تسلیم

بے شک یہ آپ ﷺ کی آمد تھی کہ حق نے باطل کو شکست دی۔

تیرے آنے سے صداقت بھی زمیں پر آئی
تیرے آنے سے شرافت بھی زمیں پر آئی
تیرے آنے سے اخوت بھی زمیں پر آئی
ذرہ ذرہ کی زبانوں سے صدا آئی ہے
ہر طرف تیرے ہی انوار کی رعنائی ہے

حق کی خاطر آپ ﷺ نے بڑی مشکلیں سہیں مگر پھر بھی آپ ثابت قدم رہے۔

پیٹ پر فاقے سے پتھر باندھ لیتے تھے نبی
لطفِ فقر و فاقہ سلطانِ سخا سے پوچھیے

بے شک آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔

چاہنا جو ہے کہ اللہ کی رحمت سمجھے
ذاتِ احمد کے وسیلے کو وہ نعمت سمجھے

بے شک آپ پر لاکھوں درود و سلام ہو۔

" محبوب رب کا جب کہیں بھی سنیں نام آپ۔ تو ان پہ پڑھیئے درود و سلام" بنیادی طور پر نعتیہ مجموعہ ہے۔ تسکین واحدی صاحب نے حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی شان میں بھی اظہار عقیدت پیش کیا ہے۔

مجھ سے علی ہیں اور علی سے ہوں میں سنو
یہ قول مصطفیٰ کا بڑا زردار ہے
شہید ہو کے زمانے کو تازگی بخشی
حسین سرو گلستاں ہیں تازگی کیلئے

اس مجموعہ میں دو عظیم سانحات پر بھی اپنے جذبات قلم بند کئے ہیں بیت المقدس پر صیہونیوں نے جو کئی سالوں سے ناجائز قبضہ جما رکھا ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاعر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے

تمہارے سامنے ہی جل رہا ہے قبلۂ اوّل
تم اپنے صبر کا دیتے رہو گے امتحاں کب تک

مسلم امہ کے ساتھ ہر جگہ ظلم و زیادتی برتی جا رہی ہے ظاہر ہے یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مخالفینِ اسلام مسلمانوں کو روئے زمین سے مٹا دینا چاہتے ہیں ستم بالائے ستم یہ کہ مسلمانوں نے خود اپنی حالت بد سے بدتر کر لی ہے۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو مارنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں ان میں ذرہ برابر اتحاد نہیں اور ان ہی وجوہ کی بنا پر مسلمان اتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں کو انتہا پسندوں نے بابری مسجد کو شہید کر دیا۔

ایسا پھیلایا سیاست نے ہر ایک جانب فسوں
ہند کے مسلم نہ تجھ کو دے سکے اک قطرہ خون
دہر میں لیکن جنوں کا ہوتا ہے بدلہ جنوں
آخری تجھ کو سلام اے بابری مسجد سلام

تسکین واحدی صاحب نے اسّی (۸۰) صفحات کی کتاب میں حمد اور نعت کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

موصولہ منتخب کتب برائے تحریری مطالعہ

رفِ نمو : شعری مجموعہ ، شاعر : علامہ طالب جوہری ، ناشر : ذوالفقار علی شیخ ، رابطہ : سادات سوسائٹی، انچولی، کراچی پاکستان

یاتِ سوز : (حصہ اوّل)، شعری مجموعہ ، شاعر : سوز شاہجہاں پوری ، مقام اشاعت : ادب دوست ، ون اے / ۲۲-۱ے ، ناظم آباد، کراچی ، پاکستان۔

نڈی : افسانوں کا مجموعہ ، کہانی کار : مشرف عالم ذوقی ، رابطہ : تخلیق کار پبلشرز ، ۱۰۷/۹ ، کوچہ دکھنی رائے ، دریا گنج ، نئی دہلی ، ۱۱۰۰۰۲ (بھارت)

یرے حصہ کا زہر : افسانوں کا مجموعہ ، کہانی کار : فیاض رفعت ، رابطہ : معیار پبلی کیشنز ، کے-۳۰۲ ، تاج انکلیو، گیتا کولنی ، دہلی ۱۱۰۰۳۱ (بھارت)

روف : شعری مجموعہ ، شاعر : باسط عظیم ، رابطہ : شہریار پبلیکیشنز ، ۳۵۰ عثمانیہ سوسائٹی ، بی بلاک روڈ ، ناظم آباد ، کراچی ، پاکستان

نہائی کا سفر : کہانیوں کا مجموعہ ، کہانی کار : تصدق سہیل ، رابطہ : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ، اردو بازار ، کراچی ، پاکستان

سافت : شعری مجموعہ ، شاعری : شاہین مفتی ، رابطہ : اساطیر ۳۵-اے ، مزنگ روڈ ، لاہور ، پاکستان۔

پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام : خطوط ، مرتبہ : جاوید وارثی ، رابطہ : بساطِ ادب ، آر-۱۹ بلاک ۲۰ ، فیڈرل بی ایریا ، کراچی ، پاکستان۔

اتھ میں خالی کماں : شعری مجموعہ ، شاعر : محمود رحیم ، رابطہ : فلیٹ نمبر ۹ ، گلی نمبر ۱ بلاک نمبر 1-B ، سیکٹر آئی ایٹ ون ، اسلام آباد ، پاکستان

رنگ سے تصویر تک : شعری مجموعہ ، شاعر : شمیم روش ، رابطہ : ۳۱۲ حنا پیلس ہوشنگ روڈ ، سول لائنز ، کراچی ، پاکستان

تیسرا سفر (तीसरा सफ़र) : ہندی کہانیوں کا مجموعہ ، کہانی کار : حسن جمال ، رابطہ : شیش پرکاش ، پیا نواس کے پاس ، لوہار پورا ، جودھپور ، راجستھان (بھارت)

شہرِ بے اماں : شعری مجموعہ ، شاعرہ : نزہت افتخار ، رابطہ : خالد پبلشرز ، ۲۵۷/۲۵۸ ، تاج سینٹر ، طارق روڈ ، کراچی ، پاکستان

اجنبی ساعتوں کے درمیاں : شعری مجموعہ : شاعر : نعمان شوق ، رابطہ : تخلیق کار پبلشرز ، ۱۰۷/۹ ، کوچہ دکھنی رائے ، دریا گنج ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ، (بھارت)

صحرا کی ہوا : شعری مجموعہ ، شاعر : امتیاز ساغر ، رابطہ : فرید پبلشرز ، روم نمبر ۹ ، نوشین سینٹر ، نیو اردو بازار ، کراچی ، پاکستان

منتخب خطوط

برادرم احمد ہمیش صاحب تسلیم!

تشکیل کا نیا شمارہ کئی مہینے پہلے مل گیا تھا، اس مرتبہ پھر آپ نے تشکیل میں ایک مہابدھ چھیڑ دیا ہے۔ میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ گوپی چند نارنگ کا نام ہمعصر ادب کا ایک بڑا نام ہے ان سے آپ اختلاف تو کر سکتے ہیں مگر ان مسترد نہیں کر سکتے، ساختیات وغیرہ میں بہت کچھ مغرب سے ماخوذ ہے مگر مشرقی شعریات پر ان کا کام عالمانہ مقالہ آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے نارنگ کے افکار و نظریات سے جن لوگوں کے مفادات پر ضرب پہنچی ہے ان کی تلملاہٹ تو فطری ہے مگر اس جھگڑے میں آپ کیوں فریق بنیں (غالب کو برا کہتے ہیں اچھا نہیں کرتے، (تحریف کیلئے معذرت)

والسلام

خاکسار، نامی انصاری

نامی انصاری

کانپور، بھارت

محترم احمد ہمیش صاحب !اسلام و علیکم !

مکر چاندنی " کے متعلق جو میرا تاثر ہے وہ حاضر ہے۔ آپ نے مرقع حیات "مکر چاندنی "میں اپنے آپ کو بڑے حقیقت پسندانہ طور پر پیش کیا ہے "میں "کو آپ نے بے نقاب کرنے میں بڑی جراعت سے کام لیا ہے۔ دوسری جو خاص بات ہے وہ یہ کہ اپنی پوری زبان اور ثقافت "پوربی یوپی اور پوربیا " کو بھرپور طور پر احاطہ بیان میں لا کر اس کی ایک تاریخ مرتب کر دی ہے جو ہمارے آنے والی نسل کے لئے سرمایہ ہے بقول صوفی کبیر ۔ میری بولی پوربی تاہی نہ چیہنے کوئے ۔ میری بولی سو لکھے جو پورب کا ہوئے ۔آپ نے مکر چاندنی میں پوربی زبان یعنی اپنی مادری زبان کا خوب استعمال کیا ہے جیسے ڈھب ری، گوبیٹھا، کجات ، نہار نہار کے، اوسار امہریا ، تر تر دوا گلگلے ، ٹھکوئے وغیرہ۔ جب مکر چاندنی کتابی شکل میں شائع ہو گی تو ایک قومی سرمایہ اور پوربی ثقافت کی ایک تاریخ ہو گی۔ آئندہ آنے والی نسل اس کو حوالہ کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس سلسلہ میں میری تجویز ہے کہ ایسے الفاظ کی تشریح حاشیہ یا فٹ نوٹ پر کر دیں جیسے" ڈھب رلی "مٹی کے تیل کا چراغ یا دیا۔ مگر ڈھب ری اور دیا میں فرق ہے ڈھبری مٹی کا تیل جلتا ہے اور دیا سرسوں کے تیل گھی یا کوئی سے تیل سے جلتا ہے "تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آسانی ہو ۔ ثقافت کے دو جز ہیں، پہلا تمدن اور دوسرا تہذیب د رہن سہن رسم و رواج و اوب کو تمدن اور آداب زندگی ، رواداری رکھ رکھاؤ کو تہذیب کہتے ہیں۔ آپ نے شادی بیاہ

، عقیقہ ختنہ و دیگر تقریبات کے رسم ورواج و میلہ بازار کا موقع محل سے تذکرہ کیا ہے، جس سے اس دور کی سماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے جو پوربی ثقافت کا ایک جزو ہے۔ ان میں سے ایک لفظ "سنوری" کی تشریح کرتا ہوں، جس کا استعمال زچگی کے سلسلہ میں آپ نے کیا ہے۔ "سنوری" اس کمرہ کو کہتے تھے جس مین بچے کی ولادت ہوتی تھی اور اس کمرے سے زچہ وبچہ عقیقہ کے دن تک جس کو چھٹی کہتے تھے، باہر نہیں نکلتے تھے۔ سنوری کے دروازہ پر ہر وقت ایک آدمی بطور پہرہ دار موجود رہتا تھا تاکہ بلی کمرے کے اندر نہ جا سکے۔ بورسی (مٹی کی انگیٹھی) میں اوپلا سلگتا رہتا تھا جس کا ہلکا ہلکا دھواں کمرے کے اندر پھلتا رہتا تھا۔ بچے کے سرہانہ چاقو یا لوہے کی کوئی چیز ہمہ وقت رکھی رہتی تھی۔ کسی مرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی دائی یا جو بھی عورت اندر جاتی وہ ہاتھ پاؤں کو دھو کر اندر جاتی تھی آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اس کو جہالت یا دقیانوسی رسم ورواج کہے گا۔ مگر اس سارے عمل میں حفظانِ صحت وحکمت کا راز ہے، جس کو آج کل کی سائنس بھی تسلیم کرتی ہے جو کچھ کرتے تھے وہ اپنے بزرگوں کے تجربہ کی بنیاد پر کرتے تھے، جو ان کے کے آباو اجداد نسل در نسل کرتے آرہے تھے ان کے پاس، کیوں کیا اور کیسے کا جواب نہ تھا کہ ہمارے آباو اجداد ایسا کرتے تھے اور یہ رسم ورواج تجربہ کی بنیاد پر تھا اب سائنس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بلی کی آنکھ سے ایک مقناطیسی شعاع نکلتی ہے۔ اگر بچے کی نگاہ، بلی کی نظر سے ٹکرا جائے تو بچہ متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے جبڑے بیٹھ جاتے ہیں بچہ ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے بچے کے سرہانے چاقو یا لوہا اس لئے رکھتے تھے کہ بلی کے اس مقناطیسی اثر کو زائل کر دیتا ہے، کمرہ میں دھواں اس وجہ سے رہتا تھا کہ کمرہ میں آلودگی نہ ہو اندر جانے کی ہر کسی کو آنے جانے کی اجازت اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان کے ساتھ جراثیم یا وائرس اندر داخل نہ ہو جائے جس سے زچہ بچہ کی صحت پر اثر انداز نہ ہو ان کو جراثیم ووائرس کا کوئی علم نہ تھا۔ یہ سب تجربہ کی بنیاد پر کرتے تھے آپ نے اچھوانی کا ذکر بھی کیا ہے اچھوانی طاقت کی دواء تھی جو زچہ کو پلایا جاتا تھا تاکہ زچگی میں جو قوت زائل ہو گی وہ پوری ہو جائے جس کا بدل آج کل ڈرپ ہے آپ نے تحریر کیا ہے کہ بچے کا آنول (نال) قینچی سے کاٹتے تھے ایسا نہیں تھا بزرگوں کا تجربہ تھا لوہے سے آنول کاٹنے سے اکثر بچے مر جاتے تھے جراثیم کے متعلق معلومات نہیں تھی، وہ آنول ٹھیکرا یا مٹی کے برتن کے ٹکڑے سے دھو کر کاٹتے تھے جس میں جو جراثیم نہیں جو لوہے میں ہوتے ہیں زمانہ قدیم میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی لہذا یہ سب کچھ تجربہ کی بنیاد پر کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ کی اگر تشریح کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی لہذا ایک لفظ پہ ہی اکتفا کرتا ہوں

خیر اندیش

شبیر احمد انصاری۔ کراچی (پاک)

شبیر احمد انصاری

۱۲ اپریل ۱۹۹۸ء

برادرم احمد ہمیش صاحب

تشکیل کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، شکریہ

تشکیل اپنے مواد اور تیور دونوں اعتبار سے ایک اہم اور منفرد رسالہ ہے آپ تن تنہا اس پر جتنی محنت کرتے ہیں وہ قابل داد بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ ہاں مجھے شمس الرحمن کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ بعض لوگوں کے خلاف مستقل لکھتے رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے پرچے کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ مسائل پر توجہ دیں نہ کہ افراد پر۔ میرے مضمون (مطبوعہ ذہن جدید ۲۳،۲۴) کی آپ نے جو پذیرائی کی ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس سلسلے میں صرف اتنی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میرا مقصد حقائق کو سامنے لانا تھا نہ کہ کسی کی ناک میں نکیل ڈالنا۔

آپ کا

فیصل جعفری۔ بمبئی (بھارت)

فیصل جعفری

برادرم احمد ہمیش صاحب!

آداب، تشکیل کے لئے شکر گزار ہوں آپ کا رسالہ بہت دلچسپ ہے اور بہت منفرد۔ اس سے آپ کی محنت اور سلیقے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ آپ کی نثر و نظم کی طرح تشکیل کا انداز بھی سب سے الگ ہے۔ حسن جمال صاحب کو بھی خط لکھ رہا ہوں آپ کا رسالہ انہی کی وساطت سے وصول ہوا۔

شمیم حنفی۔ نئی دھلی۔ (بھارت)

برادرم احمد ہمیش!

تشکیل بھی شاک انگیز استعارہ ثابت ہو اور یہ استعارے کے تکلف کی بھی کیا ضرورت ہے شاک انگیز ہی کافی ہے شاک انگیز میرے لئے نہیں بلکہ اور لوگوں کے لئے۔ میں نے ساجدہ زیدی صاحبہ کا تانیثی تنقید شوق سے پڑھا۔ ان دنوں تنقید میں نئی اصطلاحات متعارف کرائی جاری ہیں ان میں تانیثی تنقید بھی شامل ہے اس ضمن میں پیش کیے گئے تمام فکری نفسیاتی اور عمرانی دلائل کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ کیونکہ مرد عورت نہیں اسلئے وہ عورت کے باطن جسمانی عوامل اور نفسی کیفیات کی درست تفہیم اور عورت کی شاعری فکشن میں درست عکاسی پر قادر نہیں لہذا گھائل کی گت گھائل جانے

کے مصداق صرف عورت ہی عورت کو درست طریقے پر پینٹ کر سکتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مرد بھی کسی دوسرے مرد کے باطن کو درست طور سے سمجھ سکتا ہے؟ چلئے دوسرے مرد کو تو چھوڑیئے کیا خود ایک مرد (اور عورت بھی) صحیح طور پر اپنا باطن مشاہدہ کرنے کا قابل ہو سکتا ہے اس ضمن میں اگر لاشعور، تحت الشعور اور اجتماعی لاشعور کی تخلیق پر اثر انداز ی بحث چھیڑ دی جائے تو بات اور بھی گہری اور پیچیدہ ہو جاتی ہے جبکہ خود کار تحریر اور خود کار مصوری ذہن و اعصاب کی ادھوری کہانی سناتی ہیں۔ عورت مرد کی نوع کی polarity تخلیقی لحاظ سے نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سود مند اگر اسی طرز استدلال کو اس کی منطقی انتہا تک لے جائیں تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ عشق کا احوال قلم بند کرنے کیلئے مریض کی کیفیت بیان کرنے کیلئے خود بھی مریض ہو، یتیم کا درد بیان کرنے کیلئے یتیم ہو جاؤ، پاگل پن کی عکاسی کیلئے پاگل بن جاؤ اور خود کشی کی منظر نگاری کیلئے خود کشی کر لو۔

مخلص

سلیم اختر لاہور (پاک)

برادرم و محترم! اسلام علیکم!

تشکیل کا نیا شمارہ مل گیا تھا۔ افسانوں میں الیاس پھرپازی لے گیا، چوہڑا، یہ لفظ معنی کے لحاظ سے جس سطح پر آدمی کو لے جاتا ہے۔ اگر اس کے پس منظر کا مطالعہ کیا جائے۔ کہ جو کچھ ہے اسے جانتے ہیں، یہ تو ہماری اپنی زندگی ہے بلکہ ہمارا عکس تو اس لفظ کو بھی شرما دیتا ہے، ہندو قصائی کا رہن سہن، مکالموں کی ادائیگی، اور ماحول کی گھٹن اور گھٹن جب اندر سے منظر بہ منظر سامنے آتی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کار خود ہی اس ماحول کا جزو ہے اور اس زیادہ کامیابی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہم کہانی پڑھتے جاتے ہیں اور اس میں اپنے وجود کو ڈبوتے چلے جاتے ہیں۔ ہر کردار کی کردار نگاری کمال کی ہے اور قاری آخر میں جس شدت سے چوہڑے کے مفہوم تک پہنچتا ہے وہ ستم کیش بھی ہے اور درد ناک بھی، برزخ 'کہانی کا کینوس جو نقطے اور لکیریں ابھاتا ہے وہ آج کی مادہ پرست زندگی کو جابرانہ بندشوں سے بھی زیادہ عبرت ناک بنا دیتا ہے۔ کینسر' استادانہ 'ٹریٹمنٹ' کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بے چارگی کے ساتھ لمحات کے کرب کو گننے والی لڑکی کا لیہ خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ شجر سنگ بار، بجتی کا حق اور ڈاکٹر صاحب کا انداز بیاں کلاسک کے ساتھ جدیدیت کی مسحور کن جھلک اور مسلک کی پرزور نمائندگی اور انجام کو فن کارانہ طریقہ سے یوں پیش کیا ہے کہ قاری اپنے ہی زخم گننے کے وہم کا شکار ہو جاتا ہے مگیتر بہت کم الفاظ میں شیخ صاحب نے محبت کو جو مفہوم بخشا ہے وہ وصل کی راحت نہیں بلکہ کرب کا ان چاہا تحفہ ہے، اور پوری چابک دستی سے جذبوں کی آنکھ مچولی پس منظر سے نکال کر منظر کا حسن بنا دیا ہے۔ نوری لمحہ۔ اپنی پہچان کے درد ملے لمحوں میں چھپی ہوئی، بے چہرگی کا المیہ اور اس سفر کو نہایت ہوش مندی سے

متعارف کرا کر اپنی پہچان کے منور نقوش کو گزرتے لمحوں کی گرفت سے آزاد کرانے کا فن کارانہ اظہار۔ ایک کہانی مٹتی ہوئی اقلیت کے ساتھ! اپنی اور چاچا فتح احمد کی پہچان کا سراغ لگانے کی جستجو، تہذیبی عناصر کی شکست و ریخت میں ہجرت کی المناکی۔ ہابیل و قابیل، طنز کے کھردرے پن کی شدت کے ساتھ سچائی کا بے رحمانہ اظہار بائبل کے متعلق سنی ہوئی، پڑھی ہوئی (مگر عمل سے جداگانہ) حکمت یعنی محبت خدا ہے۔ کے متعلق عالمانہ تحویل، اور اس قبیل کے نئے روپ پہ گہری تشویش مطالعہ کے لئے گھمبیر افسانہ ہے اور مشاہدہ کی گیرائی بھی ہے۔ بجز عہد کا آدمی، ناآسودگی کے بڑے گہرے ہوتے ہیں اور جسے 'تونس' کی بیماری لاحق ہو جائے تو سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت کے باوجود آدمی ہریالی اوڑھنے کی تگ و دو کرتا ہے اور گزرتے لمحوں کا المیہ بن جاتا ہے، ایک کہانی۔ دبی ہوئی حسرتوں کو چنگاری جب الاؤ بن جاتی ہے تو خواہشوں کی بے رحمی کی مار کھائی ہوئی عورت اپنے ہی آشوب میں ڈوب جاتی ہے۔ کھرے لہجہ کی مسحور کن کہانی۔ کہانی ایک سنگل کی۔ ایک فضول سی لڑکی، ہمارے معاشرے کی سڑاند، ہمارے اندر کی کالک اور ہمارے روز و شب کا آئینہ، اور پھر یہ آئینہ یوں بھرپور خلوص کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ آنسو اندر ہی اندر ٹپکنے لگتے ہیں۔ ہر کہانی موضوعاتی طور پر انفرادیت کی حامل ہے اور آپ کی پرکھ بھی قابلِ داد ہے۔ پردہ اٹھتا ہے میں سبھی لوگ گھبرا گھبرا کر الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض بڑے لوگ تو خود میں جرات نہیں پاتے اور شاگردوں کو پردہ اٹھنے کا منظر دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب ان میں سے کوئی اپنا نام یہاں نہیں پاتا تو سکھ کا سانس لیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، نظمیں بھی افسانوں کی طرح انفرادیت لئے ہوئے ہیں اور مفہوم کے لحاظ سے اندر کی گہرائیوں تک کو متاثر کرتی ہیں۔ منظر سے منظر تک، تاریک آنگن، زندگی زندگی، لاس اینجلس ایرپورٹ، اندھے غار کا سفر، لواس رونقیں، سازش، اور سب نظمیں کاسۂ دل افادیت کے زمرے میں آتی ہیں تنقید کا حصہ بھی جاندار ہے اور معیار کے لحاظ سے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، باقی رہا وہ لوگ جن کا ظاہر باطن آپ کے سامنے ہے تو وہ تو کڑھتے ہی رہتے ہوں گے۔

خلوص

آثم مرزا (سیالکوٹ۔ پاک)

محترمی مکرمی جناب احمد ہمیش!

سلام مسنون۔ خیریت موجود و خیریت مطلوب!!

'تشکیل' میر پور آزاد کشمیر سے ہوتا ہوا نصیر احمد ناصر کے ہاتھوں میں ترازو ہو کر میرے ہاتھوں تک آتے آتے تیر اور کمان ہو گیا ہے! شکریہ۔ 'تشکیل' ہر مرتبہ نئی اٹھان، شان اور مان سے ظہور میں آتا ہے۔ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محترم

اجلا ہمیش کا بھی خاص ہاتھ نظر آتا ہے آپ کی "مگر چاندنی" واقعی ایک خاصے کی چیز ہے، آپ کے ادارئیے اور دوسری تحریریں اور اُنکی زبان گرچہ بادی النظر میں تلخ ہے مگر حقیقت کا کیا کیا جائے کہ ہوتی ہی تلخ ہے۔ ہاں خوابوں کی اور بات ہے جو سہانے بھی ہوتے ہیں اور میٹھے بھی مگر ان کی تعبیریں بڑی بھیانک ہوتی ہیں، چند (Exceptions) مستثنیٰ کے سوا۔ اپنے جریدے میں آپ غیروں کو (جو ہیں تو اپنے ہی) حرکات و سکنات پر سے پردہ اٹھاتے ہیں (جو وہ رے جو کم سے پردے میں رکھنے کی سعی کرتے ہیں) تو انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا ہے، کہ یہ آدمی کس قسم کے اور کس مٹی سے بنے ہیں کہ اپنی مٹی کو بے عزت کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتے اور وہ بھی صرف اپنی ذاتی منفعت اور شہرت کیلئے جو چند روزہ ہے فقط آنی جانی ہے، شاید ان کیلئے غیرت آنی جانی شے ہے اور یوں اس کے جانے میں بھلا ان کا کیا جاتا ہے

مخلص

دل نواز دل (لاہور (پاک)

دل نواز دل

اچھے تاج میاں، احمد ہمیش

سلام و خلوص

پہلے تو تشکیل کا مطالعہ کیا، اداریہ ' تخلیقی وجود امر ہے ' خاصے کی چیز ہے۔ آج کے دور میں آپ کا یہ کہنا 'غیر تخلیقی وجود کا کائنات میں کوئی حصہ نہیں وہ خالق کائنات کی صفات سے معتبر نہیں اس لئے وہ دنیا میں جنم نہیں لیتا۔ دنیا اسے جبراً جنم دلواتی ہے، پورے شمارے کی جان ہے۔ اس کی تفصیل تو طویل ہے مگر آپ کے اداریے یہ یقین تو دلاتے ہیں کہ ہر دور میں ابراہیم کا گرز بتوں کو توڑنے کا کام کرتا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ علی گڑھ میں شہریار صاحب نے نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی کا میل کروادیا' گلے ملے اور گلہ جاتا رہا' اس میں شک نہیں کہ ادبی استحصال بڑھ رہا ہے ہر شخص کی اپنی لابی ہے اور بیا ہر والوں کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہے میں ہندوستان ہی میں اس بدعت کو سمجھتی تھی مگر معلوم ہوا کہ یہ وہاں بھی ہے۔ خواتین قلم کاروں کو تو دری طرح نظر انداز کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ نہ تو اپنے حق کیلئے میدان میں اسطرح گھن گرج کر آتی ہیں اور نہ کسی لابی سے ان کا تعلق ہوتا ہے ایک ' دو مرد بن کر گھس بیٹھ کرتی ہیں تو کچھ بچا کھچا ان کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے آپ بہادری سے میدان میں آئے ہیں اور بالحاظ تذکیر و تانیث تخلیقی وجود کی برتری اور غیر تخلیقی وجود کی مکاریوں سے واقف کرانے کا کام شروع کر دیا ہے مگر میرا ایک مشورہ ہے کہ اس میں کسی ذات سے الجھئے بلکہ اس فلسفہ اور اس استحصال کے خلاف لکھئے شمس کنول نے یہی کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وہ آواز جو ہر طرف ایک دم گونجی تھی اور پسند کی جا

نے لگی تھی سمٹنے لگی اور پھر گنبد کی صدا ہو گئی جس کی بازگشت تنہائی میں گونجتی رہی اور وہ خود مایوسی کا شکار ہو گئے وہ قلم جو
سروں کو حق دلوا سکتا تھا خود اپنے حقوق سے محروم ہو گیا، آپ اس صحت مند نظریے کو لے کر بانگ دہل یہ اعلان کیجئے
میں تخلیقی وجود کو زندہ کرنے کا کام کروں گا، آپ دیکھئے کتنی جلد آپ کے چاروں طرف ہمنواؤں کا ایک سمندر ہو گا اور قلم
مضبوط ہو جائے گا اور پھر وہ لوگ جو مشاعروں سمیناروں ریڈیو اور ٹی وی، غیر ملکی دوروں اور من تراحاجی بگوئیم تو مراحاجی بگو
کے تحت شہرت کے بام پر کھڑے ہو کر تخلیقی وجود کا تمسخر اڑاتے ہیں خود بخود فیڈ آؤٹ ہوتے چلے جائیں گے۔ اسلئے کہ بڑا
ی طبقہ ان سے نالاں تو ہے ہی ہے۔ آج ایسی چیزوں کی ضرورت ہے، ورنہ زمانہ تو صرف جی حضوری کا رہ گیا ہے سچے قلم
نے اپنا مان خود توڑ دیا،

شہناز کنول، علی گڑھ (بھارت)

جناب احمد ہمیش!

آپ نے اپنے اداریے میں ادب، سائنس فلسفے اور تاریخ کی رُو سے تخلیقی اور غیر تخلیقی وجود پر جس گہرائی اور تخلیقی ربط کے ساتھ گفتگو کی ہے وہ منطق کے طالب علم کیلئے کسی مستند مقالے سے کم نہیں۔ آپ نے نہایت جامع اور مدلل خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طرح بادشاہوں کے غیر تخلیقی وجود نے شاعری، مصوری اور موسیقی کے بیشتر تخلیقی وجود کو نیم ورک کا حصہ بنا کر ضائع کر دیا ہے۔ تشکیل میں احمد ہمیش کے نام رفیق سندیلوی کا ایک خط خاص طور پر قابل ذکر ہے جو انھی کی ہینڈ رائٹنگ میں شائع کیا گیا ہے۔ آپ نے اچھا کیا جو ثمینہ راجہ سے ملاقات کرنے ہوٹل نہیں گئے۔ عابد سہیل کی سلسلہ وار کہانی 'ایک محبت کی کہانی' بہت ہی تجرباتی، ماڈرن اور خوبصورت تحریر ہے کہانیوں کے ہی حصے میں خشونت سنگھ کی 'دست درازی' جس نفسیاتی باریکی سے ایک خاص کردار کو خالصا فن کارانہ مت کے ساتھ کہانی میں ڈھالی ہے، اسی شمارے میں ڈاکٹر انور سجاد کی تخلیق 'کیفر' ان کے بیک وقت دلچسپ اور ادیب ہونے کی نمائندہ کاوش اردو افسانے کی اہم کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر کی کہانی 'شجر سنگ بار' بھی تجرید علامت اور تجربے کا تھوڑا اظہار جھوٹا کا ہے، (بدن میں اجنبی) موضوع اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے اچھوتی کہانی ہے، مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ ڈاکٹر مختار الدین احمد کی گفتگو بہت معلوماتی اور دلچسپ ادبی اضافہ ہے، محمد الیاس کی کہانی (چوبترا) بہت نمایاں اور اہم کہانی ہے، انیس رفیع کی (ملنگ باباؤں کی پکنک) شہناز کنول کی (نوری لمحہ) یوسف عارفی کی (ایک کہانی ملتی ہوئی اقلیت کیلئے) آغا گل کی (ہابیل و قابیل) تاج الدین تاجور کی (نجر عہد کا آدمی) برجیس صدیقی کی (کہانی ایک سگنل کی) اور مریم سیال کی

(برزخ) رشید حواری کی (معجزہ) جدید افسانے کے میدان میں اپنی اپنی جیر تیں سمیٹے ہوئے قاری کو ایک بار چونکاتی ضرور ہیں تشکیل میں ہی احمد ہمیش کی خود نوشت سوانح مگر چاندنی کا سلسلہ اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں زندگی اور سچائی کا براہ راست تجربہ نہ صرف یہ کہ دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، نثر کے علاوہ شاعری کے حصے میں بھی حنیف اسعدی، ساجدہ زیدی، ستیہ پال آنند، عبدالرحمٰن صدیقی، نصیر احمد ناصر، زاہدہ زیدی، جلیل عالی، انور ضیائی، سلیم انصاری کی نظم، یہ وقت کیا ہے نجمہ محمود کی مدر گوڈلیس افتخار نسیم کی لاس اینجلس ائرپورٹ پر، جدید رجحانات اور خالص تخلیقی کیفیات کی نمائندہ تخلیقات ہیں، انجلا کا تحریری مطالعہ بھی جو نگار سجاد ظہیر کی کہانیوں کے مجموعہ (دستِ قاتل) پر۔ ایک اچھی کاوش ہے۔

والسلام

عرفان احمد عرفی (اسلام آباد)

عرفی

از لندن

۱۸ اگست ۹۸ء

محترمی احمد ہمیش صاحب اسلام علیکم۔

تشکیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہر شمارہ میں بڑے غور سے پڑھتی ہوں کیونکہ یہ دوسرے عام جریدوں سے قطعی مختلف ہے اس کا انداز قطعی جدا ہے اور فکر بھی مشہور ممتاز تخلیق کاروں کے نام اور ان کی تحریریں مجھ جیسے مبتدی کے لئے بے حد اہم اور گراں قدر قیمت رکھتی ہیں آپ قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں مختلف زاویہ نگاہ سے زندگی کو دیکھنے پر اکساتے ہیں اور ذوقِ تجسس کو ہوا دیتے ہیں، تشکیل میں ہونے والے ادبی حث و مباحثے ہمارے قلب و ذہن کے جمود کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں آپ لوگوں کے علم و فن سے ہمیں بھی مستفید ہونے کا موقع مل جاتا ہے زبان اور ادب کے لئے یہ بڑی خدمت ہے۔ تشکیل کے جامع مضامین ہمیں برصغیر کے عصرِ حاضر کے ادبی فکری رجحانات سے باخبر رکھتا ہے 'خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'۔ آپ بس ادیب، نقاد اور دانشور حضرات کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کی کثرت دیکھ کر ہمارا دل بیٹھ جاتا ہے مثلاً میں نے گذشتہ شمارے میں ساجدہ زیدی کا مضمون پڑھنا شروع کیا تو بہت مسرت ہوئی کہ ایک خاتون ایسی ہیں جنہیں اپنے مضمون میں انگریزی کے استعمال کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی مگر دوسرا صفحہ پلٹتے ہی یہ خوشی خاک میں مل گئی۔ آپ لوگوں کی تحریریں تخلیقات تو ہمارے لئے مشعل کی مانند ہیں، آپ سے ہم زبان نہ صرف سیکھتے ہیں بلکہ ہمیں اس کو زندہ رکھنے میں مدد ملتی ہے، اس سے ہماری ذہنی آبیاری

بان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور یہاں ہم اردو لکھنے والے اس جدو جہد میں رہتے ہیں کہ ہماری تحریروں میں جب تک بے
ضروری نہ ہو انگریزی کے الفاظ نہ شامل ہوں۔ ہمارے افسانے کے کردار انگریزی بول سکتے ہیں ہم نہیں، ہندوستان و
ن میں انگریزی کے جابجا استعمال سے اردو کی شکل بگڑتی جارہی ہے کچھ لوگ انگریزی کے استعمال کو جائز قرار دینے کے
اردو کی تنگ دامانی کا شکوہ کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ اس سے باخبر ہیں کہ یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں۔ اسی طرح میں
یہاں اخبار میں احمد فراز کا انٹرویو پڑھا تھا انھوں نے اس میں فرمایا تھا کہ بھی اردو زبان مکمل نہیں ہوئی ہے ابھی اس
کل (یعنی آنے والا کل) اور گزرے ہوئے دن کے لئے بھی کل ایک ہی لفظ ہے، اگر یہی بات ہے تو ابھی انگریزی زبان
بھی بہت سی خامیاں ہیں، مثلاً میں نے ایسی کہانیاں پڑھی ہیں۔ جس میں شروع سے آخر تک یہ نہیں پتہ چلتا کہ کہانی
مرد کون ہے اور عورت کون۔ ان کے یہاں جب تک شی یا ہی نہ استعمال ہو۔ مذکر مونث کا پتہ نہیں چلتا نہ بوے
وٹے کا پتہ چلتا ہے، جیفری آرچر کی ایک کہانی ہے اس میں آپ بظاہر کسی لڑکی کا احوال پڑھتے ہیں اور آخر میں پتہ چلتا ہے
مصنف ایک بلی کی بات کررہا ہے، بات طوالت پکڑ رہی ہے اس لئے ختم کرتی ہوں بہر کیف یہ سب کچھ لکھنے کے بعد میں
جراءت پر معذرت خواہ ہوں 'روئے سخن کسی کی طرف ہو تو' سب کو میرا سلام

طالب خیر

صفیہ صدیقی (لندن)

صفیہ

محترم احمد ہمیش صاحب!

سلام مسنون!

تشکیل موصول ہوا آپ کے اداریے میں یہ جملہ معنی خیز ہے کہ تخلیقی وجود کبھی مرتا نہیں بلکہ زندگی میں بدل
تا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تخلیقی وجود کے ساتھ غیر تخلیقی وجود بھی متوازی طور پر شامل سفر رہتا ہے، جو غیر اہم ہوتے
ہوئے بھی تخلیقی وجود کو روشن کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ 'پردہ اٹھتا ہے کے تحت آپ نے بے لاگ باتیں کی
ں۔ آپ کی خود نوشت سوانح زیادہ دلچسپ ہوتی جارہی ہے، حیدر جعفری سید نے خوشونت سنگھ کی کہانی کا عمدہ ترجمہ کیا
ہے، عابد سہیل، انور سجاد، آثم مرزا، منصور الٰہی شیخ، شہناز کنول اور مریم سیال کی کہانیاں مجھے اچھی لگیں۔ نظموں میں
جدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ستیہ پال آنند اور عشرت ظفر کی نظمیں اپنے وسیع تخلیقی کینوس کے سبب متاثر کرتی ہیں نصیر
مد ناصر کی نظمیں خوب ہیں ستیہ پال آنند کا مضمون نصیر احمد ناصر کی نظموں کے تخلیقی عمل کے کئی پہلوؤں کو منور کرتا
ہے، غزلوں میں صابر ظفر، رفیق سندھلوی، عباس حیدر زیدی، عبدالرحمٰن صدیقی اور کاوش عباسی متاثر کرتے ہیں، حمد

تنقید بھرپور اور جامع ہے، تحریری مطالعے میں مشرف عالم ذوقی کے ناول بیان پر انجلا ہمیش اور فیاض رفعت کے شعری مجموعے پر احمد ہمیش کی تحریریں بے باک اور غیر جانبدار ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے میں آپ نے ادارتی موقف کے تحت بے حد مناسب اور بے باک جوابات دیئے ہیں۔ آپ کے یہاں نئے تخلیق کاروں کی تلاش وشناخت کے باب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے بکر چاندنی ۴ کے مطالعے سے ذہن ودل پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ آپ کی نثر شگفتہ، رواں دواں اور تخلیقی، تنقیدی صداقتوں سے بھرپور ہے، مرقع ذات ۲ سے موجودہ ادب کے وسیع افق پر تیزی سے ابھرتے ہوئے جدید شعری منظر ناموں کی ترسیل و تفہیم کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ خصوصاً نصیر احمد ناصر کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے آپ کی یہ رائے کہ 'ناصر کے خواب مسلسل کو معمولی استعارہ سمجھ لینا اس عہد کی سب سے بڑی شعری نارسائی اور ادبی بددیانتی ہوگی' بے حد معنی خیز ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آپ نے تشکیل کے حوالے سے ایک نئی ادبی نسل کو دریافت کرنے کا اہم کام کیا ہے، تازہ شمارے میں ساجدہ زیدی، ناہی انصاری، صابر ظفر، رفیق سندیلوی عباس حیدر زیدی، فوزیہ ردا، نعمان شوق اور کوثر مظہری وغیرہ کی غزلیں متاثر کرتی ہیں اس کے علاوہ اختر یوسف، فیاض رفعت، نصیر احمد ناصر، ماہ طلعت زاہدی، علی محمد فرشی سلیم شہزاد ابرار احمد، ظہیر غازیپوری، ناجیہ احمد، سحر علی اور سعدیہ طفیل وغیرہ کی نظمیں تخلیقیت افروز شعری رویوں کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مشرف عالم ذوقی، مظہر الزماں خاں عابد سہیل، احمد کمال اور ساجدہ عندلیب رحمان کی کہانیاں اچھی ہیں علی محمد فرشی کی کتاب 'تیز ہوائیں جنگل مجھے بلاتا ہے' پر ستیہ پال آنند کی تحریر شاعری کے بدلتے ہوئے تیور اور نئے فکری رویوں کو سمجھنے میں معاون ہے، تشکیل کی طویل عمر کے لئے دعا گو ہوں

آپ کا
سلیم انصاری

جبلپور (بھارت)

محترمی احمد ہمیش صاحب

سلام ونیاز!

زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ اتنے ہی آرام سے جتنے آرام سے زندگی کو گزرنا چاہیے کہ اچانک الیاس صاحب کے پاس تشکیل کے ایک شمارے (۲۵، ۲۶، ۲۷) سے آمنا سامنا ہو گیا، میں وقت گزارنے کے لئے کبھی کبھی کچھ پڑھ لیتا ہوں طلسم ہوشربا، الف لیلی، آرائش محفل، قصہ چہار درویش یا تو تاکہانی وغیرہ۔ وجہ صاف ظاہر ہے اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے ہم جیسوں کی زندگی کی بقا تو زندگی سے فرار میں ہی مضمر ہے اب آپ خود ہی سوچیے کہ ایک ایسے آدمی

کا سامنا تشکیل جیسے آتش فشاں سے ہو جائے اور وہ بھی Active حالت میں تو اس بے چارے پر کیا گزرے گی؟ آج آٹھ
دس روز ہو چکے کہ میں اس زلزلے کی کیفیت سے باہر نہ آسکا، ایک عام سا آدمی جو معمول کی گزر بسر کر رہا ہو۔ چپ چاپ
دھکی چھپی خاموش اور پر سکون سی، جس کی ذات کا تخلیقی عنصر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مدارج کی طرح ست رو اور
دھیما ہو اسے آپ اگر کچی زمین پر باندھ کر لٹا دیں۔ اس کی پیٹھ کے نیچے بانس کا بیج بو دیں، جو بہت ہی کم وقت میں اس کے
جسم کو چیر پھاڑ کر آر پار ہو جائے تو اس بے چارے کے کرب کا اور اس کی اذیت کا اندازہ۔ تخلیقی وجود امر ہے۔ ادبی سماجیات
کے لال بجھکڑ، چوہا دوڑ، گدھ اور ناگ کی مشترکہ سرشت، ہما ہے عیش اور تعلیم مافیا جیسی زہریلی نوکیلی اور جان لیوا
نیزے کی انیاں ڈھالنے والا بھلا کیسے لگا سکتا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ آپ نے اپنے اداریے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سچ ہے
، سچائی سے سچائی تک پہنچنے کا عمل ہے۔ ایک تو وہ سچائی ہے جو سامنے بلاتردد نظر آتی ہے ایک ذرا غور سے دیکھنے پر دکھائی
پڑتی ہے اور ایک وہ جو خیالوں، سوچوں اور جذبوں کی مٹی کو چھان چھان کر ملتی ہے قاری لکھنے والے کے لفظوں کے پیکر
میں اپنے من پسند چہرے تلاش کرتا یا قیاس کرتا ہے الفاظ کے دلوں میں جنم لینے والی ہلچل اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرتی ہے
یہ آپ نے کیا کر دیا؟ کیوں کر دیا؟ سچائی کے کسی بھی روپ کو نہیں بخشا!! ابھی کچھ کہہ دیا۔ میں گزشتہ آٹھ دس روز سے آپ
کے اداریے سے آگے جا ہی نہیں سکا آبلہ پائی کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا زندگی جب اپنے وجود میں ہی خارزار ہو تو بھلا آدمی
خود دشت و بیاباں میں خار مغیلاں کی تلاش کیوں کرے؟ اس بات کا علم مجھ جیسے عام قاری کو ہے کہ وہ تمام اکابرین ادب
جن کے ذکر خیر کی 'خوشبو سے آپ نے اپنے ہول جیسے اداریے کو معطر کرنے کی کوشش کی ہے اب اپنے تخلیقی وجود میں
حیات ہیں یا فوت ہو چکے ہیں۔ جو لوگ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت اپنی زندگی میں ہی اپنے کلیات شائع کر کے دے چکے
ہیں۔ آپ ان کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اتنے مشکوک کیوں ہیں؟ آپ کی تحریروں سے اور آپ کے نام سے یہ
شائبہ ہوتا ہے کہ آپ مسلمان ہیں 'احمد ہمیش!' آپ کو یہ علم ہونا چاہیے کہ مردوں کو چھیڑنا ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔
آخر آپ اس سوئے ہوئے مردہ پرست معاشرے میں تخلیق کی برقی رو کیوں دوڑانا چاہتے ہیں؟ کسی کو اگر اپنے چھوٹے پن کا
احساس 'انسان عظیم ہے خدایا' کہنے پر مجبور کرتا ہے تو آپ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ کوئی اگر صوفی ادیب یا ادبی صوفی
کہلوانا چاہتا ہے یا کسی کو اگر Medical Treatment نہیں آتا اور وہ ادب کو Treatment دینا چاہتا ہے۔ اپنے
illusions کے ذریعے ہی سہی تو آپ کو پریشانی کیوں لاحق ہوتی ہے؟ منیر نیازی لاہور میں میرے محلے دار ہیں اور یہ
میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر آپ انھیں دور سے دیکھیں تو Oil painting کی طرح بہت خوبصورت لگتے ہیں حمایت علی
شاعر' احمد فراز، افتخار عارف، امجد اسلام امجد اور ان جیسے ادب کے دیگر ڈائنوسارز کی خوش نما اور خوبصورت قامت کو اور
ان کی جیوراسک پارک جیسی publicity اور آمدن کو آپ جیسا کراچی کے صحرا کا Cactus کیسے اپنے اور اک میں
لا سکتا ہے؟ اداریے سے جانبر ہو گیا تو انشاءاللہ 'فکر چاندنی' اور دیگر تخلیقات کے بارے میں آپ سے رابطہ کروں گا۔ فی الحال

تو یہی خواہش ہے کہ آپ لکھتے رہیے لکھتے رہیئے خود بھی بے چین رہیے اور ہمیں بے چین رکھئے ادب کے آشفتہ سروں کو انتظار کرنے دیجئے کہ وقت سے پہلے صور اسرافیل پھونکنے والے کے بارے میں علمائے دین کیا فتوی صادر فرماتے ہیں۔ اللہ آپ کی عمر آپ کی کہانیوں اور اداریوں کی عمر جتنی کرے آمین

والسلام

حسن جعفری (میرپور آزاد کشمیر)

حسن جعفری

برادرم احمد ہمیش، سلام و نیاز

شمارہ بابت اپریل تا دسمبر ۹۷ء نظر نواز ہوا، ادارتی موقف سے ہر باشعور شاعر و ادیب اور قاری کو اتفاق کرنا چاہیے آپ نے ادبی سماجیات کے لال بجھکڑوں کی نشاندہی کی ہے۔ بالخصوص چوہادوڑ میں شامل افراد کے چہروں کو بے نقاب کیا عہد حاضر میں ادبی مافیا نے اسطرح اجارہ داری قائم کر لی ہے کہ گدھے اور گھوڑے کا فرق ختم ہوتا نظر آرہا ہے، رفیق سندیلوی علی محمد فرشی اور عبید اللہ علیم (مرحوم) نے اپنے فن کو اپنی ذات تک محدود رکھا یہ حضرات بیجا نمائش اور تصنع سے دور رہے ہیں انہوں نے کبھی بھی کسی دربار میں حاضری نہیں دی پنج ستارہ ہوٹلوں سے وہ دور رہے۔ کہانی کا حصہ بہت متاثر کرتا ہے جن کے خالق محمد الیاس، مقصود الہی شیخ اور مریم سیال، برجیس صدیقی ہیں۔ یہاں پر خاص طور پر محمد الیاس کی کہانی (چوہڑا) کا ذکر کروں گا جس میں انہوں نے ہندو قصائی کے کردار کی نفسیاتی تہوں کو ادھیڑ کر اس کا چہرہ دکھایا ہے۔ آپ نے نگر چاندنی کی پانچویں قسط میں اپنے شاعرانہ رویوں کو منعکس کیا ہے اسطرح آپ کی شخصیت میں رچا بسا شاعر اور کہانی کار سامنے آتا ہے۔ جو اپنی نفسیاتی گرہیں کھولتا ہے جنکی بنیاد احساس جمال پر ہے اور یہ احساس ہر شخص میں نہیں ہوتا ہے۔ ساجدہ زیدی کی نظم سفر کے آخری لمحوں کا اشارہ کر کے زندگی کی نامیاتی کیفیتوں کی نشاندہی کرتی ہے نصیر احمد ناصر کی دونوں ہشت پہلو نظمیں جذبوں کی وجودی کیفیات ظاہر کرتی ہیں۔ پہلی نظم میں گزرتے ہوئے وقت کا احساس ہے دوسری نظم جسے وہ آخری نظم کہتے ہیں اس میں انہوں نے علامتی طور پر دائروں اور لکیروں کو لابدیت کے تناظر میں انتہا پر لا کر وقت کے سیل رواں میں چھوڑ دیا ہے اس شمارے کا انگریزی حصہ جاندار ہے فیاض رفعت اور افتخار نسیم کی نظمیں تاثر سے بھرپور ہیں۔

عشرت رومانی

کراچی

جناب احمد ہمیش صاحب تسلیم!

آپ کا خط تشکیل کے تین نسخوں کے ساتھ موصول ہوا، آپ کا رسالہ بلا شبہ دلچسپ ہوتا ہے
ر ادبی جواہر سے مالامال، منتخب خطوط کے تحت جو خط شامل کیے جاتے ہیں وہ اپنے اندر معلومات کا خزینہ رکھتے ہیں۔

آپ کا

حبیب الرحمٰن چغانی

پٹنہ (بھارت)

مائی ڈیئر! احمد ہمیش سلام علیکم!!

مذکورہ شمارہ تمہاری محنت اور انفرادیت کی علامت ہے، اداریہ (تخلیقی وجود امر ہے) آئینہ کی طرح شفاف اور سچائی
پہ ہے ہمارے یہاں .... ادب میں کن فیوژن پھیلانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے ہیں لیکن انہیں ان کی
اوقات بتادی گئی ہے مابعد جدیدیت کے چکر میں بہیترے لوگ اپنی بابت خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کے 'عذاب بے چہرگی'
میں مبتلا ہو گئے۔ بھائی Genuine ادب کب پرانا ہوتا ہے 'ایمان داری سے لکھنے اور پڑھنے کے کام جاری رکھنے چاہیں،
تازہ بہ تازہ نو بہ نو کی تلاش جاری رہنی چاہیے معاشرتی حالات وغیرہ تو بدلتے رہتے ہیں کب نہیں بدلتے۔ Genuine
فنکار تو تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتا ہے کہ ان سے اس کی ذات کے نہاں خانوں کے مزید روزن وا ہوتے ہیں اور اظہار ذات
کیلئے بیش قیمت مواقع ملتے ہیں بہر حال ہم ادب میں کسی بھی قسم کے سیاسی یا نیم سیاسی منشور کے قائل نہیں، ویسے ادب
سیاسی حالات سے بھی متاثر ہوتا ہے، لیکن وہ ہر حال میں اپنی شریعت کے دائرے میں رہتا ہے، مگر چاندنی کا سلسلہ خوب
ہے تم اسے بڑی دلجمعی سے لکھ رہے ہو۔ نصیر احمد ناصر کی نظمیں اُردو کی نظم نگاری میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں ایک
مخصوص خود اعتمادی اور جمالیاتی جہت کی آئینہ داری کرتی ہیں نگار سجاد ظہیر اور ذوقی کے ناول (دست قاتل) اور (بیان) پر
بالترتیب انجلا کا تحریری مطالعہ بہت صاف ستھرا اور منطقی ہے۔ قبل کے شماروں میں انجلا کے افسانے، بے زبان کا کرب، اور
نسل کشی، تنظیمی اور تخلیقی اعتبار سے توجہ مبذول کرتے ہیں۔

تمہارا

اختر یوسف (رانچی، بھارت)

اختر یوسف

17.6.98

محترم احمد ہمیش صاحب !

دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی بہت سے قبضہ گروپ پیدا ہو چکے ہیں، الیکٹرنک میڈیا اور پی آر کی بیساکھیوں کے بل پر سلیف پروجیکشن کر کے غیر جینوئن لکھاری جینوئن تخلیق کار بننے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ادب، صحافت اور بزنس کی تکڑم یکجا ہو گئی ہے جو ادبی منظر نامے پر پُر تعفن سنسنی اور تعصب و خبث پینٹ کر رہی ہے۔ قد اونچا کرنے کا شاید یہ بھی ایک حربہ ہے، ستار اور ناپائیدار ہی سہی، جس طرح نودولتیوں نے پیسے کو مستقل قدر سمجھ کر سماج میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے، اس طرح محض چند لفظوں کی جگالی کرنے والوں نے راتوں رات میر و غالب کا ہم پلہ کہلوانے کے خبط میں تخلیق کی وقعت اور اس کا اعتبار کم کیا ہے لیکن آپ کو خوب معلوم ہے کہ ایسے لوگوں کے حروف جھاگ کی مانند جلد ہوا میں تحلیل ہو جایا کرتے ہیں اور صائب و صادق تخلیق ہی اپنے عہد پر غالب آکر آئندہ زبانوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

نیاز کیش

محمود رحیم۔ اسلام آباد۔ پاک

ہمیش ڈیر!

پیار۔ تشکیل متواتر مل رہا ہے، تمہاری بے باکی صاف گوئی اور openness. اردو والوں کیلئے ہضم کرنا بہت مشکل ہے تمہارا حال وہی ہو رہا ہے جب امریکہ میں ۱۹۴۶ میں CITY OF PILLARS نے GOREVIDAL. لکھی تھی تمہاری 'مگر چاندنی' کی جتنی بھی قسطیں اب تک پڑھی ہیں وہ مجھے ANIS NIN کی یاد لاتی ہیں۔ سارا شگفتہ کی پنجابی نظم نے وہ مزا دیا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ ستیہ پال آنند اردو اور انگریزی میں متواتر لکھ رہا ہے اردو ادب کیلئے ان کا دم ایک نیک فال ہے کیا خوبصورت لکھتے ہیں قلم پر ایک مکمل کنٹرول ہے۔ کاش مجھے بھی یہ کنٹرول ہوتا، کافی دنوں سے احمد سہیل تمہارے تشکیل میں نظر نہیں آرہا نصیر احمد ناصر کے یہاں creativity کا ایک مسلسل عمل ہے خدا کرے وہ ہمیشہ فال رہے، شمارہ نمبر ۲۰، ۲۱ میں انجلا ہمیش کا 'بے زبان کا کرب' چونکایا ہے، میں خود CAT PERSON ہوں اس لئے اس تمام عمل سے واقف انجلا کو مبارکباد دینا، مقصود الٰہی شیخ نے اپنے یورپ میں رہنے کا خوب فائدہ اٹھایا ان کے افسانے بلاشبہ ایک تقابلی مطالعہ ہے جو مشرق اور مغرب کے بارے میں ہے، تمہاری نظم 'دراصل یہ نظم لکھی ہی نہیں گئی' یہ لائن اپنے imag اور استعارے کے ساتھ حاصل نظم ہے 'تو وہاں اب تک کتنی ہی حاسد سوتیلی پرچھائیوں کا نزول ہوا ہوگا'

تمہارا

افتخار نسیم (شکاگو (امریکہ)

محترم بھائی احمد ہمیش !

اسلام علیکم ! کہانی کی تاریخ' اس بار آپ نے میر تقی میر کی شخصیت اور فن پر بڑی کار آمد اور معلوماتی باتیں لکھیں ہیں یہ پورا مضمون حاصل شمارہ ہے، مگر چاندنی، کو غیر ضروری طوالت سے دور رکھیے اس بار (تشکیل) کا پورا شمارہ ایک اہم ادبی دستاویز کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

خیر اندیش

یوسف عارفی (بنگلور بھارت)

یوسف عارفی

برادرم احمد ہمیش ،

تشکیل کا حالیہ شمارہ موصول ہوا ۔ اس عنایت کا شکریہ !

برادرم ! کسی خاتون نے پتہ نہیں کیا لکھا کہ تشکیل نے مجھے اوگھڑ اور کھوپڑی میں خون پینے والا تانترک بنا یا ۔ ایک اور خاتون نے میرے ناول "ندی" پر اپنا تبصرہ بھیجا، جس کا اقتباس تشکیل میں اس طرح شائع ہوا کہ میرا نام بھی شائع نہیں کیا گیا۔ کیا اپنا رسالہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ سچ تو یہ ہے کہ آپ self criticism برداشت نہیں کر پاتے بس آپ کی تعریف ہونی چاہیے .... آپ صرف مداحوں میں گھرے رہنا چاہتے ہیں آپ کی خود پسندی نے تشکیل کو یتیم ادبی رسالہ بنادیا ہے جس میں علمی اور بحث انگیز خطوط شائع نہیں ہوتے، وہی خطوط شائع ہوتے ہیں جو آپ کی خوشامد میں لکھے گئے یا آپ کے دشمنوں پر جو طعنہ زن ہیں وہ نمایاں جگہ پاتے ہیں دلچسپ بات یہ ہے خاتون کے خط میں القاب وغیرہ آپ اس طرح Edit کرتے ہیں کہ خط سے قربت کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ ۲۔ مثلاً کسی خاتون نے لکھا کہ محترم جناب احمد ہمیش صاحب تو آپ "محترم جناب" کو ایڈٹ کر کے صرف ہمیش "شائع کرتے ہیں، یہ سب کیا ہے........؟ یہ ہے اپنے آپ سے عشق ، بہر حال میں آپ کے قدر دانوں میں ہوں ۔ وجہ یہ کہ آپ کے اندر تخلیقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس کا مجھے اعتراف ہے۔

آپ کا شموئیل احمد
پٹنہ (بھارت)

شموئیل احمد

پیارے بھائی احمد ہمیش ! تسلیمات !!

فروری میں جب 'تشکیل' موصول ہوا تشکیل کے مطالعاتی مضامین میں صرف ایک اور انجلا کا دوست قاتل تبصرہ پڑھا، انجلا کی مشاہداتی آنکھ خوب تیز ہے شروع میں انہوں نے جس عورت کا تذکرہ کیا تھا! (لوانڈ ارج میرج)

عورت کو اس پروگرام کے کچھ عرصہ بعد طلاق ہو گئی تھی بعد میں اس عورت نے اپنے سابق شوہر پر جو الزامات لگائے وہ ایک باکردار عورت کبھی نہیں لگا سکتی، اور نہ ہی اسے زیب دیتے ہیں' موصوفہ کے سابق شوہر یوسف صلاح الدین تھے جو علامہ اقبال کے نواسہ ہیں، یہ تو ایسے ہی تذکرہ کر دیا، اصل میں دست قاتل پر انجلا نے جو آرٹیکل تحریر کیا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اور یہ سب آپ کی محبت اور تربیت کا اثر ہے کہ انجلا کامیابی کے زینے آہستہ آہستہ طے کر رہی ہے۔

طالب دعا

عبدالسلیم عامر - بورے والا پالب

عامر

بھائی احمد ہمیش!

آداب!

تشکیل کے مختلف شماروں کے مطالعے کے بعد قلم اٹھانے کی کوشش کر رہی ہوں، اس میں مضامین اور کہانیاں دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ کہانیوں میں محمد الیاس کی کہانی (بیوہڑا) اور آغا گل کی کی کہانیاں (گوریچ، ہابیل قابیل، اور بابری مسجد) نے بہت متاثر کیا آغا گل نے بلوچستان کی تاریخ اور تہذیب پر اپنے مطالعے کی وسعت بڑی مضبوط گرفت کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے خاص طور پر بابری مسجد 'بہت خوبصورت تخلیق ہے اسکے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، آپ کا اداریہ تخلیقی وجود امر ہے بہت خوب ہے "پردہ اٹھتا ہے" میں آپ جس دلیری سے پردے اٹھاتے ہیں وہ آپ کی دلیرانہ صحافت اور مختلف ادبی حلقوں کے مثبت اور منفی رویوں سے واقفیت کا نتیجہ ہے لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے معاملات کو غیر ضروری طول دیا جا رہا ہے، شعری حصے میں غزل اور نظم اچھے انتخاب ہیں مجھے خاص طور پر رفیق سندیلوی، نصیر احمد ناصر، علی محمد فرشی، اور صابر ظفر کی پچاس اشعار پر مشتمل غزل نے متاثر کیا، لیکن اس حصے میں مزید بہتری کی گنجائش ہے۔ ساجدہ زیدی کا مضمون تانیثی تنقید ایک تعارف دلچسپ بھی ہے اور ان کی علمی اور ادبی کاوش کا نمونہ بھی اس کے علاوہ ڈاکٹر انور مینائی کا مضمون (عروضی جائزہ) اور پروین جاوید کا مضمون (طاہرہ قرۃ العین) بھی اچھے مضامین ہیں۔ مگر چاندنی 'جو آپکی سوانح ہے ایک سوانح کی خوبیاں لئے ہوئے دلچسپ بھی ہے اور قاری کو انتظار کرنے کا لطف بھی ر کھتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ (ایگز یجریٹ) کر رہے ہیں مثلاً مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ کہانی میں جہاں سدن کی عمر صرف چار سال ہے اور انکی بیماری کے دوران انکے والد کے پاؤں کے انگوٹھے لکڑی کاٹتے ہوئے چوٹ لگی اور ہمسایہ کی عورت کے مار پیٹ اور طلاق کے بعد گھر میں برہنہ داخل ہونے کا واقعہ تو ایک حد تک یاد رہنے کی بات ہے لیکن کسی عورت کے عضو خاص کے ذائقے کی بیماری میں دیئے گئے ذائقے سے مماثلت کی بات ایک چار سالہ بچے کے ذہن میں کیوں کر آسکتی ہے، اس سے کہانی میں شاید رنگ آمیزی تو پیدا ہو جائے لیکن سچائی کا تاثر پھیکا پڑ جائیگا، بہر حال قاری کو اختلاف رائے

کا حق ہے۔ میں نے ایک قاری کا حق استعمال کرتے ہوئے یہ سطور تحریر کی ہیں، مجموعی طور پر تشکیل ایک بھرپور اور کامیاب ادبی رسالہ ہے میری دعا ہے کہ آنے والے وقت اسکی اور آپکی کامیابی میں مزید اضافہ ہو۔

شاہینہ فلک ۔ کراچی، (پاک)

پیارے بھائی احمد ہمیش!

تم پر رب کریم کی رحمت بیکنار تشکیل کے دو شمارے ۲۰، ۲۱ اور ۲۳، ۲۴ میرے سامنے ورق ورق کھلے ہیں رسالہ مندرجات نے مجھے حیران کردیا ہے اتنا خوبصورت جامعیت سے مزین، نکھرا نکھرا جریدہ، میں پروفیسر غفور شاہ قاسم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے تشکیل سے متعارف کرایا اول اول نکر چاندنی' کی سیر کو نکلا آپ نے کمال جرات اور سچائی سے زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے، آپ کی بڑی ہمت ہے کہ آپ وہاں سے اتنا معیاری ادبی جریدہ نکال رہے ہیں۔ افسانوں میں انجلا ہمیش کے 'بے زبان کا کرب' نے رلادیا، انہوں نے حضرت حمزہؓ کا جو Reference دیا ہے تاریخ میرے سامنے متشکل ہوگئی اور میری آنکھیں نم۔ عمرہ کی ادائیگی کے دوران میں دامن احد گیا تھا، سیدنا حمزہؓ کے مزار مبارک پر کتنی دیر اشک بار رہا افسانہ مکمل اور تراشیدہ ہے، دوسرا افسانہ نسل کشی' بھی لاجواب ہے محمد الیاس ایک توانا تخلیقی افسانہ نگار ہے محافظ کے اعتبار کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اسے محمد الیاس نے لفظوں کا لباس پہنایا ہے ساجدہ عندلیب کا ناگوت، مظہر الزماں خان کا آخری نسل کی کہانی' نگار سجاد ظہیر کا اگلے برس' اور احمد کمال کا، کاکروچ' اس شمارے کی روح ہیں، اگلے برس ایک ایسی معاشرتی رویوں پر سلگتی تحریر ہے جو کرب مسلسل کا تسلسل ہے اگلے برس اور اگلے برس کے انتظار میں کتنے نئے دکھوں کی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں آنسوؤں کی تسبیح کے بے شمار دانے چہرے پرورد کرتے رہتے ہیں اور کریں کوزہ ہو جاتی ہیں۔ اور یہ جو نصیر احمد ناصر ہے نا بڑا پیارا ہے میٹھا اور بے لوث، اس کی نظمیں باقاعدہ سانس لیتی ہیں، ان کی دھڑکن سنی جاسکتی ہے، محبت کی جنم کویتا، پانی، مٹی، آگ، ہوا، نظم کہانی اور دکھ۔ یہ نظم کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں نصیر احمد ناصر تخلیق کرتا ہے۔ ادب میں بڑا پیا سب سے بڑا کی بحث فضول ہے فن پارے کا تو حسن محسوس کیا جاتا ہے،

والسلام

حامد سراج ۔ میانوالی

حامد سراج

لے جب کہ شموئیل احمد کے قول و فعل میں تضاد کا اندازہ رانچی (بہار) سے شائع ہونے والے رسالہ عہد نامہ-۲ میں شامل ان کے ناولٹ "ندی" پر خورشید اکبر کے تبصرہ سے ہوتا ہے۔ مبصر نے موصوف کی قلعی کھولتے ہوئے ان کی کہانی / ناول اور جنسیات کی شرح نگاری کو رد کر دیا ہے۔ اسی تبصرہ میں زبیر رضوی کی رائے بھی کچھ یوں شامل ہے "شموئیل احمد جنس کے آدھے ادھورے اور کچھ لین دین کے تنازعہ میں عورت کے طرفدار ہیں اور ان کا سروکار تخلیقی ادب سے کم اور ادب کی سیاست سے زیادہ ہے" اسی طرح مبصر نے شموئیل احمد کے ناولٹ "ندی" کو غیاث احمد گدی کے ناولٹ "سمندر اور آسمان" سے اور ان کی کہانی "برف میں آگ" کو ضمیر الدین احمد کی کہانی "پروائی" سے مستعار لیا ہوا قرار دیا ہے۔ مزید عہد نامہ-۳ میں ان کے "سنگھاردان" پر خورشید عالم نے تبصرہ کرتے ہوئے ان کے فیک ہونے کے شواہد فراہم کئے ہیں۔ پھر یہ کہ شموئیل احمد بھارت کے مختلف شہروں میں ادبی فیشن والی خواتین پر جو تاثر کے منتر آزماتے پھر رہے ہیں، وہ بھی محلِ نظر ہیں۔ البتہ احمد ہمیش پر ان کی الزام تراشی کا واحد سبب یہ ہے کہ سہ ماہی "تشکیل" ان کی "کمپنی کی مشہوری" میں فریق نہیں۔

Ghalib's Naqsh Faryadi

(An adaptation of Mirza Asadullah Khan Ghalib's couplet "Naqsh Faryadi Hai Kis Ki Shokhi-e-Tahreer Ka. Kaghzi Hai Pairahan Har Paikar-e-Tasveer Ka")

The purport and tenor from all eternity,
Having been fixed unalterably and diligently,
Stands inscribed in the foreordained destiny.
All tittles and whits must doom on the day of reckoning,
Their end is obvious and cannot prolong dilatorily.
This color of the fate is devoir and refulgent,
At what makes everything transitory and fleeting.
The spirited impressions, setting of scriptured disposition and vivacity..
Are living clamorously but with forceful vociferosity.
As the garb of every visage form is frailly brittle and flimsy.

MAZHER HASAN KHAN-
Karachi (Pak)

2

TASHKEEL'S ENGLISH WRITINGS

PART– 7

COMPILED BY SHAHEENA FLAK